پسِ پردہ
طاہر جاوید مغل
PakistaniPoint
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جولائی کا مہینا تھا۔ لاہور میں تو موسم کافی گرم تھا مگر یہاں جرمنی میں بہار جیسی صورت حال تھی۔ ویسے بھی وہ سہ پہر بڑی چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ شامیر جب فرینکفرٹ کے انتہائی مصروف ائرپورٹ پر اترا تو تقریباً تین بجے کا وقت تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ائرپورٹ سے اسے ادارے کا ایک نمائندہ ریسیو کرلے گا۔ اس کی رہائش وغیرہ کا انتظام بھی اسی نمائندے نے کرنا تھا۔ پتا نہیں کیوں شامیر کے ذہن میں نمائندے کا تصور ایک ادھیڑ عمر، نیم گنجے، سرخ چہرے والے جرمنی کا تھا۔ تاہم جب شامیر امیگریشن سے فارغ ہوکر آگے بڑھا تو اس کا یہ خیال سو فیصد غلط ثابت ہوگیا۔ نمائندہ ادھیڑ عمر نہیں بلکہ جوان تھا۔ گنجا یا نیم گنجا بھی نہیں تھا...... اور جرمن بھی نہیں تھا۔ مزے کی بات یہ کہ وہ نمائندہ بھی نہیں تھا بلکہ ''نمائندی'' تھی، یعنی لڑکی۔

''ہیلو سر! میرا نام زویا ہے۔ آپ یقیناً شامیر ہیں۔ میں آپ کو ریسیو کرنے آئی ہوں۔'' اس نے شامیر سے ہاتھ ملاتے ہوئے انگلش میں کہا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں شامیر کی کارڈ سائز تصویر تھی۔

''تھینک یو۔'' شامیر نے مختصر جواب دیا۔

شامیر کا سامان بس ایک اٹیچی اور ایک لیپ ٹاپ پر مشتمل تھا۔ اس نے سامان ٹرالی پر رکھا اور ایک بار پھر اپنی میزبان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ چھریرے جسم کی بائیس تئیس سالہ قبول صورت لڑکی تھی۔ موسم کی مناسبت سے آدھی آستینوں والی پھولدار شرٹ اور کریم رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔

چند برقی زینوں سے اوپر نیچے آنے کے بعد وہ دونوں ائرپورٹ کی حدود سے باہر آگئے۔ مختصر سامان ٹرالی سے اتارلیا گیا۔ شامیر دنیا کے مختلف ممالک کا سفر کرچکا تھا۔ تاہم یورپ میں اس کی یہ پہلی انٹری تھی۔ اپنی چاروں جانب گورے چٹے سرخ وسپید جرمن اور دیگر یورپی باشندوں کو دیکھ کر اسے اچھا لگا۔ زویا اسے لے کر ایک تیز رفتار سٹی ٹرین میں آن بیٹھی۔ فرینکفرٹ کا پہلا نظارہ شامیر کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ایک خوبصورت جدید شہر، بلند وبالا عمارتوں اور تمام تر شہری سہولتوں سے مزین۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے قابل تھا مگر اس کے باوجود کوئی بات تھی جو شامیر کو دوبارہ بڑے دھیان سے زویا کی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس دبلی پتلی خوش نما لڑکی میں ایک خاص قسم کی کشش تھی جو نگاہ کو اپنے اندر جذب کرتی تھی۔ شامیر جس نیوز چینل کے لیے کام کرتا تھا، زویا بھی اسی سے منسلک تھی

اور اس کی حیثیت مقامی نمائندے کی تھی یعنی اس کا تعلق بھی شعبۂ صحافت سے تھا تاہم دیکھنے میں وہ کوئی لاابالی یا من موجی آرٹسٹ ہی لگتی تھی۔

''مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ اردو بھی بول سکتی ہیں۔'' شامیر نے انگلش میں کہا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ''جو کچھ میں بولوں گی، وہ اُرڈو تو نا ہیں ہوئیں گی، مگر آپ تھوڑا بہت انڈراسٹینڈ کرلیں گے۔''

''اس کو ہم اپنی زبان میں گلابی اردو کہتے ہیں۔'' شامیر نے کہا۔ ''مگر آپ نے یہ سیکھی کہاں سے؟''

''دراصل...... میرے فادر انڈین ہیں اور ماما جرمن۔ گھر میں پاپا اکثر اُرڈو بولتا۔ کچھ کچھ ہام بہن بھائیوں کے کانوں میں پڑتا رہتا۔'' وہ پھر مسکرائی اور اس کے ایک گال میں ہلکا سا گڑھا پڑا۔

سبک رفتار سٹی ٹرین مختلف اسٹاپس پر رکتی چلتی آگے بڑھ رہی تھی۔ شامیر نے زویا سے پوچھا۔ ''آپ اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہیں؟''

''نا ہیں۔'' اس نے دائیں بائیں سر ہلایا اور اس کے لمبے شہد رنگ بال سرک کر اس کے دونوں رخساروں کو ڈھانپنے لگے۔ ''میں اکیلا رہتی...... اور وہ ڈونوں (دونوں) بھی علیحدہ علیحدہ رہتے...... یہ...... ایک لمبا کہانی۔''

زویا کے بتائے بغیر ہی شامیر اس ''لمبا کہانی'' کا سیاق و سباق سمجھ گیا۔ وہی سب کچھ جو مغربی معاشرے کا حصہ ہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ زویا کے والدین کی علیحدگی ہوچکی تھی۔

قریباً پندرہ منٹ بعد وہ دونوں ایک اسٹاپ پر اترے۔ شامیر نے انگڑائی لے کر اردگرد نگاہ دوڑائی۔ شفاف سڑکیں، چمکتی دمکتی گاڑیاں، روشن روشن چہروں والے لوگ...... سبزہ اور آلودگی سے بالکل پاک ہوا جس میں اردگرد کا ہر منظر اجلا دکھائی دیتا تھا۔

ٹرالی اٹیچی کھینچتا ہوا شامیر اپنی میزبان زویا کے ساتھ ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے پہنچا۔ معلوم ہوا کہ زویا یہیں پر اپنی ایک لبنانی سہیلی خشامہ کے ساتھ رہتی ہے۔ خشامہ بھی زویا کی طرح اکیلی تھی اور ایک مقامی آفس میں جاب کرتی تھی۔ وہ فی الوقت آفس گئی ہوئی تھی۔ سیڑھیاں طے کرکے وہ دونوں ایک مختصر فلیٹ میں پہنچے بلکہ فلیٹ بھی کیا یہ ایک ہی کشادہ کمرا تھا۔ اس مستطیل کمرے کے ایک حصے کو کچن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں دو مختصر لیکن آرام دہ بیڈ لگے ہوئے تھے۔ یہاں ایک اسٹور روم نما کمرا

اور بھی تھا لیکن یہ اتنا چھوٹا تھا کہ یہاں بستر نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ شامیر کو یہ جان کر زیادہ تعجب نہیں ہوا کہ اسے انہی دو لڑکیوں کے ساتھ بڑے کمرے میں رہنا ہوگا۔ مقامی معاشرے اور رہن سہن میں یہ سب کچھ معمول کے مطابق ہی تھا۔ مغربی معاشروں میں ہر کوئی اپنے حال میں مگن نظر آتا ہے۔ شاید کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ اس قسم کی ''ذاتیات'' پر توجہ دے۔

کمرے کی دیواروں پر راک اسٹارز کی چند تصویریں نظر آئیں۔ آڈیو سسٹم، کمپیوٹر، گیمز کے لیے جوائے اسٹکس، ایک خوبصورت تپائی پر چند فیشن میگزینز...... یہ چیزیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس کمرے کی دونوں رہائشی لڑکیاں یا پھر ان میں سے کم از کم ایک، خاصی آزاد خیال ہے۔ بہرحال شامیر کو ان معاملوں پر سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہاں ایک اہم آفیشل ٹاسک پر آیا تھا اور جلد از جلد اس کام کو نمٹا دینا چاہتا تھا۔ شامیر اپنے نیوز چینل کے ساتھ ایک محقق صحافی کے طور پر وابستہ تھا۔ پچھلے چند برسوں میں اس نے ''انویسٹی گیٹو جرنلزم'' میں کافی نام کمایا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تحقیق اور جستجو کا مادہ اس میں فطری طور پر موجود تھا۔ اس کے باس عظمت سلطان صاحب کہا کرتے تھے کہ شامیر اگر صحافی نہ ہوتا تو شاید کوئی کائیاں پولیس آفیسر ہوتا یا بال کی کھال اتارنے والا کوئی اور کریکٹر۔

یہاں فرینکفرٹ میں اس کی آمد کی وجہ بھی ایک اہم رپورٹ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ پاکستانی چینل جس اسٹوری پر کام کر رہا تھا' وہ ایک سیاستدان کی بیرون ملک خفیہ پراپرٹی کے متعلق تھی۔ اب تک جو کام ہوا تھا، اس کے مطابق یہ بات کنفرم ہوگئی تھی کہ یہ پراپرٹی جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں کہیں ہے...... تاہم ابھی تک اسے ''ٹریس'' نہیں کیا جاسکا تھا۔

''آپ کس سوچ میں گم ہوگئے ہیں؟'' زویا کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔

''اوہ، کچھ نہیں۔ سوچ رہا تھا کہ ٹائم ضائع کرنے کے بجائے آج ہی کام شروع کردوں۔''

''اوئے ہوئے، اتنا بھی تیزی اچھا ناہیں ہوئیں گا۔ آپ ابھی لمبے سفر سے آیا۔ کچھ کھائیں پئیں گا۔ ریسٹ کریں گا تو اچھا ہوئیں گا۔'' وہ گلابی اردو میں بولی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ریفریجریٹر میں سے ایک کنگ سائز کا ڈونر شامیر کے لیے نکال لیا۔ ساتھ ہی کچھ چپس اور کوک تھی۔ اس کے علاوہ بالکل سبز چمکیلے سیب تھے۔ وہ غالباً پہلے سے انتظام کرکے ائرپورٹ گئی تھی۔ اس نے چکن اور سلاد سے بھرا ہوا ڈونر شامیر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ بے فکر ہوکر کھائیں، یہ ہنڈرڈ پرسنٹ حرام گوشت سے بنا ہے۔''

''حرام گوشت؟'' شامیر حیران ہوا۔

''سس...... سوری...... ہام کا مطلب...... حلال...... ہام خود بھی پکا پکا مسلمان۔ ہام کے گھر میں کبھی بھی حرام چیز ناہیں پکا۔ پاپا اس بارے میں بہت سخت۔ ماما کبھی ایسی غلطی کرتا تو بہت لڑائی ہوتا تھا......''

شامیر کو واقعی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چار پانچ منٹ میں پورے ڈونر کو معدے کا راستہ دکھا دیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ہام واپس آفس جاتا۔ شام آٹھ بجے تک آجائیں گا۔ ہوسکتا ہے کہ ہام سے پہلے خشامہ آجائے۔ بہت اچھا لڑکی۔ آپ کو دیکھنے کے لیے بہت بے چین۔ اس نے چینل کے لیے آپ کا وہ ونڈرفل رپورٹ دیکھا تھا جس میں گھروں کے اندر کام کرنے والی خواتین کا بہت سا پرابلم ڈسکس کیا گیا تھا......''

کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔ شامیر کو محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کچھ دیر واقعی آرام کرلینا چاہیے لیکن اس سے پہلے اس نے پاکستان میں خالہ کو فون کرنا ضروری سمجھا۔ وہ واقعی شدت سے اس کی کال کا انتظار کر رہی تھیں۔ اپنے والدین کی جدائی کے بعد شامیر کو خالہ نے ہی ماں بن کر پالا تھا۔ بے حد خیال رکھتی تھیں اس کا...... اپنے کام کے سلسلے میں شامیر کو اکثر سفر میں رہنا پڑتا تھا۔ خاص طور سے جب اسے کہیں بیرونِ ملک جانا ہوتا تو وہ بہت بے چین ہوجاتی تھیں۔ خالہ ثمینہ کو اپنے بخیریت پہنچنے کی اطلاع دے کر اور ان کی لمبی چوڑی ہدایات سن کر وہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔

وہ کسی کی آہٹ کی وجہ سے جاگا تھا۔ کسمسا کر سامنے دیکھا تو ایک قیامت کھڑی تھی۔ نہایت چست پتلون اور بغیر آستین کی شرٹ میں ملبوس ایک سرو قد لڑکی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے محویت سے شامیر کو دیکھ رہی تھی۔

''ہیلو'' اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' وہ انگلش میں بولی۔

''مجھے بھی۔'' شامیر نے کہا۔ ''آپ یقیناً زویا کی فرینڈ خشامہ ہیں؟''

''میں اس کی فرینڈ نہیں، وہ میری فرینڈ ہے...... کیونکہ اس فرینڈشپ کا آغاز میں نے ہی کیا تھا۔ وہ تو ایک نمبر کی آدم

بیزار لڑکی ہے...... بالکل چپ اور اپنے آپ میں مگن۔‘‘
’’مجھے تو کوئی ایسی بات نہیں لگی۔ ہاں، شاید آپ کچھ زیادہ بولتی ہیں۔‘‘ شامیر نے اٹھ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
اس نے اپنے تراشیدہ براؤن بالوں کو، گردن موڑ کر ہلکورا دیا اور کھل کر مسکرائی۔ دونوں سہیلیاں ہی شوخ تھیں مگر یہ خشامہ کچھ زیادہ ہی چنچل نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔ نقوش کے اعتبار سے وہ کچھ زیادہ پُرکشش نہیں تھی، تاہم مسکراتے ہوئے کچھ بہتر لگتی تھی۔ اس کا بولڈ لباس اس کی طبع کی عکاسی کرتا تھا۔
آٹھ بجے زویا واپس آگئی۔ وہ کھانا ایک ترک ہوٹل سے لے کر آئی تھی۔ روسٹ چکن، تلے ہوئے آلو اور چاول وغیرہ تھے۔ کھانے کے بعد وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر سونے کا وقت ہوگیا۔ بیڈ دو ہی تھے تاہم زویا نے ایک صاف ستھرے میٹریس کا انتظام کرلیا تھا۔ خشامہ نے تو پہلے ہی ایک بیڈ پر لیٹ کر اونگھنا شروع کردیا۔ شامیر چاہتا تھا کہ دوسرے بیڈ پر زویا سوئے لیکن وہ نہیں مانی۔ اس نے بہانہ بنایا کہ اس کی کمر میں دو تین روز سے درد ہے اور اسے نیچے سونا زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔ شاید وہ میزبانی کا حق ادا کررہی تھی۔ اس کا اصرار دیکھتے ہوئے شامیر بیڈ پر چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح ہی شامیر نے اپنا کام شروع کردیا۔ زویا ایک ٹریول ایجنسی میں ملازم تھی۔ چینل کے لیے رپورٹنگ کا کام وہ پارٹ ٹائم جاب کے طور پر کرتی تھی۔ اپنے ایک اٹالین دوست کے ذریعے اس نے مذکورہ شخص کی پراپرٹی کا کھوج لگانے کی کوشش کی تھی اور اس میں اسے جزوی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس شخص کا نام سہراب درانی تھا۔ یہ پاکستانی سیاست کے سرگرم افراد میں سے تھا۔ شہرت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ کچھ دیگر سیاست دانوں کی طرح سہراب کے بارے میں بھی ایک خفیہ پراپرٹی رپورٹ ہوئی تھی۔ ٹھوس اطلاعات تھیں کہ یہ پراپرٹی جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں کہیں ہے اور لاکھوں یورو کی یہ پراپرٹی، سہراب نے اپنے اثاثوں میں ڈکلیئر نہیں کی۔
زویا نے اس سلسلے میں جو ’’کام‘‘ کیا تھا، وہ اس نے شامیر کے سامنے رکھ دیا۔ یہ کام زیادہ تر ’’سنیپس‘‘ کی شکل میں تھا۔ یہ تمام تصویریں زویا کے اٹالین دوست ہیری نے چھوٹے کیمرے کی مدد سے اتاری تھیں۔ اس میں فربہ جسم اور نیم گنجے سر والا سہراب درانی فرینکفرٹ کے مختلف مقامات پر دکھائی دیتا تھا۔ چند تصویروں میں اس کے ساتھ ایک مقامی خوش رنگ ’’تتلی‘‘ بھی نظر آتی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ یہ اس کی گرل فرینڈ رہی ہوگی۔ کسی جگہ سہراب شاپنگ کرتا نظر آتا تھا، کہیں سڑک پار کررہا تھا۔ کہیں فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے سیل فون پر بات کررہا تھا۔ ان تصویروں میں ایک تصویر اہم ترین تھی۔ اس میں دیسی سہراب ولایتی لباس یعنی ہاف پینٹ اور رنگ برنگی شرٹ پہنے ایک سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ تصویر کے عقب میں بال پوائنٹ سے لکھا تھا۔ ’’مسٹر سہراب اپنی مبینہ رہائش گاہ کے سامنے۔‘‘
سڑک کا بس چھوٹا سا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ تصویر سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ بندہ کس جگہ، کسی علاقے میں کھڑا ہے۔
شامیر نے تمام تصویروں کا پیشہ ورانہ باریک بینی سے جائزہ لیا پھر گہری سانس لے کر پوچھا۔ ’’زویا...... ہیری کا کچھ پتا چلا؟‘‘
’’ناہیں چلانا...... یہی تو پرابلم ہے۔‘‘
’’کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچ گیا ہو۔‘‘
’’نقصان سے زیادہ یہ اندیشہ ہے کہ وہ کسی لالچ میں پڑ گیا ہوئیں گا...... اب تک جو شہادتیں ملا ہے ان سے تو یہی رزلٹ نکلتا ہے کہ وہ عین موقعے پر بک گیا ہے۔ ہی سولڈ ہم سیلف۔‘‘
’’یہ تصویریں تم کو کہاں سے ملیں؟‘‘
’’غائب ہونے سے پہلے ہیری سارے پروف اپنے ساتھ لے گیا مگر یہ چند فوٹوگراف اس کے کمرے کے ایک سیکرٹ خانے میں پڑا رہ گیا۔‘‘
’’ان تصویروں سے تم نے کیا اندازہ لگایا ہے زویا؟‘‘ شامیر نے پوچھا۔
’’یہ بات تو کلیئر ہے شامیر صاحب کہ ان میں سے زیادہ تر فوٹوگراف، فرینکفرٹ کے ویسٹرن علاقے کا ہے۔ مگر ویسٹرن علاقہ بھی کوئی چھوٹا ناہیں ہے۔ ہیری نے ایک فوٹوگراف کے سوا کسی میں بھی مسٹر سہراب کی رہائش گاہ کا ذکر ناہیں کیا۔‘‘
شامیر نے ایک بار پھر ان تصویروں کو کھنگالا۔ اگر یہاں کے مقامی نمائندے ان تصویروں سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرسکے تھے تو شامیر کیسے کرسکتا تھا۔ یقیناً اس پراپرٹی کا سراغ لگانے کے لیے کوئی اور طریقہ ڈھونڈنا ضروری تھا۔
شام کو کل کی طرح خشامہ، آفس سے جلدی آگئی اور شامیر کو اپنے ساتھ قریبی دریائے مائنز کی سیر کے لیے لے گئی۔ بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ دریا پر چھوٹی بڑی خوشنما

کشتیاں تیر رہی تھیں۔ سرسبز کناروں پر لوگ جاگنگ اور سائیکلنگ وغیرہ کر رہے تھے۔ یورپ کے دیگر ممالک کی طرح جرمنی میں بھی شام پانچ بجے تک ورکنگ ڈے کا اختتام ہوجاتا ہے۔ بیشتر بازار اور دکانیں بھی پانچ چھ بجے تک بند ہوجاتی ہیں۔ لوگ شام کا لطف اٹھانے کے لیے مختلف کھیلوں اور تفریحات میں لگ جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہ سب کچھ بڑے دلکش طریقے سے ہو رہا تھا۔ دریائے مائنز کے شفاف پانی میں شفق کی سرخی گھلی ہوئی تھی۔ خشامہ بڑی رواں انگلش میں باتیں کر رہی تھی مگر شامیر کی نگاہوں میں بار بار زویا کا سراپا گھوم جاتا تھا۔ اگر وہ ساتھ ہوتی تو شاید وہ اس شام کو زیادہ انجوائے کرتا۔ زویا کی گفتگو اور نشست و برخاست میں بھی شوخی نظر آتی تھی مگر یہ شوخی ایک خاص طرح کی سادگی اور بے ساختگی میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے مزاج میں ایک طرح کا وقار بھی جھلک دکھاتا تھا۔

رات کو سونے کا طریقہ کار پھر وہی رہا۔ شامیر اور خشامہ بیڈز پر لیٹے اور دونوں کے بہت اصرار کے باوجود زویا نے میٹرس کا انتخاب کیا۔ شامیر کو یوں لگا کہ وہ جو فیصلہ کرلیتی ہے، اس پر اٹل ہوجاتی ہے اور اگر اسے فیصلہ بدلنے پر زیادہ مجبور کیا جائے تو وہ اپنے اندر ہی جھنجلانا شروع کردیتی ہے۔

شامیر دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ذہن مسلسل سہراب درانی کی پراپرٹی میں الجھا ہوا تھا۔ شامیر جانتا تھا کہ ماضی میں سہراب نے کسی عورت کو طلاق دی تھی اور وہ بھی کہیں فرینکفرٹ میں ہی رہتی ہے۔ اگر اس عورت کا کھوج لگ جاتا تو سہراب کی پراپرٹی کے بارے میں کوئی کلیو ہاتھ آسکتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس حوالے سے کس طرح پیش رفت ہوسکتی ہے۔ تاہم اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے مزید بھاگ دوڑ نہیں کرنا پڑے گی اور کامیابی اس کے بالکل قریب پہنچ چکی ہے۔ بیڈ پر کروٹیں بدلتے بدلتے اسے ایک بار پھر ہیری کی لی ہوئی تصویروں کا خیال آیا۔ دونوں لڑکیاں سو رہی تھیں۔ کمرے میں نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی تھی۔ وال کلاک رات گیارہ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ شامیر نے دیوارگیر کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ سارا دن مصروف رہنے والی سڑک پر گیارہ بجے ہی سناٹے کی سی صورت حال تھی۔

شامیر نے سائڈ ٹیبل کا لیمپ آن کیا اور دراز میں سے وہ فوٹوگرافس نکال کر پھر انہیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ وہ اس تصویر پر رک گیا جس پر ہیری نے اپنی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔ ”مسٹر سہراب، اپنی مبینہ رہائش گاہ کے سامنے۔“

تصویر سے کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ بس سڑک کا ایک بالکل مختصر سا حصہ ہی نظر آتا تھا۔ سہراب درانی کے عقب میں ایک نہایت چمکدار جیگوار کار کھڑی تھی۔ کار کا صرف پہلو ہی دکھائی دیتا تھا۔ اچانک شامیر چونک گیا۔ نیلے رنگ کی اس کار کی چمکدار سطح پر ایک بہت مدھم ہیولا سا نظر آتا تھا۔

بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بڑی سی ”شٹل کاک“ کا سایہ ہو۔ یہ اتنا مدھم تھا کہ بڑے غور سے دیکھنے پر ہی محسوس کیا جاسکتا تھا۔ شامیر نے اس تصویر کو مختلف زاویوں سے رکھ کر دیکھا۔ پھر کمرے کی لائٹ آن کردی اور زویا کو جگادیا۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں تھی، ذرا حیران ہوئی پھر اپنے بال سمیٹتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ ”کیا ہوا شومیر؟“ اس نے شامیر کے نام کا حلیہ بگاڑتے ہوئے پوچھا۔

”زویا! مجھے اس تصویر میں کچھ نظر آیا ہے۔ آپ اس نیلی کار کو دیکھ رہی ہیں نا۔ اس کی باڈی کو دھیان سے دیکھیں......“

وہ اب اٹھ کر کرسی پر بیٹھ چکی تھی، اس نے اپنی آنکھیں سکوڑیں اور تصویر پر غور کرنے لگی۔ ”اس کار کی باڈی پر کوئی نشان ہے؟“ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے شامیر سے پوچھا۔

”نشان نہیں ہے۔ باڈی پر کچھ ریفلیکٹ ہو رہا ہے۔“ شامیر نے کہا۔

وہ ایک بار پھر تصویر کا جائزہ لینے لگی۔ شامیر نے اپنی انگلی سے اس ریفلیکشن کی نشان دہی کی جو اس نے دیکھا تھا۔

یکایک زویا کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے۔ وہ کھڑی ہوگئی۔ اس نے تیزی سے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور اس میں وہ فائل کھول لی جس میں اس کے ہیری نامی فرینڈ کی کھینچی ہوئی ساری تصویریں موجود تھیں۔ اس نے مطلوبہ تصویر نکالی اور پھر وہ اسے انلارج اور چھوٹا کرکے بار بار دیکھنے لگی۔ شامیر بھی اس معائنے میں اس کے ساتھ شامل تھا۔ زویا نے سنسنی خیز انداز میں شامیر کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”شومیر! آپ نے بالکل ٹھیک پوائنٹ آؤٹ کیا۔ یہ ایک بلڈنگ کا شیڈو ہے جو اس جیگوار کار کی باڈی پر ریفلیکٹ ہوتا ہوئیں گا......“

پھر زویا نے ایکدم ماتھا تھام لیا اور بڑے جذباتی انداز میں کچھ سوچنے لگی۔ ”ہام کو کچھ کچھ یاد آرہا۔ ہام نے یہ بلڈنگ کہیں ڈیکھا ہوا...... ہاں بالکل ڈیکھا ہوا......“

وہ اپنے لیپ ٹاپ پر تیزی سے کچھ بٹن پریس کرنے لگی۔ شامیر ایک بار پھر فوٹوگراف کی طرف متوجہ ہوگیا۔ خاص ڈیزائنوں والی ان ٹیڑھی میڑھی عمارتوں کو مغربی

ممالک میں لینڈ مارکس کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ کسی بھی شکل میں ہوسکتی ہیں۔ کسی زندہ یا بے جان شے سے مشابہ۔ انگریزی یا کسی دوسری زبان کے حرف سے مشابہت رکھتی ہوئی۔ ایسی عمارتیں انجینئرز کی قوت تخلیق اور مالکان کی بے تحاشا امارت کی نشاندہی بھی کرتی ہیں...... اور ان سے شہروں اور علاقوں کی پہچان بھی ہوتی ہے۔

......اگلا روز بڑا ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ لنچ ٹائم یعنی بارہ بجے سے پہلے پہلے زویا نے شہر کے مغربی علاقے میں اس عمارت کا پتا چلالیا۔ اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں فون پر شامیر کو یہ اطلاع دی اور اس کی نگاہ رسا کی داد بھی دی۔ اس سے آگے کا کام زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا تھا۔ کراچی میں بیٹھے، نیوز چینل کے کرتا دھرتا عظمت سلطان صاحب نے اپنی ڈوریوں کو حرکت دی...... برلن میں موجود دو نمائندے فرینکفرٹ پہنچ گئے۔ فقط 48 گھنٹے کے اندر مطلوبہ پراپرٹی کا سراغ لگالیا گیا۔ یہ ایک بڑے لگژری فلیٹ کی شکل میں تھی۔ اسے گرین ہائٹس کا نام دیا جاتا تھا۔

☆☆☆

شامیر کو بالکل توقع نہیں تھی کہ یہاں فرینکفرٹ میں اس کا کام اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی نمٹ جائے گا۔ اپنے اس ٹور کے پانچویں ہی روز وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ لبنانی خشامہ پہلے سے ہی اس کی فین تھی، اب وہ اس سے مزید متاثر نظر آتی تھی...... لگتا ہے بگا ہے اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار بھی کررہی تھی۔ خیالات تو غالباً زویا کے بھی ایسے ہی تھے مگر وہ دوسرے مزاج کی تھی۔ اس نے بس نپے تلے انداز میں شامیر کی تعریف کرنے پر اکتفا کیا تھا۔

جو چیز آسانی سے دستیاب نہ ہو عموماً اسی کو حاصل کرنے کو دل چاہتا ہے۔ خشامہ تو آفس سے جلدی آجاتی تھی اور ہروقت اس کے سر پر سوار رہتی تھی، تاہم زویا دیر سے لوٹتی تھی اور کافی تھکی ماندی بھی ہوتی تھی۔ اس کے آتے ہی فلیٹ میں رونق سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایک دو بار شامیر کا دل چاہا کہ وہ زویا کے ساتھ ذرا آؤٹنگ کو نکلے مگر آفس سے آکر وہ پندرہ بیس منٹ آرام کرتی اور پھر کھانا پکانے میں مصروف ہوجاتی۔ شیڈول کے مطابق تو ایک دن خشامہ کو اور دوسرے روز زویا کو کوکنگ کرنا ہوتی تھی مگر ان دنوں خشامہ چھٹی کررہی تھی۔ ورزش کے دوران میں اس کے بائیں بازو کا پٹھا بری طرح کھنچ گیا تھا اور وہ کوکنگ میں دشواری محسوس کرتی تھی۔ ویسے شامیر کا اندازہ تھا کہ وہ اپنی تکلیف کو کچھ بڑھا چڑھا بھی رہی ہے۔ دیگر معاملات کی طرح وہ شاید اپنے فرائض کی انجام دہی میں بھی زیادہ سنجیدگی نہیں دکھاتی تھی۔

لبنانی ہونے کے باوجود خشامہ مقامی لب و لہجے میں بڑی رواں انگلش بولتی تھی۔ ویک اینڈ پر شامیر سے کہنے لگی۔ ”تم نے لیونا برگ کا قصبہ دیکھا ہے؟ بڑی پُرفضا جگہ ہے۔ وہاں میری جرمن فرینڈ کرسٹی رہتی ہے۔ مجھے دو دن کے لیے بلا رہی ہے۔ تم بھی چلو، مزہ نہ آیا تو پیسے واپس۔“ اس کا انداز معنی خیز تھا۔

شامیر نے کہا۔ ”میرے پاس اتنے پیسے ہیں ہی نہیں کہ تمہیں دے سکوں۔ ویسے بھی مجھے یہ فرینکفرٹ کچھ کم پُرفضا نہیں لگ رہا۔“

”یہاں فرینکفرٹ میں سیمنٹ اور سریے سے بنی ہوئی عمارتوں کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق آپ جناب نے یورپ کی قابل دید جگہیں دیکھی ہی نہیں۔ آپ کے پاس اب بھی قریباً پچیس روز کا وقت ہے...... اور تقریباً اتنے ہی ملکوں کا سفر آپ اپنے اس ایک ویزے پر کرسکتے ہیں۔ کنوئیں کے مینڈک نہ بنو، فرینکفرٹ سے نکل کر دیکھو۔ دنیا کتنی حسین ہے۔“ اس کا لہجہ ایک بار پھر بے تکلف اور معنی خیز ہوگیا۔

خشامہ کے اصرار کے باوجود شامیر اس کے ساتھ نہیں گیا۔ اسے یہاں زویا کے آس پاس رہنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ کوئی دل پھینک شخص نہیں تھا مگر نجانے کیوں زویا کی کمپنی اسے بھاتی تھی۔

خشامہ چلی گئی، شامیر نے سوچنا شروع کردیا۔ کیا اب زویا اس کے ساتھ اکیلی یہ کمرا شیئر کرے گی؟ اس کا خیال تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ اپنے کسی میل یا فیمیل دوست ...... یا پھر کولیگ کو دو تین روز کے لیے بلالے گی مگر عملی طور پر ایسا ہوا نہیں۔ جمعے کی رات ان دونوں نے اکیلے ہی اس بڑے کمرے میں گزاری۔ یہ صورت حال ایک طرح سے زویا کی خود اعتمادی اور خوش باطنی کو ظاہر کرتی تھی۔

صبح زویا کے جاگنے سے پہلے ہی شامیر نے اپنا اور اس کا ناشتا خود بنایا اور ایک طرح سے روزمرہ کی مصروفیات میں اپنا حصہ ڈالا۔ ”یہ تکلف کیوں کیا آپ نے؟“ زویا نے تیار ناشتا دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

”یہ تکلف بے سبب نہیں ہے۔ بدلے میں آپ بھی تو کچھ نہ کچھ تکلف کریں گی ہی۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے مسکرا کر بالوں کی لٹیں اپنے چہرے سے ہٹائیں۔

''یہی کہ بندہ اجنبی ہے اور یہاں اس شہر پُر پیچ میں آپ کا مہمان ہے۔ آپ یقیناً یہاں کی سیاحت میں اس کا ساتھ دیں گی۔''

وہ بولی۔ ''مگر یہاں سیر و سیاحت کے لیے زیادہ کچھ رکھا نہیں ہے۔ دو چار جگہیں ہی تو ہیں پھر آپ بور ہونا شروع ہو جائیں گے۔''

''بور ہونا تو میں ابھی شروع ہو گیا ہوں کیونکہ آپ نے صبح سویرے ہی انگلش بولنا شروع کر دی ہے۔ مجھے آپ کی وہی گلابی اردو اچھی لگتی ہے۔''

''اوئے ہوئے، آپ تو ایک ڈم ماکھن (مکھن) لگانا شروع کر ڈیتے ہیں۔'' وہ مسکرائی اور اس کے گال کا گڑھا نمایاں ہو گیا۔

اس روز وہ صبح دس بجے کے قریب شامیر کو فرینکفرٹ کی اسکائی لین دکھانے کے لیے لے گئی۔ اسکائی لین کا لفظ شہر کی بلند ترین عمارتوں کے جھرمٹ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ اسٹاپ پر پہنچے تو پتا چلا کہ کسی وجہ سے شہر کی لوکل ٹرینیں بند ہیں۔ شامیر نے پہلی دفعہ فرینکفرٹ کی بس پر سفر کیا۔ راستے میں وہ زویا سے عمومی قسم کے سوالات کرتا رہا۔ زویا نے اسے بتایا کہ اس کے والدین نے پسند کی شادی کی تھی۔ زویا کی دو بہنیں اور بھی تھیں اور دونوں شادی شدہ تھیں۔ ایک برلن میں اور دوسری میونخ میں رہتی تھی۔ زویا سب سے چھوٹی تھی۔ اس کی پیدائش کے تین چار سال بعد ہی والدین میں جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ بڑھتے بڑھتے یہ جھگڑے اتنے بڑھے کہ بالآخر دونوں میں طلاق ہو گئی۔ شادی کے وقت زویا کی والدہ نے اسلام قبول کر لیا تھا مگر دل سے وہ شاید کبھی بھی مسلمان نہیں ہوئی۔ مذہبی اختلاف کے ساتھ ساتھ، معاشرے اور رہن سہن کا اختلاف بھی ان دونوں کی علیحدگی کا سبب بنا۔ اس سانحے کے وقت زویا کی عمر فقط پندرہ برس تھی۔ وہ کچھ عرصہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہی اور جونہی اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچی، اس نے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ زویا کی والدہ نے طلاق کے صرف پانچ چھ ماہ بعد ہی ایک برٹش سے شادی کر لی تھی۔ ڈھائی تین سال بعد اس کے پاپا نے بھی ایک پاکستانی خاتون کے ساتھ اپنا گھر بسا لیا اور ہیمبرگ منتقل ہو گئے۔ اب بھی کبھار اپنی ماما سے تو اس کی بات ہو جاتی تھی، مگر پاپا سے وہ تقریباً ''کٹ آف'' ہی تھی۔

اس گفتگو کے ختم ہوتے ہوتے وہ لوگ اپنی مطلوبہ لوکیشن پر پہنچ چکے تھے۔ ہفتہ وار چھٹی کی وجہ سے سڑکیں تقریباً خالی ہی تھیں۔ زیادہ تعداد پیدل چلنے والوں کی تھی۔ ان کی دونوں جانب بلند و بالا خوبصورت عمارتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان میں سے کئی ایک انوکھے ڈیزائنز کی تھیں اور ان کی حیثیت لینڈ مارکس کی تھی۔

یہاں پہنچ کر زویا کا موڈ کافی حد تک بحال ہو گیا اور ماضی کے تذکرے نے اس کے چہرے پر جو تاریک سائے سے پھیلائے تھے، وہ سمٹ گئے۔ ویسے بھی یہ ویک اینڈ تھا اور زویا خود کو کافی ایزی محسوس کر رہی تھی۔

وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ''یہ جس سڑک پر ہام ڈونوں جاتا، یہ اسکائی لین روڈ کہلاتا۔''

''اور یہ اسکائی لین روڈ کہاں جاتا؟'' شامیر نے اسی کے لہجے میں پوچھا۔

''جاتا تو کہیں ناہیں...... سارا دن یہیں پڑا رہتا۔'' اس نے ایک پرانا لطیفہ دہرایا اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

پھر وہ ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''شومیر! آپ کو ڈرنا ہیں لگتا کہ آپ نے ایک خطرناک کام کیا۔ ایک برے بندے کی سیکرٹ پراپرٹی کا کھوج لگایا۔''

''کیا مطلب؟'' شامیر نے پوچھا۔

''مطلب یہی کہ اگر ابھی سامنے والی گلی سے سہراب ڈرانی کا کوئی بندہ نکلے اور آپ پر اٹیک کر دے تو پھر؟''

شامیر بولا۔ ''یہی سوال میں آپ سے بھی پوچھ سکتا ہوں۔''

وہ مسکرائی۔ ''ہام کے ساتھ تو چھ فیٹ کا ایک پاورفل اور ڈلیر (دلیر) ساتھی موجود ہے۔ ڈرنا تو آپ کو چاہیے کہ اگر کوئی ایسا اٹیک ہوئیں گا تو ہام پہلے سیکنڈ میں بھاگ جائیں گا۔''

شامیر نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ آپ بھاگنے والوں میں سے ہیں۔''

''یہ کس رے نفسی کیا ہوتا؟ ایسے مشکل ورڈز ہام کی سمجھ میں ناہیں آتے۔''

شامیر مزاح کے موڈ میں تھا، بولا۔ ''کسرِ نفسی دراصل تحلیلِ نفسی کی بہن ہوتی ہے۔ نفسا نفسی اس کی پھوپی اور بے نفسی اس کی بڑی بھاوج کو کہتے ہیں۔''

''بھاوج...... یہ کیا ہوتا؟'' زویا نے مزید الجھ کر کہا۔

''اس کو دودھ جلیبی میں ڈال کر کھاتے ہیں۔ اب آپ کو دودھ جلیبی کا بھی پتا نہیں ہوگا۔ خیر چھوڑیں ان باتوں کو۔ میرا سوال تو وہیں پر رہ گیا۔ یہ اسکائی لین روڈ جاتی کہاں ہے؟''

''یہ جرمنی کا سب سے لمبا ترین بلڈنگ کی طرف

جاتا۔ اس کو کامرس بینک ٹاور کہا جاتا۔ ہام اس کی چھت پر جائیں گا۔ پورا فرینکفرٹ سٹی وہاں سے نظر آئیں گا۔''

وہ بلڈنگ تک پہنچے۔ اس کی اونچائی دیکھ کر شامیر واقعی حیران ہوا۔ بلڈنگ کی چھت پر ایک بہت اونچا انٹینا بھی نصب تھا۔ کسی ماہر گائڈ کی طرح زویا نے شامیر کو بتایا کہ یہ عمارت 56 منزلہ ہے اور اگر انٹینا وغیرہ کو بھی اس کی اونچائی میں شامل کرلیا جائے تو اس کی اونچائی 300 میٹر سے بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔

آٹھ یورو فی کس کا ٹورسٹ ٹکٹ لے کر وہ دونوں ایک برق رفتار لفٹ کے ذریعے عمارت کی چھت پر پہنچ گئے۔ یہاں سیاحوں کا ہجوم تھا۔ ہر عمر کے خوش و خرم جوڑے تصویر کشی اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یہاں سے شہر کا نظارہ واقعی قابلِ دید تھا۔ فرینکفرٹ کا ائرپورٹ بھی دکھائی دے رہا تھا جو دنیا کے مصروف ترین ائرپورٹس میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے دیکھا، یوں لگا کہ اترنے اور پرواز کرنے والے جہازوں کی قطار لگی ہوئی ہے۔

چھت پر تیز ہوا تھی۔ وہ دونوں ایک آہنی جنگلے پر کہنیاں ٹکا کر کھڑے ہوگئے اور دریائے مائنز کا نظارہ کرنے لگے۔ ہوا کے سبب زویا کے بال اچانک تیزی سے لہرائے اور دو تین سیکنڈ کے لیے انہوں نے شامیر کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

زویا نے جلدی سے اپنے بالوں کو سنبھالا۔ ''سس...... سوری۔'' اس نے کہا اور بالوں کو احتیاط سے جوڑے کی شکل میں باندھنے لگی۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بال باندھتی ہوئی زویا نے اپنا ہیئر کلپ دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ تیز ہوا نے اس کے لباس کو جیسے جسم کا حصہ ہی بنا دیا تھا۔ چمکیلی دھوپ دائیں جانب سے اس کے سراپا کو منور کررہی تھی اور اس کی مہک دریائے مائنز سے اٹھنے والے جھونکوں میں گھل کر شامیر کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ کچھ لمحے بڑے کا یا کلپ ہوتے ہیں۔ یوں تو وہ عام لمحوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ گھڑی کے ڈائل پر اور کیلنڈروں کے صفحات پر ان لمحوں کی علیٰحدہ سے کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن کچھ لوگوں کے لیے وہ لمحے یادگار اور ناقابلِ فراموش ہوجاتے ہیں۔ یہ لمحہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس لمحے میں شامیر کو محسوس ہوا کہ وہ اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوگیا ہے۔ بڑی شدت سے اور بڑی گہرائی کے ساتھ اسے چاہنے لگا ہے۔ یوں لگا جیسے وہ چند دن سے نہیں بلکہ ایک بہت طویل عرصے سے اسے جانتا تھا، پہچانتا تھا۔ اس کی ہر ادا سے واقف تھا۔ اس کے مزاج کے سارے سرد گرم اس نے بڑی اچھی طرح دیکھ رکھے تھے۔

جب زویا نے بال باندھ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ گڑبڑا سا گیا۔ ''کیا ہوا شومیر؟'' اس نے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں...... دراصل......'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ایک جرمن لڑکی زور سے ہنسی۔ شاید اس نے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ کوئی شرارت کی تھی۔

بوائے فرینڈ بھی جرمن ہی لگتا تھا۔ وہ لڑکی کے پیچھے لپکا اور سب کے سامنے ہی اسے پکڑ کر ایک بھرپور Kiss کیا۔ دونوں جرمن زبان میں تیز تیز بولنے لگے۔

ٹاور کی اس چھت پر اس طرح کے مناظر ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ جوڑے خوش گپیوں اور خوش فعلیوں میں مصروف تھے لیکن یہ منظر چونکہ کچھ زیادہ ہی چونکا دینے والا تھا، اس لیے کئی خواتین و حضرات مڑ کر اس بے تکلف جوڑے کو دیکھنے لگے۔ لڑکی نے ایک بار پھر کوئی شرارت کردی تھی اور لڑکا اس کے پیچھے بھاگتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا تھا۔

زویا کے چہرے پر شرم کی سرخی بکھر گئی، بولی۔ ''سوری! آپ کو عجیب لگا ہوئیں گا...... کیونکہ اس طرح کا سین وہاں پاکستان میں تو ناہیں ہوتا ہوئیں گا......''

''ہوتا تو ہے لیکن اس طرح کھلے عام نہیں۔'' شامیر نے مختصر جواب دیا۔

وہ ابھی تک اس لمحے کے سحر میں تھا جو تھوڑی دیر قبل اس پر بیتا تھا۔ ہوا کے مقابل کھڑے ہوکر بال باندھتی ہوئی زویا کی جھلک جیسے اس کے دل و دماغ پر نقش ہوکر رہ گئی تھی۔

''کیا خیال ہے، اب چلیں یہاں سے؟'' زویا نے اپنے شولڈر بیگ کو کندھے پر درست کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھ...... ٹھیک ہے...... بس چند تصویریں اور لے لوں۔'' شامیر نے کندھے سے کیمرا اتارتے ہوئے جواب دیا۔

وہ زوم کرکے دریائے مائنز کے کناروں کو فوکس کرنے لگا۔ تصویریں اتارتے اتارتے اس کی نگاہ ایک منظر پر پڑی۔ ایک جگہ کافی سارا ہجوم تھا اور درمیان میں کچھ لڑکے لڑکیاں ڈانس اور جمناسٹک وغیرہ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ''وہ کیا ہے؟'' شامیر نے انگلی سے دور نیچے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس کو جرمن زبان میں ویک اینڈ کی موج مستی کہا جاتا ہے۔ کم آن...... ہام بھی ڈیکھتے ہیں۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔

چند منٹ بعد وہ دونوں تیز رفتار لفٹ سے نیچے اترے اور پھر پیدل چلتے ہجوم تک پہنچ گئے۔ کافی رش تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں ایک بڑا راک اسٹار بھی انٹری دے گا

اور گانا وانا سنائے گا۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے وہ دونوں آگے بڑھنے لگے۔ راستہ بنانے میں شامیر کو دشواری پیش آ رہی تھی۔ زویا نے بے تکلفی سے اس کا بازو تھام لیا اور اسے لے کر آگے بڑھنے لگی۔ اس سے پہلے بسوں پر اترتے چڑھتے بھی زویا نے دو چار دفعہ اس کا ہاتھ تھاما تھا مگر شامیر کو یہ ایک عام عمل ہی لگا تھا اور اس نے کچھ خاص محسوس نہیں کیا تھا۔ مگر ٹاور کی چھت پر اس کی زندگی میں جو ایک جدا لمحہ آیا تھا، اس نے شامیر کے اندر ایک دم بہت کچھ بدل دیا تھا۔ زویا کا لمس اور اس کی قربت اس کے جسم میں ایک برقی روسی دوڑانے لگی۔ ہجوم میں سے پھنس پھنسا کر گزرتے ہوئے وہ دونوں کئی بار ایک دوسرے کے بالکل قریب آگئے۔ زویا تو غالباً اس قربت سے بے خبر ہی رہی مگر شامیر کے دل و دماغ پر کئی بار قیامت گزر گئی۔ آخر وہ دونوں تماشے کے لیے ایک مناسب جگہ پر پہنچ گئے۔

شوقیہ جمناسٹرز مختلف کرتب دکھانے میں مصروف تھے۔ ان میں مختصر لباسوں والی لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ لوگ تالیاں بجا کر داد دے رہے تھے۔ زویا نے سرخ چہرے اور ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ ”شومیر! آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟“

”زبردست...... اور وہ وہاں سرخ قمیص والا بندہ کیا کر رہا ہے؟“

”وہ لوگوں کو جوک سنا رہا ہے۔ دیکھو وہاں اس کے پاس کھڑا لوگ کتنا ہنس رہا ہے۔ کیا وہاں پاکستان میں بھی اس طرح کا ہنسی مذاق ہوتا؟“

”بہت زیادہ ہوتا، بلکہ ہر روز رات کو ”ٹی وی“ پر یہی کچھ ہوتا ہے۔ وہاں یہ لوگ بھانڈ کہلاتے ہیں۔ ان کی جگت بہت مزیدار ہوتی ہے۔“

”جوگت؟ یہ کیا ہوتا؟“

”...... یہ بھی...... دودھ جلیبی کی طرح کی ایک چیز ہوتی ہے بلکہ سمجھو کہ جلیبی ہی ہوتی ہے۔ جس طرح جلیبی کا آگا پیچھا کوئی نہیں ہوتا، اس طرح جگت کا بھی نہیں ہوتا۔“

”جالبی۔“ اس نے زیر لب دہرایا۔ ”یہ نام ہام نے کہیں سنا ہوا ہے شاید۔ ہام کا خیال ہے کہ پاپا نے بولا تھا۔ اس کا پورا نام حبیب جالبی تو نا ہیں ہوتا۔“

شامیر سٹپٹا گیا۔ وہ نامور شاعر حبیب جالب کو حبیب جالبی کے ساتھ مکس کر رہی تھی۔

یکایک وہ خوشی سے ایک قلقاری سی مار کر ایک جواں سال عورت کی طرف بڑھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئیں۔ چٹ چٹ ایک دوسرے کے گالوں کے بوسے لیے اور پھر بے تکان گفتگو میں مصروف ہوگئیں۔ شامیر ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا دونوں کو باتیں کرتے دیکھتا رہا...... جواں سال عورت جرمن ہی تھی اور زویا سے کافی بے تکلف نظر آتی تھی۔ زویا اس کے ساتھ اپنی کسی نجی گفتگو میں مصروف تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو تواتر سے حرکت دے رہی تھی۔ گاہے بگاہے خوبصورت سفید دانتوں کی نمائش بھی کر رہی تھی۔ ہنستے ہوئے اس کے گال کا ڈمپل نمایاں تر ہو جاتا تھا۔ شامیر محویت سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ اردگرد کے سارے مناظر اس کی نگاہوں سے جیسے اوجھل ہو گئے۔

وہ اپنی اس ڈرامائی کیفیت پر بے حد حیران تھا۔ عورت اس کے لیے کوئی نئی اور انوکھی چیز نہیں تھی۔ کالج اور یونیورسٹی کے دور میں کئی لڑکیوں سے اس کی دوستی رہی تھی۔ ان میں سے کئی کافی خوبصورت بھی تھیں لیکن یہ سارے تعلق صرف دوستی تک ہی محدود رہے تھے۔ پروفیشنل لائف میں بھی الیکٹرانک میڈیا سے تعلق رکھنے والی دو تین، خوش شکل لڑکیوں نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی تھی مگر شامیر نے اپنے لیے کچھ حدود مقرر کر رکھی تھیں اور وہ ان سے کبھی بھی آگے نہیں بڑھا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ تہیہ بھی کر رکھا تھا کہ وہ جب بھی شادی کرے گا، اپنی اموخالہ کی پسند اور مشورے سے کرے گا۔ خالہ ثمینہ کو وہ پیار سے اموخالہ کہتا تھا لیکن یہاں فرینکفرٹ میں پچھلے دو چار دنوں میں جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ یہ لڑکی کسی تیز رفتار شعاع کی طرح سیدھی اس کے دل و دماغ میں گھسی تھی اور وہاں سرایت کر کے ناپید ہوگئی تھی۔ اپنی اندرونی کیفیات پر شامیر خود ہی سٹپٹانے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد فربہ اندام راک اسٹار بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کی آمد پر ہجوم نے خوب اودھم مچایا۔ اس نے چند پرشور گانے گائے تاہم ان میں سے ایک گانا قدرے دھیما اور بامعنی تھا۔ یہ شامیر کو پسند آیا۔ انگلش کے اس گانے کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور وہ ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے
اسے صحرا میں سایہ پسند نہیں
اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے
وہ انہونیوں کی متلاشی
وہ بے نشاں منزلوں کی راہی
وہ محبت ہے...... میرے یار و محبت ہے

راک اسٹار آخری بولوں کو بار بار دہراتا تھا...... اور

سامعین اس کے ساتھ اچھلتے کودتے اور نعرہ زنی کرتے تھے۔
زویا بھی اس گیت کے ردھم میں کھوسی گئی۔ شامیر نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ زیرلب بول دہرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں گداز دکھائی دیتا تھا...... شامیر کو اندازہ ہوا کہ اپنی سہیلی و روم میٹ خشامہ کے برعکس وہ حسِ لطیف رکھتی ہے اور پُراثر الفاظ اس پر اثر کرتے ہیں۔
شام کو ایک ریسٹورنٹ سے کھانا پیک کرا کے وہ فلیٹ میں واپس آگئے۔ زویا سارا دن شامیر کو شہر میں گھماتی پھراتی رہی تھی اور کافی تھک چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ خود کھانا پکانا چاہ رہی تھی۔ یہ شامیر ہی تھا جس نے اصرار کر کے ترک ریسٹورنٹ سے کھانا پیک کروایا تھا۔ کھانے کے بعد ٹی وی پر مووی دیکھنے کا پروگرام تھا، تاہم اسی دوران میں لاہور سے امو خالہ کی ویڈیو کال آگئی۔ شامیر کے لیے ان کی مختصر کال بھی آدھ پون گھنٹے سے کم نہیں ہوتی تھی اور آج کل تو وہ اس کے لیے زیادہ ترسی ہوئی تھیں۔ ان کی اولاد ایک بیٹے اور دو بیٹیوں پر مشتمل تھی۔ بیٹا تو شادی کر کے ساؤتھ افریقا آباد ہو چکا تھا۔ اب ان کے پاس صرف دو بیٹیاں ہی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شامیر کے ساتھ انہیں خاص انسیت محسوس ہوتی تھی...... اور یہ انسیت شامیر کے بچپن سے ہی موجود تھی۔ بعدازاں جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں شامیر کے والدین اسے دائمی جدائی دے گئے تو امو خالہ کے ساتھ شامیر کا محبت بھرا رشتہ مزید مضبوط ہو گیا۔ امو خالہ کی ایک بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ چھوٹی فارہ ابھی تیرہ چودہ سال کی تھی اور آٹھویں کی طالبہ تھی۔
......شامیر نے امو خالہ کو پچھلی دو روز کی ساری کارگزاری سنائی پھر اس کے دل میں نجانے کیا آئی کہ اس نے کہا۔ ''امو خالہ! اب میری دونوں میزبانوں میں سے اہم میزبان سے بھی مل لیجیے...... میرا مطلب ہے زویا...... یہ میرے سامنے ہی بیٹھی ہیں۔''
زویا کو جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر ''نہ'' کہا لیکن تب تک شامیر نے فون اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
''ہیلو آنٹی جان۔'' زویا سنبھل کر بولی۔
فون کا اسپیکر آن تھا۔ امو خالہ کی شفقت بھری آواز ابھری۔ ''ہیلو بیٹی! کیا حال ہے تمہارا؟ شامیر نے تمہاری بہت تعریف کی ہے۔''
''تعریف کے قابل تو یہ شومیر ہیں آنٹی۔ ان کے یہاں وزٹ کرنے سے ہام لوگوں کا ایک بہت بڑا پرابلم منٹوں میں حل ہو گیا۔ آپ کے بیٹے ماشاء اللہ بہت ذہین اور کمین ہیں......''
شامیر جلدی سے مائیک میں بولا۔ ''امو! یہ ذہین اور فطین کہنا چاہ رہی ہیں۔ ان کی اردو بس ایسی ہی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ان کی والدہ جرمن ہیں اور یہ یہیں پروان چڑھی ہیں مگر یہاں کی عام لڑکیوں سے یہ بالکل مختلف ہیں۔''
''مختلف تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ ماشاء اللہ پیاری بھی ہے۔ شادی وادی ہو چکی ہے بیٹی؟'' خالہ نے پوچھا۔
''ناہیں آنٹی جان! لیکن ہوپ فلی اس سال ہو جائیں گی۔'' اس نے بے جھجک جواب دیا۔
''کہیں بات چل رہی ہو گی؟''
''ج ...... جی ہاں۔'' زویا نے کہا پھر جلدی سے بات بدلتے ہوئے بولی۔ ''آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ہام کے...... یعنی میرے مائنڈ میں مدر کا جو تصور ہے، آپ اس پر پورا اترتا۔ ویسا ہی وائٹ وائٹ بال...... ویسا ہی ڈریس...... ویسا ہی چہرہ روشندان۔''
''امو! یہ روشن روشن کہنا چاہ رہی ہیں۔'' شامیر جلدی سے بولا۔ ''میرے ساتھ گلابی اردو بول بول کر ان کا جبڑا ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ اس لیے ایسے الٹے پلٹے الفاظ بول رہی ہیں۔''
''تو تم اس سے انگلش میں بات کیوں نہیں کرتے۔ کیوں تکلیف دے رہے ہو اس کو؟''
''ایسی گلابی اردو پھر کہاں سننے کو ملے گی امو! آپ یہاں ہوتیں تو خوب انجوائے کرتیں اور فارہ تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہی ہو جاتی۔''
''پلیز شٹ اپ۔'' زویا نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔
خالہ سے بات ختم ہوئی ہی تھی کہ باس سلطان صاحب کی کال آگئی۔ وہ شامیر سے بہت خوش تھے۔ سہراب درانی کی خفیہ پراپرٹی کے حوالے سے چینل نے جو اسٹوری تمام ثبوتوں کے ساتھ بریک کی تھی، اسے بہت پذیرائی ملی تھی۔ عظمت سلطان صاحب نے زویا سے بھی بات کی اور اسے شاباش دی۔
آخر میں وہ شامیر سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''تم نے اپنا کام بڑی جلدی نمٹا لیا ہے۔ کیا تمہیں یہ اندیشہ لاحق نہیں ہوا تھا کہ تمہیں کوئی اور کام سونپ دیا جائے گا؟''
''آپ جیسے باس کے حوالے سے اس طرح کے اندیشے رکھنا تو پھر کم ظرفی ہی کہلائے گا۔''
''گڈ...... اچھا جواب ہے۔ بونس کے طور پر کچھ مزید رقم تمہیں ٹرانسفر ہو جائے گی۔ گھومو پھرو...... تفریح کرو مگر اب

درانی والے اس معاملے سے بالکل الگ ہو جاؤ...... اور یہی ہدایت زویا کے لیے بھی ہے۔''

''اوکے سر!'' زویا نے مستعدی سے کہا۔

اس رات وہ پھر اس فلیٹ میں اکیلے تھے مگر شامیر کے لیے آج کی رات اور کل کی رات میں بہت فرق تھا۔ آج وہ اس تنہائی میں زویا کے ساتھ عجیب سی الجھن اور سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ ایسا شاید اس وجہ سے تھا کہ آج زویا کے حوالے سے اس کے سارے خیالات واحساسات بدل چکے تھے۔ رات کے سناٹے میں اس کے کروٹ بدلنے کی آہٹ، اس کی سانسوں کی آواز، اس کے لباس کا سرکنا اور اس کی کلائیوں میں بینگلز کا آپس میں ٹکرانا...... سب کچھ جیسے سیدھا شامیر کے دل پر لگ رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ ایکا ایکی یہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے؟

اس نے کہیں سن رکھا تھا کہ احساسات منتقل ہوتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں، اس کے اثرات دوسروں تک بھی پہنچتے ہیں۔ کیا وہ جو کچھ محسوس کر رہا تھا اس کی کھٹک زویا تک بھی پہنچ چکی تھی؟ یہ سوچ اس کے لیے مزید پریشانی کا باعث بنی۔ جیسے تیسے رات گزر گئی۔ آخری پہر وہ سو گیا۔ صبح جاگا تو زویا ناشتا تیار کر رہی تھی۔ وہ ابھی نہا دھو کر نکلی تھی اور بہت نکھری ہوئی نظر آتی تھی۔ اپنے نم بالوں کو اس نے جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔

''گڈ مارننگ۔'' اس نے شامیر کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''گڈ مارننگ...... اور سوری۔ میں دیر تک سویا رہا۔''

''نا ہیں، کوئی ایسا دیر بھی نا ہیں۔''

''آج کیا پروگرام ہے؟''

''12 نمبر ٹرین پر بیٹھیں گے اور آخری اسٹاپ تک جائیں گے۔ وہاں خاصا بڑا پکنک اسپاٹ ہے۔ فرینکفرٹ کا سیر بھی ہو جائیں گا اور جھال بھی دیکھ لیں گے۔'' وہ جھیل کو جھال کہہ رہی تھی۔

ناشتے میں انڈے اور چکن کے گوشت کی ڈش وغیرہ تھی۔ آج ٹرینیں بحال تھیں...... وہ پہلے اسٹیشن پر پہنچے۔ وہاں سے 12 نمبر پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ یہ خاصا طویل سفر تھا۔ شہر کا بیشتر حصہ انہوں نے دیکھ لیا اور مضافات میں پہنچ گئے۔ زویا جینز اور ٹی شرٹ میں تھی۔ اس نے بال مسلسل جوڑے کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے بالوں کو کل کی حرکت کی سزا دے رہی تھی، جب وہ ٹاور کی ہوا میں دیوانہ وار جھومے تھے اور شامیر کے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔

وہ 12 نمبر کے آخری اسٹاپ پر اترے۔ وہ شہر سے کافی دور نکل آئے تھے۔ گہرے سبز درختوں میں گھری ہوئی ایک چمکیلی جھیل انہیں دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ آج بھی چھٹی کا دن تھا۔ یہاں تفریح کرنے والے کافی لوگ موجود تھے۔ ان میں بچے بوڑھے جوان سب شامل تھے۔ زویا ایک ماہر گائڈ کی طرح شامیر کو یہاں کی تاریخ اور موجودہ حیثیت سے آگاہ کرتی رہی۔ وہ اردو میں ہی بولنے کی کوشش کرتی مگر جہاں اٹک جاتی تھی، انگلش میں رواں ہو جاتی تھی۔ تاہم کل کے مقابلے میں وہ آج زیادہ کھلکھلاتے ہوئے موڈ میں نہیں تھی۔ جھیل کے اردگرد واقعی جنگل کا سا سماں تھا۔ کچھ آگے جا کر انہیں ایک مصنوعی پہاڑی سی نظر آئی۔ یہاں بھی لوگ چڑھ اتر رہے تھے۔ وہ بھی چڑھنے لگے۔ یہاں بربے بھلے چوبی زینے بھی بنے ہوئے تھے مگر ایک جگہ چار پانچ زینے غائب تھے۔ شامیر تو پتھروں کو پکڑ کر چڑھ گیا مگر زویا کو دشواری پیش آئی۔ شامیر پہلے تو جھجکا پھر اس نے اپنا ہاتھ زویا کی طرف بڑھایا۔

زویا نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ اس کا ہاتھ تھام لے گی مگر پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ شامیر اپنا ہاتھ پھیلائے رہ گیا اور وہ تھوڑا سا گھوم کر اور ایک درخت کی جڑوں کو پکڑ کر اوپر چڑھ آئی۔ شامیر کھسیانا سا ہوا۔ اس کی اس کھسیاہٹ کو قریب ہی موجود نوجوانوں کی ایک ٹولی نے دیکھا۔ ایک چلبلے لڑکے نے ہوٹنگ کے انداز میں ''اووو شٹ'' کا نعرہ بلند کیا۔

چٹائی پر بیٹھے دیگر لڑکے لڑکیاں بھی ہنسنے لگے۔ شامیر کی پیشانی پر پسینا سا آ گیا۔ اسے معلوم نہیں ہوا کہ زویا کو لڑکوں کی اس شرارت کا پتا چلا ہے یا نہیں۔ بہرحال وہ دونوں جلد ہی اس جگہ سے کافی آگے نکل گئے۔

شامیر کی باقی کی ساری سیر کچھ بے مزہ سی رہی۔ یوں تو وہ دونوں آپس میں ہنستے بولتے بھی رہے، تبصرے بھی کرتے رہے مگر خوشی دینے والا کوئی بٹن سا تھا جو شامیر کے اندر آف ہو گیا تھا۔ وہ بار بار سوچ رہا تھا کہ کل تو وہ بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر بسوں پر اتر چڑھ رہی تھی اور اسے بازو سے کھینچ کر ہجوم کے اندر بھی گھس گئی تھی مگر آج یہ فاصلہ کیوں پیدا ہو گیا تھا؟ اس کے ذہن میں پھر وہی بات آئی کہ شاید زویا کے بارے میں جن نئے خیالات نے خود شامیر کے اندر جنم لیا تھا، انہوں نے زویا کے اندر جھجک اور گریز پیدا کر دیا ہے۔

رات کو کھانے کے بعد شامیر کو ایک ہلکا سا شاک اور لگا۔ اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ وہ آج پھر کمرے میں اکیلے ہوں گے۔ غیر متوقع طور پر گھنگرالے بالوں اور لمبی ناک والی ایک دبلی پتلی دراز قد لڑکی اندر آ گئی۔ یہ بھی زویا کی فرینڈ تھی اور جرمن تھی۔ زویا نے شامیر سے مخاطب ہوتے ہوئے انگلش میں کہا۔ ''آج اس کی روم میٹ بھی کہیں گئی ہوئی ہے۔ اکیلی بور ہو رہی تھی۔ میں نے کہا چلو آج ادھر آ جاؤ۔ ذرا کمپنی رہے گی۔''

کہنے کو تو زویا یہ بات کہہ رہی تھی تاہم شامیر کا دل کہتا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔ اس لڑکی کی آمد کے پیچھے بھی زویا کی وہی جھجک ہے جو کل دوپہر کے بعد سے اس کے اندر اچانک نمودار ہوئی ہے۔

لڑکی نے شامیر کو کمپنی کیا دینا تھی۔ وہ تو سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے جرمن بول رہی تھی اور زویا بھی جرمن میں ہی اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔ شامیر نے خود کو اس کمرے میں بالکل اجنبی اور اضافی محسوس کیا۔ سونے سے پہلے ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہاں باقی کے دن کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کرے گا۔ باس سلطان صاحب نے بونس کی نوید بھی سنا دی تھی۔ شامیر کو امید تھی کہ وہ ہوٹل کے قیام کو آسانی سے افورڈ کر لے گا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح سویرے شامیر کا پیک سامان دیکھ کر زویا حیران رہ گئی۔ ''یہ کیا ہے شومیر صاحب؟'' اس نے ہمیشہ کی طرح شامیر کے نام کا حلیہ بگاڑا۔

شامیر بولا۔ ''آج خشامہ واپس آ جائے گی۔ میں آپ کو اور خشامہ کو مزید تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی باس سلطان صاحب بڑے اچھے موڈ میں ہیں۔ رات کو ان سے میری بات ہوئی ہے۔ انہوں نے کچھ رقم بھی ٹرانسفر کی ہے اور کہا ہے کہ میں ہوٹل میں شفٹ ہو جاؤں۔''

''ہام کے خیال میں تو یہ ایکسٹرا خرچہ بالکل مناسب ناہیں۔'' وہ جز بز ہو کر بولی۔

''لیکن اب تو یہ ہو چکا۔ سلطان صاحب نے رات کو ہی پیٹرز برگ کے علاقے میں ایک ہوٹل میں بکنگ کرا دی تھی۔''

زویا کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا مگر وہ کچھ بولی نہیں۔

شامیر اسی روز ہوٹل منتقل ہو گیا۔ یہ درمیانے درجے کے ہوٹل کا سنگل بیڈ والا کمرا تھا۔ شامیر کے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ یہاں سے دریائے مائنز زیادہ دور نہیں تھا۔ ہوٹل کی پانچویں منزل سے دیکھنے پر، بلند عمارتوں کے درمیان ایک جگہ سے دریائے مائنز کا چمکتا پانی نظر آتا تھا۔

اگلے قریباً بہتّر گھنٹے شامیر نے ہوٹل کے کمرے میں ہی بند ہو کر گزارے۔ کہیں گھومنے پھرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی اندرونی کیفیت ایسی تھی کہ خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اچانک کسی نادیدہ شکنجے میں جکڑ گیا ہے۔ ایسی صورتِ حال تو اس نے صرف کتابوں میں پڑھی تھی یا خاص حسن و عشق کے موضوع پر بننے والی فلموں میں دیکھی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ زویا نام کی اس لڑکی کو اب سے نہیں، شاید کئی برسوں یا کئی زمانوں سے جانتا ہے۔ اس کی ہر ادا، اس کا ہر انداز، اس کے چہرے کے سارے اتار چڑھاؤ اور نقوش اس کے دیکھے بھالے تھے......اور اس کا لہجہ، اس کی آواز......ہاں، یہ لہجہ اور آواز بھی تو اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔

اسے یہ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے اور جوں جوں یہ یقین پختہ ہو رہا تھا، اس کی بے قراری اور جھنجلاہٹ بڑھ رہی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ اس نے تو خود سے عہد کر رکھا تھا کہ وہ ''محبت کی شادی'' نہیں کرے گا اس کی محبت، شادی کے بعد ہوگی۔ وہ اپنی زندگی کا یہ باب اپنی اموخالہ کے لیے چھوڑ دے گا۔ وہ اس پر جو لکھنا چاہیں گی، لکھ لیں گی۔ پھر یہ لڑکی کیوں ایک منہ زور ریلے کی طرح اس کے دل و دماغ میں گھس آئی تھی......اور اب گھستی چلی آ رہی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ محبت ہمیشہ ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے۔ ان لمحوں میں اچانک اسے راک اسٹار کا وہ گیت یاد آ گیا جو تین چار روز پہلے اس نے زویا کے ساتھ دریائے مائنز کے کنارے سنا تھا۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے
اسے صحرا میں سایہ پسند نہیں
اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے
وہ انہونیوں کی متلاشی......

شام ہو چکی تھی۔ آج اسے ہوٹل میں شفٹ ہوئے تیسرا دن تھا۔ اس کا فون نمبر زویا کے پاس موجود تھا مگر زویا نے اس کا حال احوال نہیں پوچھا تھا۔ ہاں، بس ایک بار خشامہ کی کال آئی تھی اور اس نے قینچی کی طرح زبان چلا کر دس پندرہ منٹ تک اس کے کان کھائے تھے۔

شامیر نے ایک بار پھر اپنے فون کی اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ زویا کی طرف سے کوئی میسج یا مسڈ کال وغیرہ نہیں تھی۔ اس نے اسکائپ کے وڈیو لنک کے ذریعے اموخالہ

سے رابطہ کیا۔

''امو! وہ لڑکی کیسی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''پیاری تھی۔ شوخی اور معصومیت دونوں اس میں اکٹھی نظر آتی ہیں......'' انہوں نے کہا اور سوالیہ نظروں سے شامیر کی طرف، یعنی کیمرے کی طرف دیکھا۔

وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولا۔ ''امو! ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟''

وہ مسکرائیں۔ ''میرا بیٹا شاید کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔''

''نن......نہیں امو...... بالکل بھی نہیں۔''

''جب تم بالکل بھی نہیں کہتے ہو...... تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کچھ تھوڑا بہت تو ہے۔'' انہوں نے کہا اور مسکراتی نظروں سے شامیر کے بولنے کا انتظار کرتی رہیں۔

وہ گلا صاف کر کے بولا۔ ''ویسے کتنا اچھا ہوتا امو! آپ بھی یہاں ہوتیں اور اس کو دیکھتیں۔''

''تو ایسی کیا بات ہے...... میں اب بھی دیکھ سکتی ہوں۔ یہ جو تم لوگوں کا سیل فون ہے، یہ تو آئینہ جہاں نما بنا ہوا ہے۔ اس پر دو چار دفعہ میری بات کراؤ اس سے۔''

''لیکن...... امو...... آپ ہی تو کہا کرتی ہیں کہ یہ جو لڑکیاں مغربی ملکوں میں پلتی بڑھتی ہیں، یہ گھر گرہستی والی نہیں ہوتیں۔''

وہ کچھ دیر چپ رہ کر بولیں۔ ''ہاں...... یہ بات تو ہے شامیر...... مگر کیا کہتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں تو برابر نہیں ہوتیں۔ اچھوں میں برے اور بروں میں اچھے تو ہوتے ہیں۔ اگر تم......'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

''بولیں نا امو۔'' شامیر نے کہا۔

''شامیر! زندگی بھر کا ناتا جوڑنے سے پہلے بندہ جتنا بھی سوچ سمجھ اور پرکھ لے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے...... ایسے معاملوں میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جاتی۔''

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں امو! دو چار دن میں بھلا کسی کے بارے میں کیا پتا چل سکتا ہے۔ سوری! میں نے خوامخواہ یہ بات چھیڑ دی۔'' پھر وہ بڑی صفائی سے گفتگو کا رخ موڑ کر جرمنی کی سیر و سیاحت کی طرف لے گیا۔ اسی دوران میں اس کی خالہ زاد بہن تیرہ سالہ فارہ بھی گفتگو میں شریک ہو گئی اور اپنی فرمائشیں داغنے لگی۔ شامیر نے امو خالہ اور فارہ سے وعدہ کیا کہ وہ ان دو تین ہفتوں میں جرمنی میں خوب گھومے پھرے گا۔

بات ختم کر کے وہ بستر پر چت لیٹ گیا۔ اس کے سینے میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ جرمنی میں خوب گھومے پھرے گا۔ باس سلطان صاحب بھی چاہتے تھے کہ وہ یہ دو تین ہفتے تفریح میں گزارے، مگر اس کے اندر خوشی کا جو بٹن آف ہو گیا تھا، وہ کسی طرح آن ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ جرمنی میں اس کا گھومنا پھرنا، زویا کے ''ساتھ'' سے مشروط ہو گیا ہے۔

اچانک ڈور بیل سنائی دی۔ لکڑی کے فرش پر ننگے پاؤں چلتا شامیر دروازے پر پہنچا۔ پہلے ''پیپ ہول'' سے باہر جھانکا، پھر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے زویا کھڑی تھی۔

''گڈ ایوننگ۔'' وہ ہلکے سے مسکرائی۔ آسمانی رنگ کی شرٹ اور ٹراؤزر میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''گڈ ایوننگ۔'' شامیر نے کہا اور اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ خوشبو کا ایک جھونکا سا اس کے ساتھ اندر آیا۔ شامیر کا دل ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک رسمی باتیں کرتے رہے، پھر وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ کمرے کی خاموشی بوجھل ہونے لگی۔ وہ شامیر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو...... مجھ سے...... ناراضگی ہو گیا؟''

''آپ کو کیسے لگا کہ میں ناراض ہوں؟''

''آپ ایک ڈم یہاں شفٹ ہو گیا...... آپ نے فون کرنا بھی پسند نا ہیں کیا۔''

''فون تو آپ نے بھی نہیں کیا۔ کیا آپ بھی ناراض ہیں؟''

''مجھے لگتا...... کہ آپ کو اس روز کا بات آچھا نا ہیں لگا۔''

''کون سی بات؟''

اس نے سر کو ذرا جھکا کر بالوں کو کان کے پیچھے اڑسا اور بولی۔ ''وہاں پکنک اسپاٹ پر آپ نے ہام کو (ہم کو) اوپر چڑھانے کے لیے اپنا ہینڈ آگے کیا...... ہام نے آپ کا ہینڈ نا ہیں پکڑا۔ وہاں بیٹھے لڑکوں نے آپ کو ہوٹ کیا......''

اس کا مطلب تھا اس نے وہ ساری صورتِ حال نوٹ کی تھی۔ شامیر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہاں تھوڑا سا محسوس تو ہوا تھا، مگر مجھے اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ایسی بات پر آپ سے ناراض ہو جاؤں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے بھی چاہیے تھا...... میں آپ کو فون کرتا......''

وہ مسکرائی۔ ''یعنی ہام ڈونوں تھوڑا تھوڑا قصوروار۔''

''اور دونوں تھوڑا تھوڑا بے قصور۔'' شامیر نے کہا۔

وہ ہنس دی اور اس کے گال کا گڑھا نمایاں ہو گیا۔

شامیر نے روم سروس کو کال کر کے سافٹ ڈرنکس

منگوائے۔ وہ ڈرنکس لینے کے ساتھ ساتھ نیم گرم موسم کے حوالے سے بات کرتے رہے...... زویا ایکدم اچھے موڈ میں نظر آنے لگی تھی۔ آنے والا ویک اینڈ ایک اضافی چھٹی کی وجہ سے ''لونگ ویک اینڈ'' تھا۔ زویا نے کہا کہ بندہ جرمنی آئے اور دیوار برلن نہ دیکھے تو یہ ایسا ہی ہے کہ دریا پر جائے اور منہ خشکی کی طرف کر کے بیٹھ جائے۔

گفتگو کے دوران میں ایک موقعے پر وہ اپنے مخصوص لب ولہجے میں بولی۔ ''ہام کا دل ہوتا کہ آپ واپس فلیٹ میں آجائیں۔''

شامیر نے کہا۔ ''آپ کی اردو پر کافی محنت کی ضرورت ہے۔ دل ہوتا نہیں...... دل چاہتا......''

وہ بولی۔ ''چلیں...... ہام کا دل چاہتا کہ آپ......''

''لیکن ہام کا دل اور کچھ چاہتا۔'' شامیر نے اسی کے انداز میں اس کی بات کاٹی۔

''کیا چاہتا؟''

''کہ آپ چھ سات روز کے لیے اس ساتھ والے کمرے میں شفٹ ہوجائیں۔ یہاں کا کرایہ کافی مناسب ہے۔ افورڈ کیا جاسکتا ہے۔''

''خشامہ میرا سر پھاڑ دے گا۔ وہ اچھا لڑکی...... مگر جب کمرے میں اکیلا ہوتا تو ایک گھنٹے میں آبرو باختہ ہوجاتا۔''

''ایک گھنٹے میں آبرو باختہ۔'' شامیر حیران ہوا، پھر ذرا رک کر بولا۔ ''آبرو باختہ کا مطلب سمجھتی ہیں آپ؟''

''آبرو باختہ...... یعنی آبرو باختہ...... یعنی پریشان ہوجانا...... کچھ سمجھ میں نہ آنا......''

شامیر نے ماتھا پکڑلیا۔ ''محترمہ! اسے آبرو باختہ نہیں، حواس باختہ کہتے ہیں۔ آبرو باختہ کا مطلب، آپ کو پتا ہے کیا ہے؟''

''کیا؟''

''عزت لٹا دینا...... آپ کے فقرے کا مطلب ہوا کہ اگر خشامہ کمرے میں اکیلی ہو تو ایک گھنٹے میں......''

شامیر نے جملہ ادھورا رہنے دیا...... اور زویا کی طرف دیکھنے لگا پھر کھنکھار کر بولا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی اردو میں مشکل لفظ استعمال نہ ہی کیا کریں۔''

وہ ہونٹوں کو بھینچ کر ذرا حیران نظروں سے شامیر کی طرف دیکھتی چلی جارہی تھی پھر جیسے یکایک اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر ہنسی روکنے کی کوشش کرنے لگی مگر ناکام ہوئی۔ ہنسی کی شدت سے وہ دہری ہونے لگی، چہرہ سرخ ہوگیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ان لمحوں میں وہ شامیر کو اتنی پیاری لگی کہ وہ ششدر رہ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ اس منظر کو لفظوں میں بیان کرنا چاہے، یا کسی بھی طریقے سے اس کا اظہار کرنا چاہے تو شاید نہ کرسکے۔

آخر اس نے بمشکل اپنی ہنسی کو بریک لگائے۔ ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''شومیر! ہام بھی بہت حیران ہوتا تھا کہ ہام کی انڈین ہمسائی ہام سے بات کیوں نہ کرتا۔ وہ ایک اسکول میں ٹیچر ہے۔ ڈو ہفتے پہلے ہام نے اس کو بھی یہی لفظ بولا...... اس نے غلطی سے اپنے سائیکل کا پہیا ہام کے پاؤں پر چڑھایا۔ ہام نے کہا، آپ آبرو باختہ عورت ہو۔ اوہ گاڈ...... اوہ گاڈ...... اب تو ہام کو اس سے ملنا ہوئیں گا۔ اس کی مذمت کرنا ہوئیں گا۔''

''آپ پھر غلط فرما رہی ہیں۔'' شامیر نے کہا۔ ''آپ کو مذمت نہیں، معذرت کرنا ہوگی۔''

''یس...... یس! ہام یہی کہنا چاہتا۔''

اسی دوران میں شامیر کے آرڈر پر چائے آگئی۔ زویا بولی۔ ''ہام کو چائے سے پہلے چاکلیٹ کھانا بہت اچھا لگتا۔ بچپن میں پاپا سے ڈانٹ بھی پڑتا مگر ہام باز نا ہیں آتا۔''

اس نے اپنے پرس میں سے ایک بڑی چاکلیٹ نکالی۔ ''اب آپ تو نا ہیں ڈانٹیں گے؟'' اس نے کہا۔

''اتنی اچھی چاکلیٹ اگر آپ میرے ساتھ شیئر کریں گی تو میں دیوانہ ہوں جو آپ کو ڈانٹوں گا۔''

''یہ ڈراصل میں لائی ہی آپ کے لیے تھی۔ یہاں کا رواج ہے، کسی کو منانا ہو، ڈوستی (دوستی) کرنا ہو تو چاکلیٹ کو بیچ میں لایا جاتا ہے۔'' اس نے چاکلیٹ شامیر کی طرف بڑھائی۔

''تھینک یو۔'' شامیر نے کہا۔ اس کی دھڑکنوں میں ایک عجیب سنسناہٹ سی جاگ گئی تھی۔ وہ تحقیق کرنے والا ایک جواں سال صحافی تھا۔ ایک نہایت سنجیدہ پیشے سے تعلق رکھتا تھا مگر پتا نہیں کیا بات تھی، ان دنوں وہ خود کو ایک کالجیٹ نوجوان کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ کوئی سحر تھا اس لڑکی کی شخصیت میں۔

وہ چائے بنانے لگا تو اس نے شامیر کا ہاتھ روک دیا۔ ''نا ہیں، ہام بنائے گا۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ٹی ٹرالی پر ذرا سا جھک کر وہ پیالیوں میں بڑی نفاست سے قہوہ ڈالنے لگی۔ پھر اس نے شکر اور دودھ کا پوچھا۔ اس کے بال سرک کر اس کے رخساروں کو ڈھانپ رہے تھے۔ روم لائٹ نے اس کے نصف چہرے کو روشن کر کے ایک دلکش پینٹنگ سے مشابہ

کر دیا تھا۔

واقعی کچھ لمحے بڑے جدا ہوتے ہیں۔ گھڑیوں کے ڈائلز پر اور کیلنڈروں کے صفحات پر ''عام'' ہونے کے باوجود وہ عام نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ خاص ہوتا ہے اور وہ بندے کو کچھ خاص کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

شامیر کھوئے کھوئے سے انداز میں زویا کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی شامیر کی طرف بڑھائی۔ پیالی تھامنے کے بعد اس نے بڑی نرمی سے زویا کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ تعجب سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

بالکل بے ساختہ...... شامیر کے منہ سے نکلا۔

''زویا...... کیا میں...... آپ کو پرپوز کر سکتا ہوں؟''

ایک دم جیسے چھناکے سے کوئی چیز ٹوٹی اور اس کی کرچیاں پورے کمرے میں بکھر گئیں۔ زویا نے اپنا ہاتھ یوں کھینچا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ وہ یکا یک اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔

چائے زویا کے سامنے پڑی تھی مگر اب اس کی توجہ چائے سے یکسر ہٹ چکی تھی بلکہ وہ جیسے اچانک اس کمرے میں موجود ہر چیز سے اور شامیر سے بہت دور چلی گئی تھی......

''کک...... کیا ہوا زویا؟'' شامیر نے بجھے بجھے لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نا ہیں...... میں...... ویسے ہی......'' وہ گڑبڑا کر چپ ہو گئی۔ اس کے چہرے کے رنگ میں ایک طرح کی زردی شامل ہو گئی تھی۔

اس کے بعد وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رک سکی۔ چائے بھی اس نے وہیں رہنے دی پھر اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''مجھے جانا ہوگا۔ ایک ضروری کال آ رہی ہے۔'' اس نے انگلش میں کہا۔

شامیر گنگ سا ہو گیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس نے کوئی بڑی غلطی کر دی ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زویا اس طرح ناراض ہو کر یہاں سے چلی جائے۔ ''سنو زویا! بس چند سیکنڈ کے لیے میری بات سن جائیں......'' اس نے اسے روکنے کے لیے بے ساختہ اس کا بازو تھاما۔

ردعمل شامیر کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ وہ سخت جھنجلائے ہوئے انداز میں بولی۔ ''پلیز، چھوڑیں مجھے۔''

شامیر کو دھکیلتی ہوئی سی وہ باہر نکل گئی۔ شامیر جیسے لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر ختم ہو رہا تھا۔ شہر کی روشنیوں کے سوا ہر چیز جیسے سو رہی تھی۔ ساتھ والے بیڈ پر خشامہ کے مدھم خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ زویا دیوار گیر کھڑکی کے سامنے آن کھڑی ہوئی...... شام کو جو کچھ ہوا اس کی زویا کو ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ عموماً انڈیا، پاکستان اور بنگلا دیش وغیرہ سے تعلق رکھنے والے مرد و زن سے دور ہی رہتی تھی۔ ایک عجیب سا کھنچاؤ محسوس ہونے لگتا تھا اسے مگر اسے شامیر دوسروں سے مختلف دکھائی دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ ناراض ہوا تو زویا رنجیدہ ہو گئی۔ اس نے ہوٹل جا کر اسے منایا...... لیکن اس موقع پر وہ اس طرح کی بات کرے گا، زویا نے سوچا بھی نہ تھا۔ گھومنے پھرنے اور شارٹ پیریڈ کی دوستی تک تو ٹھیک تھا لیکن جو بات شامیر نے کہی تھی، وہ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے اپنی ماما کی کہی ہوئی بات یاد آنے لگی۔ وہ اکثر ایک فقرہ بولتی تھیں۔ ''یہ ایشیائی مرد ایک دم دل پھینک ہوتے ہیں۔ جو عورت ہنس کر دو باتیں کر لے، یہ سمجھتے ہیں کہ اب اس کو بیوی بنا کر گھر میں ڈالنا ضروری ہو گیا ہے۔''

آج شام اسے اپنی ماما کے اس فقرے کی صحت کا اندازہ ہوا تھا۔ ابھی تین چار دن کی جان پہچان تھی اور شامیر نے اسے پرپوز کر ڈالا تھا۔ وہ اس کے پرپوزل پر سکتہ زدہ رہ گئی تھی۔ پھر اس کا اچانک بازو پکڑ لیا۔ بے شک اس کی نیت صرف زویا کو روکنے کی تھی مگر پتا نہیں کیوں وہ دفعتاً سیخ پا ہو گئی تھی۔ وہ شامیر کو دھکیلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

اس کے تصور میں کچھ بھولے بسرے مناظر ابھرے اور سماعت میں کچھ گمشدہ آوازوں کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ وہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔ اس کے والدین یوں تو ہر وقت ہی جھگڑتے رہتے تھے مگر تہواروں اور شادی بیاہ کے موقعوں پر وہ خصوصی اہتمام کے ساتھ اپنے بچوں کے لیے خوف اور دکھ کا ماحول بناتے تھے۔ زویا کو یاد تھا، تہواروں کی خوشی کے ساتھ ساتھ اس کے ننھے دل میں ماما پاپا کے جھگڑے کا اندیشہ بھی براجمان رہتا تھا اور کچھ یہی کیفیت اس کی دونوں بڑی بہنوں کی ہوتی تھی۔

اگر جھگڑا تہوار سے ایک دو دن پہلے نہیں ہوتا تھا تو تہوار والے دن تو ضرور ہو جاتا تھا اور یہ کوئی معمولی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ پاپا کے دھاڑنے اور ماما کے چلانے کی آوازوں سے گھر کے در و دیوار گونجنے لگتے تھے۔ برتن ٹوٹتے تھے، چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکی جاتی تھیں۔ دونوں طرف سے سخت بدزبانی ہوتی تھی اور آخر میں پاپا...... ماما کو پیٹ ڈالتے تھے۔ وہ تینوں بہنیں ڈری سہمی، گھر کے کسی کونے میں دبک جاتی تھیں۔ جھگڑے کا اختتام کبھی کسی

پڑوسی کی آمد پر ہوتا تھا۔ کبھی پاپا گرجتے برستے دو چار گھنٹوں کے لیے گھر سے باہر چلے جاتے تھے...... اور چند بار تو ایسا بھی ہوا تھا کہ پولیس کی آمد ہو گئی تھی۔

ماما اور پاپا کی طلاق سے دو تین سال پہلے ایک بار زویا نے اپنی ماما سے پوچھا تھا۔ ''آپ دونوں کے جھگڑے کب اور کس بات سے شروع ہوئے؟''

ماما نے کہا تھا۔ ''جھگڑے شادی کے پانچ چھ ماہ بعد ہی شروع ہو گئے تھے، مگر کس بات پر ہوتے، اس کا تعین کرنا تھوڑا مشکل ہے، کم از کم تم شاید نہ سمجھ پاؤ گی۔''

زویا نے کہا تھا۔ ''کیا شادی کے بعد پاپا کی محبت میں کمی آ گئی تھی؟''

''نہیں۔ میں یہ بالکل نہیں کہوں گی۔ راشد مجھ سے پیار کرتے تھے اور شاید اب بھی کرتے ہیں...... انہوں نے میری اور تم بچوں کی تمام ضروریات بھی اچھے طریقے سے پوری کی ہیں۔ اکثر پہلوؤں سے وہ ایک اچھے شوہر اور باپ ہیں...... مگر ان کی سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ وہ مجھ سے غیر مشروط محبت نہیں چاہتے تھے۔''

''غیر مشروط؟'' زویا نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ شاید تم ٹھیک سے سمجھ نہ پاؤ۔ تم اسے ایک نفسیاتی کج روی بھی کہہ سکتی ہو...... وراثتی عارضہ بھی...... یا ایسا ہی کوئی اور نام دے سکتی ہو۔ اس کی شروعات بالکل چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوئی تھی۔ میں تمہیں ایک مثال دیتی ہوں۔ مجھے بچپن سے سگریٹ کا دھواں بے حد ناپسند تھا۔ سگریٹ کی بو سے مجھے متلی ہونے لگتی تھی۔ راشد بھی سگریٹ پیتے تھے۔ شادی کے بعد میں نے ان سے مناسب لفظوں میں اس بات کا ذکر کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے لیے یہ بری لت چھوڑ دیں گے مگر یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ وہ بدستور سگریٹ پیتے رہے بلکہ پہلے سے زیادہ پینے لگے۔ مجھے لگا، جیسے وہ چاہتے ہیں کہ میں اس بو...... سمیت ہی انہیں قبول کروں اور ان کے پاس آؤں...... میں نے یہ سب قبول کر لیا تو پھر اس طرح کے کچھ اور سلسلے شروع ہو گئے۔ مجھے اچھا لباس اور خوشبو پسند تھی، راشد کا صاف ستھرا رہنا پسند تھا مگر جب انہیں اس کا احساس ہوا تو انہوں نے اپنے حلیے کی طرف سے بالکل بے پروا رہنا شروع کر دیا۔ میں جب ان کے پاس ہوتی تو ان کے جسم سے پسینے کی بو اٹھ رہی ہوتی۔ پہلے اگر وہ ہفتے میں چار بار نہاتے تھے تو اب مہینے میں چار بار نہانے لگے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میرے لیے خصوصی طور پر اپنے پسینے اور اپنی سانسوں کی بو کا اہتمام کرتے ہیں اور اس پر آسودگی محسوس کرتے ہیں کہ میں پھر بھی ان کی قربت کے لمحوں کی ساتھی بنتی ہوں۔ ایک موقع پر میں نے ان سے کہا کہ ان کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اچھی لگتی ہیں۔ انہوں نے مونچھیں صاف کرا دیں...... اور شیو کی طرف سے بے پروائی برتنا شروع کر دی۔ ایسی بے ڈھنگی اور تکلیف دہ باتوں کی فہرست بہت طویل ہے زویا۔ کیا کیا بتاؤں؟''

زویا نے ماما سے کہا تھا۔ ''ماما! آپ کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں لیکن پاپا بھی تو کئی ایسے شکوے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ صرف منہ زبانی مسلمان ہوئی ہیں۔ آپ کو اب بھی یہاں کا مذہب اور یہاں کا رہن سہن ہی پسند ہے۔ آپ جان بوجھ کر پاکستانی لباس پہننے سے گریز کرتی ہیں۔ خوشی کے موقعوں پر آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ مغربی طرز کی کوکنگ کی جائے۔ کئی موقعوں پر آپ حلال گوشت کو بھی نظر انداز کر دیتی ہیں۔ آپ جان بوجھ کر مذہب کے حوالے سے اختلافات کو ہوا دیتی ہیں۔ اس طرح کے اور کئی اعتراضات کرتے ہیں پاپا۔''

زویا کی ماما سارہ نے اس موقعے پر ایک گہری سانس لی تھی۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی تھیں۔ ''میں خود کو مکمل بے قصور نہیں گردانتی۔ جو باتیں تم کہنا چاہ رہی ہو، وہ ساری غلط نہیں ہیں لیکن زویا! یہ ایک ردعمل کے طور پر ہوا ہے۔ شروع میں، میں ان کا رویہ اور ان کی زیادتیاں بچوں کی خاطر برداشت کرتی رہی لیکن پھر دھیرے دھیرے میرے اندر کی اذیت اور گھٹن کا اظہار بھی مختلف طریقوں سے ہونے لگا۔ ممکن ہے کہ کئی بار میری طرف سے بھی کچھ حدیں پار ہوئی ہوں...... لیکن اب یہ سب کچھ ہم دونوں کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔ میں اپنے قدم روک سکتی ہوں اور نہ وہ۔ اب تو...... وہ ایک ہی حل ہے جو نوشتۂ دیوار کی طرح نظر آ رہا ہے۔''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں ماما؟'' زویا نے روہانسی ہو کر کہا تھا۔

''یہ میں نہیں کہہ رہی...... یہ طویل زمانے اور تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جانے والا رویہ کہہ رہا ہے۔ ہر خطے اور ہر رنگ و نسل کے لوگ اپنا اپنا مزاج رکھتے ہیں۔ ان مزاجوں کی ہم آہنگی کا سپنا اکثر جھوٹا ہی ثابت ہوتا ہے زویا۔ تم لوگ ذرا بڑے ہوئے تو پھر سب سے بڑا اور اہم ترین مسئلہ ہمارے سامنے آ گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ اب بیٹیاں بڑی ہو رہی ہیں...... ہم یہاں رہیں کہ پاکستان چلے جائیں۔ راشد ہر صورت پاکستان جانا چاہتے تھے۔ وقت گزرنے کے

ساتھ ساتھ ان کا یہ تقاضا بڑھتا چلا گیا...... اور اس کے ساتھ ساتھ ہم دونوں کی درمیانی خلیج بھی بڑھتی چلی گئی۔ میں کسی طور اپنا وطن چھوڑنے کو تیار نہیں تھی اور نہ کبھی ہوں گی......''

ماضی کی گمشدہ آوازیں زویا کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی فرینکفرٹ کی اونگھتی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ ساتھ والے بستر پر خشامہ نے کھانس کر کروٹ بدلی تو زویا اپنی سوچوں سے باہر آگئی۔

شاید ماما نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مشرق اور مغرب کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صرف تین چار دن کی جان پہچان، گفتگو کی چند نشستیں، ذرا سی بے تکلفی اور شادی کی آفر......

''اونہہ......'' اس نے سر ہلایا اور بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑستی ہوئی دوبارہ بستر پر آگئی مگر ابھی نیند کے آثار نہیں تھے۔ اس کی نگاہوں میں شامیر کا چہرہ گھومنے لگا۔ شام کو وہ جب جھنجلاہٹ اور غصے کے عالم میں اس کے کمرے سے نکلی تھی تو اس کا چہرہ اس بجھی ہوئی راکھ جیسا تھا جو ہوا کے ایک جھونکے سے ناپید ہونے والی ہو۔ شرمندگی، بے چارگی، پچھتاوا سب کچھ غیر معمولی شدت کے ساتھ اس کے نقوش پر بکھرا ہوا تھا۔

ایک لمحے کے لیے زویا کو تھوڑا سا ترس آیا مگر پھر فوراً ہی غم و غصہ اس پر غالب آگیا۔ آخر اس نے ایسی بے وقوفی کی ہی کیوں؟ کتنی بے موقع اور کتنی بے تکی بات کر دی تھی اس نے۔ ایک ہی جملے سے خود کو عرش سے فرش پر لے آیا تھا...... شاید...... ایشیائی مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔

اسی دوران میں اس کے موبائل فون پر وائبریشن ہوئی۔ یہ اس کی ماما کا فون تھا۔ وہ کوئی ایک مہینے بعد رابطہ کر رہی تھیں۔ ''ہیلو زویا! تم سو تو نہیں گئی تھیں؟''

''نہیں ماما! ابھی نیند نہیں آئی اور آپ بھی جاگ رہی ہیں۔''

''میں تو تمہارے لیے جاگ رہی ہوں...... تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''آپ کو میرے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے اب خود بھی سوچنا آ گیا ہے۔'' وہ جرمن میں بولی۔ ماں بیٹیاں ہمیشہ جرمن میں ہی بات کرتی تھیں۔

''تمہیں کتنا بھی سوچنا آ جائے لیکن تم ایک ماں کو اپنے بارے میں سوچنے کے حق سے محروم نہیں رکھ سکتیں۔''

زویا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''تو کیا سوچا آپ نے؟''

''بہت اچھا لڑکا۔ اونچا لمبا، ہینڈسم، اصل جرمن نسل، معزز خاندان...... ہلڈ برانڈ فیملی سے تعلق ہے...... برسر روزگار ہے۔ اس سے اچھا رشتہ تمہیں نہیں ملنے والا۔ پچھلی دفعہ میں نے تمہیں اس کی تصویر بھی بھیجی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے دل کو لگی ہوگی۔''

''ماما! آپ سے پچاس بار کہا ہے، ابھی میں اس جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتی۔ مجھے تھوڑا سا وقت چاہیے اپنا کیریئر بنانے کے لیے۔''

''اور یہ جو تمہارا کیریئر ہے نا، یہ بھی مجھے کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا۔ نادان بچی! اگر جرنلزم میں ہی آنا تھا تو پھر کوئی مقامی اخبار یا چینل ہوتا، تم جا کر اٹیچ ہوگئی ہو اس بے کار پاکستانی چینل سے۔ تمہیں بے شمار مرتبہ بتا چکی ہوں، ان ایشیائی لوگوں میں کم ہی ہوتے ہیں جو بھروسے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ زیادہ دیر تک عافیت کے ساتھ چلا نہیں جا سکتا۔''

''اچھا ماما! اب بس بھی کریں، میں نے کون سا زندگی بھر کا معاہدہ کر لیا ہے۔ جب ٹھیک نہیں لگے گا چھوڑ دوں گی۔''

ذرا توقف کے بعد ماما کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''وہ جو لڑکا آیا تھا چینل والوں کی طرف سے...... چلا گیا یا یہیں پر ہے؟''

''چلا گیا ہے ماما! ہوٹل میں شفٹ ہو گیا ہے۔''

''چلو یہ تو اچھا ہوا۔ ان لوگوں کے ساتھ اتنا ہی تعلق رکھنا چاہیے جتنا بہت ضروری ہو۔ ویسے تم لوگوں نے کہا یا خود ہی چلا گیا ہوٹل میں؟''

زویا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''خود ہی چلا گیا ماما! اسے لگ رہا تھا کہ یہاں سب کی پرائیویسی متاثر ہو رہی ہے۔''

''اس سے کوئی رابطہ وغیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کو انگلی پکڑاؤ تو یہ پورا ہاتھ بلکہ بازو پکڑ لیتے ہیں۔ باہر سے کچھ ہوتے ہیں اندر سے کچھ۔ ویسے بھی جوان لڑکے لڑکی کا زیادہ دیر تک اکٹھے گھومنا پھرنا اور اکٹھے رہنا، کچھ اچھا نتیجہ نہیں نکالتا......'' زویا کو ماما کے لہجے میں ایک تیز کاٹ محسوس ہوئی۔ اس نفرت آمیز کاٹ اور رویے کی وجہ وہ بخوبی جانتی تھی۔ وہی ماما اور پاپا کا ناکام ازدواجی تعلق۔ وہ اس ناکام تعلق اور تلخ زندگی کے لیے کسی ایک کو قصوروار نہیں ٹھہراتی تھی۔ دونوں نے مل جل کر اس رشتے کو برباد کیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی اسے ماما کی باتوں میں پاپا کی باتوں سے زیادہ وزن محسوس ہوتا تھا۔ اب جس طرح کی صورت حال شامیر کے حوالے سے پیش آئی تھی، یہ بھی ماما کے خدشات اور خیالات کے عین مطابق ہی تھی۔ صرف چند دن کا ساتھ، پوری طرح جان پہچان بھی نہیں ہوئی تھی اور اس کے سامنے

کھٹاک سے شادی کی تجویز نہایت بھونڈے انداز میں رکھ دی گئی تھی۔

ماما سے فون پر بات ختم کرنے کے بعد وہ بستر پر نیم دراز ہوگئی۔ پتا نہیں کیوں ایک بار پھر شامیر کی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ جھنجلاہٹ کے عالم میں شامیر کے کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے اسے تقریباً دھکیل ہی دیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے گیا تھا اور سکتہ زدہ سا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ چہرے پر بجھی ہوئی راکھ اور آنکھوں میں بوکھلاہٹ آمیز حیرت دکھائی دیتی تھی۔

دس گیارہ دن پہلے جب شامیر فرینکفرٹ کے ائرپورٹ پر اترا تھا تو زویا کو دوسرے لوگوں سے کافی مختلف دکھائی دیا تھا۔ مہذب اور شائستہ...... پھر ایک دو روز میں ہی اس نے خود کو کافی معاملہ فہم اور ذہین بھی ثابت کر دیا تھا جگوار گاڑی کی چمکیلی سطح پر اس نے جس طرح شٹل کاک کے ڈیزائن والی عمارت کا شیڈ ڈھونڈا تھا وہ ایک ڈرامائی ٹچ رکھتا تھا...... اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ تحقیقاتی صحافت میں اگر اس کا کوئی نام ہے تو یونہی نہیں ہے۔ خشامہ تو دل و جان سے اس کی فین ہوگئی تھی مگر اس کے بعد ہوٹل کے کمرے میں جو باتیں ہوئیں، انہوں نے زویا کو نہ صرف بے حد مایوس کیا بلکہ شامیر ایک دم دل سے اتر گیا۔

☆☆☆

پرسوں شام جو کچھ ہوا تھا، اس نے شامیر کو پشیمانی اور پچھتاوے کے سمندر میں ڈبو دیا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کیسے وہ فقرہ بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو اور وہ چند سیکنڈ کے لیے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہو۔ دراصل پچھلے پانچ چھ دن میں جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ سب آناً فاناً اور غیر متوقع تھا۔ یہ سب کچھ پہلی نظر کی محبت تو نہیں تھی مگر پہلی نظر کی محبت جیسا ہی تھا۔ شامیر نے کامرس بینک کی چھت پر، تیز ہوا کی لہروں میں زویا کو اس انداز میں دیکھا تھا کہ وہ اپنا ہیئر کلپ دانتوں میں دبائے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے بال باندھ رہی تھی۔ چمکیلے سورج کی روشنی اس کے ایک پہلو کو روشن تر کر رہی تھی...... اور یہ منظر آنکھوں کے راستے سیدھا شامیر کے دل میں اترا تھا اور ایک ہی لمحے میں جیسے اس کی دنیا بدل گیا تھا۔ اس کے بعد اگلے پانچ چھ روز میں جو کچھ ہوا تھا، اسی کیفیت کے تحت ہوا تھا۔ یہ بات تو حقیقت تھی کہ وہ اپنے خیالات اور احساسات کے حوالے سے ایک صاف گو بندہ تھا۔ جو کچھ اس کے دل میں ہوتا تھا، کسی لگی لپٹی کے بغیر اپنی زبان پر لے آتا تھا۔ زویا کے سلسلے میں بھی یہی کچھ ہوا تھا...... اور شاید غلط ہوا تھا۔ شامیر نے اس بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچا تو اس میں اسے سراسر اپنی ہی غلطی محسوس ہوئی۔ زویا کی جگہ شاید کوئی بھی لڑکی ہوتی، اس جذباتی بلکہ ہیجانی طرز کے عمل کو برداشت نہ کرتی۔

اس کا دل چاہا کہ وہ اس سلسلے میں زویا سے رابطہ کرے اور اس سے معافی مانگے۔ اس کا ذریعہ فون ہی ہوسکتا تھا مگر شامیر کو پتا نہیں تھا کہ وہ اس کی کال ریسیو کرے گی یا نہیں اور اگر کرے گی تو اس کا لب و لہجہ کیا ہوگا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ غصے کے عالم میں اس کے کمرے سے نکلی تھی۔ اس کے علاوہ زویا سے رابطہ کرنے میں تھوڑا سا انا کا مسئلہ بھی پیش آ رہا تھا۔ بہر حال یہ کوئی ایسا دشوار مسئلہ نہیں تھا۔ محبت کی گہرائی میں سب سے پہلے انا ہی ڈوب کر مرتی ہے اور شامیر محسوس کرتا تھا کہ زویا کے حوالے سے اس کے دل میں جو کچھ بھی ہے، وہ خاصا گہرا ہے۔

آخر یہ سب کیوں ہوا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اسے اپنا وہ عہد توڑنے کی سزا ملی ہو جو اس نے خود سے کر رکھا تھا؟ اس کا خود سے عہد تھا کہ وہ اپنی شریکِ زندگی کا انتخاب اپنی امو خالہ پر چھوڑے گا لیکن...... پرسوں شام ہونے والا واقعہ اتنا آناً فاناً تھا کہ اس کا یہ عہد بھی اظہار کے تند و تیز ریلے میں تنکے کی طرح بہہ گیا۔ ایک طرح کے احساسِ جرم نے اسے گھیر لیا۔ اس کا دل چاہا کہ امو خالہ کو کال کرے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ امو خالہ کی کال آگئی۔ شاید اسی کو کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ امو نے اس کا حال احوال پوچھا اور پھر بڑی بے تابی سے ڈھیر ساری نصیحتیں اس کے پلے باندھ دیں۔

''کھانے پینے کا خاص خیال رکھو۔ پانی زیادہ پیو۔ تمہیں کبھی کبھی گردے کا درد ہو جاتا ہے۔ موسم وہاں اکثر اچانک خراب ہو جاتا ہے، چھتری لے کر نکلا کرو۔ ٹھنڈ ہو تو گرم کپڑوں کے بغیر نہ نکلو۔ غیر ضروری طور پر لوگوں سے ملنے جلنے کی ضرورت نہیں ہے...... سیر و تفریح میں بھی احتیاط ہونی چاہیے۔ رات کو دیر تک گھر سے باہر نہ رہو۔''

وہ شامیر کو یوں سمجھا رہی تھیں جیسے وہ اسکول کالج کا بچہ ہے۔ پھر انہوں نے زویا کے بارے میں پوچھا۔ ''تم نے اس سے میری بات نہیں کرائی؟''

''کیوں، کیا بات کریں گی؟''

''بھئی پیاری لڑکی ہے...... اور...... مجھے لگتا ہے کہ تھوڑی بہت تمہارے دل کو بھی لگی ہے۔ لگی ہے یا نہیں؟''

''آپ کی تھوڑی بہت والی بات تو صحیح ہے۔ مگر امو!

یہ یکطرفہ ٹریفک تو نہیں ہوتی۔ اسے بھی تھوڑا بہت اچھا لگوں تو پھر ہے نا۔"

"ہو ہائے، کیوں اچھے نہیں لگو گے تم اسے؟ لاکھوں میں ایک ہو...... آج کل چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملتے ایسے لڑکے۔ آج کل کے زیادہ بچوں کے تو قد کاٹھ ہی اتنے نہیں ہیں......اور یہ یورپین لڑکیاں ہوتی ہیں لمبی تڑنگی۔"

"امو! ساری لمبی تڑنگی نہیں ہوتیں۔ اب مارکیٹ میں درمیانے سائز کی بھی آ رہی ہیں اور آپ مجھے دیکھتی ہیں ایک ماں کی نظر سے۔ سب تو ایسی نظروں سے نہیں دیکھتے نا......"

وہ گہری سانس لے کر بولیں۔ "شامی! اگر تیرے دل میں کچھ ہے ناں، تو پھر میری بات کرا اس سے۔"

شامیر کے حافظے میں وہ منظر چمک گیا جب وہ اسے دھکیلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ بلند آواز میں ہنسا۔ "امو! آپ تو سیریس لینے لگی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ تو میں نے روا روی میں ایک بات آپ سے کہہ ڈالی تھی۔"

اسی دوران میں اس کی خالہ زاد فارہ بھی ویڈیو لنک پر آدھمکی۔ "شامی بھائی جان! کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ ہمیں کوئی بڑا سرپرائز دینے کے چکر میں ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ جب آپ واپس گھر تشریف لائیں تو آپ کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہو اور آپ می سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہیں...... امو! یہ ہے آپ کی بہو...... اس کے بعد آپ پانی لینے کے لیے کچن کی طرف دوڑ پڑیں......"

"پانی لینے کے لیے؟"

"ظاہر ہے بھائی جان! اس کے بعد می چکرا کر صوفے پر گریں گی اور آپ انہیں پانی وانی تو پلائیں گے۔"

امو خالہ نے فارہ کے سر پر ایک چپت لگائی۔ شامیر نے کہا۔ "لگتا ہے فارہ کہ اس بار تم نے مڈل کے امتحان میں ضرور شرمناک نمبر لینے ہیں۔ اتنی انڈین فلمیں...... اتنی انڈین فلمیں......"

☆☆☆

فرینکفرٹ میں زویا اکثر پبلک ٹرانسپورٹ ہی استعمال کرتی تھی تاہم اس کے پاس پرانے ماڈل کی ایک ٹوسیٹر کار بھی تھی۔ وہ اور خشامہ کبھی کبھار اس پر سواری کرتی تھیں۔ آج زویا اکیلی ہی نکلی ہوئی تھی۔ اس کا موڈ ابتر ہو رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ آج کل مسلسل ایک "سٹپٹاہٹ" سی محسوس کر رہی تھی۔ وہ بڑی کمپوزڈ شخصیت کی مالک تھی۔ اس طرح کا انتشار اس کی طبع میں کم ہی ہوتا تھا۔ آج شام اس کی فیملی کے ایک پرانے ملنے والے قادر جونا تھن اس کی طرف آ رہے تھے۔ وہ ان کی میزبانی کے لیے ہی کچھ اشیا خریدنے کے لیے نکلی تھی۔ ایک نوجوان سڑک کراس کرتا ہوا نظر آیا۔ پتا نہیں اسے عقب سے دیکھ کر زویا کو ایکدم کیوں ایسا لگا کہ وہ پاکستان سے آنے والا شامیر ہے مگر جب اس نے چہرہ ٹریفک سگنل کی طرف پھیرا تو وہ کوئی اور تھا۔ مگر تب تک زویا کو ایک یا دو سیکنڈ کی تاخیر ہو چکی تھی۔ ٹریفک سگنل زرد ہو چکا تھا۔ اس نے گاڑی روکنے کے لیے بریک پیڈل دبایا جو ضرورت سے زیادہ دب گیا۔ ایک اوڈی کار عقب سے اس کی ٹوسیٹر کے ساتھ ٹکرائی، کافی سخت تصادم تھا۔ زویا اپنی نشست پر اچھل کر رہ گئی۔ اسے اپنی گاڑی کی ٹیل لائٹس ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ یہ بارونق علاقہ نہیں تھا۔ شام کے بعد سڑک تقریباً خالی ہی نظر آ رہی تھی۔ وہ گاڑی سے اتری ہی تھی کہ ایک ہٹی کٹی سیاہ فام عورت تیزی کے ساتھ دوسری گاڑی سے نکلتی نظر آئی۔ اس نے گفتگو کا آغاز ہی گالی سے کیا اور زویا پر جھپٹ پڑی۔ اس نے زویا کو طمانچہ مارا، جواب میں زویا کو بھی طمانچہ رسید کرنا پڑا۔ اس سے پہلے کہ زویا سنبھلتی، دو مزید عورتیں گاڑی سے نکل آئیں۔ وہ بھی شکلوں اور ڈیل ڈول سے غنڈا صفت ہی دکھائی دیتی تھیں۔ ان میں سے ایک سفید فام اور دوسری نیگرو تھی۔ زویا نے پہلے والی فربہ اندام عورت کو گھما کر فٹ پاتھ پر پٹخ دیا۔ یہ منظر دیکھ کر دوسری سیاہ فام نے گاڑی میں سے لوہے کا جیک ہینڈل نکال لیا اور اپنی سفید فام ساتھی کے ساتھ زویا پر پل پڑی۔ "حرامزادی، چڑیل! گاڑی چلانا نہیں سکھائی تیری کسی...... والدہ نے تجھے۔" اس نے ایک جرمن گالی دے کر کہا تھا۔

اس سے پہلے کہ کوئی زویا کی مدد کو پہنچتا... انہوں نے اسے اچھی خاصی چوٹیں لگائیں۔ وہ چکرا کر گر پڑی۔ وہ اسے وہیں چھوڑ کر اور گاڑی میں بیٹھ کر اوجھل ہو گئیں۔ وہ بمشکل گھٹنوں پر زور دے کر اٹھی۔ اس کا بایاں بازو کلائی سے اوپر سن ہو رہا تھا۔ ہونٹوں سے رسنے والے خون نے منہ کا ذائقہ نمکین کر رکھا تھا۔ سڑک کے اس حصے پر کوئی کیمرا وغیرہ بھی نہیں تھا...... شاید اسی لیے اوڈی گاڑی والی غنڈیاں زیادہ مشتعل ہوئی تھیں۔

زویا نہیں چاہتی تھی کہ پولیس اس معاملے میں انوالو ہو جائے۔ دو چار راہ گیر وہاں رک گئے تھے۔ وہ ان کے سہارے جلدی سے اپنی ٹوسیٹر میں بیٹھی اور کراہتی ہوئی

وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اس کا بایاں بازو کہنی سے نیچے درد سے تڑخ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ بازو پر زیادہ چوٹ آئی ہے۔ کچھ آگے جا کر اس نے ٹوسیٹر پارکنگ ایریا میں کھڑی کی اور خشامہ کو فون کیا۔ ''ہیلو خشامہ! چھوٹا سا حادثہ ہوگیا ہے۔ مجھے چوٹ آئی ہے۔ لگتا ہے کہ اسپتال جانا پڑے گا۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لیے آسکتی ہو؟''

خشامہ کا آفس اس واقعے والی جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ فقط دس منٹ میں وہاں پہنچ گئی۔ اسپتال جانے کے بجائے انہوں نے ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس جانا بہتر سمجھا۔ اس لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ خشامہ کی جان پہچان بھی تھی۔ ملٹی پل ایکسریز اتارنے والی مشین نے مختلف زاویوں سے اس کی کلائی کے ایک درجن ایکسریز اتار ڈالے۔ اس کی کلائی کی بڑی ہڈی میں ہیئر لائن فریکچر تھا۔ یہاں پلاستر کی ضرورت تھی...... تاہم دیگر چوٹیں عام مرہم پٹی سے ٹریٹ ہوسکتی تھیں۔

☆☆☆

شامیر نے دو تین بار زویا کو فون کرنے کا ارادہ کیا مگر ہمت نہیں پڑی۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ کل وہ خود، زویا کے فلیٹ جا کر اس سے ملے گا اور اس سے اپنے رویے کے لیے پُرخلوص معذرت کرے گا۔

ابھی وہ اسی ادھیڑبن میں مصروف تھا کہ اس کے فون پر کال کے سگنل آئے۔ یہ لوکل کال تھی۔ دوسری طرف سے خشامہ کی آواز ابھری۔ وہ کسی شاپنگ سینٹر میں سے بول رہی تھی۔ ''گڈ ایوننگ مسٹر پاکستانی! کیسے ہو آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں...... اور تم؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں...... لیکن...... آپ کی وہ کولیگ ٹھیک نہیں ہے۔ شاید آپ کو ابھی تک خبر نہیں ملی۔''

''تت...... تم زویا کی بات کر رہی ہو؟...... کیا ہوا اسے؟'' شامیر نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''ہوا تو زیادہ کچھ نہیں۔ بس قتل ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ چھوٹا سا ایکسیڈنٹ تھا جس پر جھگڑا ہوگیا۔ مخالف پارٹی نے کوٹ ڈالا بے چاری کو۔ بازو ٹوٹ گیا ہے۔ چھوٹی بڑی اور چوٹیں بھی آئی ہیں۔ بستر سنبھال رکھا ہے محترمہ نے۔''

بیس منٹ کے اندر اندر شامیر بذریعہ ''سٹی ٹرین'' زویا کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ شکر تھا کہ خشامہ ابھی شاپنگ سے لوٹی نہیں تھی۔ زویا بستر پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اس نے فلیٹ کا آٹومیٹک دروازہ بٹن دبا کر کھولا تھا۔ اس کے بازو پر پلاستر تھا اور ماتھے پر بھی بینڈیج دکھائی دے رہی تھی۔ شامیر کے سلام کا جواب دینے کے بعد وہ پلکیں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اسے شامیر کا یہاں آنا بالکل اچھا نہیں لگا۔

چند رسمی کلمات کے فوراً بعد شامیر اصل موضوع پر آگیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اصل بات سے پہلے ہی خشامہ یہاں آن دھمکے۔ وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنی مزاج پرسی کے لیے میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا لیکن...... اگر آپ کو یہ چوٹیں وغیرہ نہ لگتیں تو بھی ایک بار...... کم از کم ایک بار تو مجھے آپ سے ملنا ہی تھا۔''

''کس سلسلے میں؟'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر انگلش میں بولی۔

''آپ سے معافی مانگنے کے سلسلے میں۔'' اس نے بڑے رسان سے کہا۔ ایک ہی لمحے میں وہ سرتاپا التجا نظر آنے لگا تھا۔

اس کے انداز نے زویا کو ٹھٹکا دیا۔ اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا پھر بمشکل بولی۔ ''مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں...... لیکن آپ سے ایک درخواست ہے کہ آپ دوبارہ مجھ سے نہ ملیں۔ جو کچھ بھی ہمارے درمیان ہوا، اس کو آپ یہیں پر ختم کردیں تو میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی۔''

شامیر نے کہا۔ ''لڑکے بہت جلدی لڑکیوں سے معافی مانگ لیتے ہیں کیونکہ ان کا مقصد رومانی معاملات کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ میری معافی کے پیچھے اس طرح کی کوئی نیت نہیں ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں دوبارہ آپ سے نہ ملوں تو ایسا ہی ہوگا لیکن ایک بات میں آپ سے ضرور کہنا چاہتا ہوں۔''

زویا نے سوالیہ نظروں سے شامیر کی طرف دیکھا۔

شامیر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''آپ کے حوالے سے جو کچھ میرے دل میں ہے، اسے آپ نہیں نکال سکتیں اور نہ اسے نکالنا میرے بس میں ہے۔ مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہنا۔''

شامیر کے معافی مانگنے کے بعد زویا کا تنا ہوا چہرہ کچھ نرم پڑ گیا تھا۔ وہ قدرے حیرت سے شامیر کی طرف دیکھنے لگی تھی جیسے اسے یقین نہ ہو کہ وہ اس طرح اپنے رویے پر معذرت خواہ ہوسکتا ہے۔

شامیر نے اس سے ایکسیڈنٹ کا احوال پوچھا۔ زویا مختصر الفاظ میں بتانے لگی کہ یہ واقعہ کس طرح اور کیوں پیش آیا...... لیکن وہ اسے یہ ہرگز نہ بتا سکی کہ اس واقعے کی اصل وجہ خود شامیر ہی بنا ہے، ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے

سڑک پار کرنے والے ایک بندے کو دیکھا اور اسے خوامخواہ شک ہوا کہ وہ شامیر ہے۔
اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے زویا کا نام پکارا۔ زویا نے بٹن دبا کر دروازہ کھولا۔ اندر آنے والے شخص کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ سفید بال، چمکتا ہوا چہرہ، اس نے سفید رنگ کا ایک لمبا سا چغہ اور سیاہ بوٹ پہن رکھے تھے......
اسے دیکھ کر زویا نے تعظیماً اٹھنے کی کوشش کی مگر آنے والے شخص نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ نو وارد سوالیہ نظروں سے شامیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔
زویا نے جیسے مجبوراً تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”فادر! یہ شومیر ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ پاکستان سے آئے ہیں۔ ان کا تعلق بھی ڈبل اے چینل سے ہے۔“
پھر وہ شامیر سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”یہ فادر جوناتھن ہیں۔ لیونا برگ قصبے کے ایک گرجے میں فرائض انجام دیتے ہیں۔ ہماری فیملی کے پرانے کرم فرماؤں میں سے ہیں۔“
فادر جوناتھن نے شامیر سے ہاتھ ملایا پھر دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ فادر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”اصل کرم فرما تو خدا کی ذات ہے۔ ہم میں تو بس اس ذات کا تھوڑا تھوڑا عکس ہوتا ہے۔ کسی میں کرم فرمائی کا عکس، کسی میں رحم دلی اور محبت کا عکس، کسی میں ذہانت کا عکس......“
وہ بات کرتے کرتے رک گئے پھر انہوں نے اپنی ہلکی نیلی، گہری آنکھوں کو شامیر کے چہرے پر جمایا اور بولے۔ ”خشامہ نے مجھے بتایا ہے...... تم نے آتے ساتھ ہی چینل والوں کا ایک بڑا مشکل مسئلہ حل کر ڈالا ہے۔ وہ تمہارے پیشے میں تمہاری سمجھ بوجھ کی بہت تعریف کر رہی تھی۔ زویا کا بھی یہی خیال ہے۔“
”تعریف کے لیے شکریہ...... ویسے میں اس قابل تو نہیں ہوں فادر! یونہی ایک نکتہ ہاتھ آ گیا تھا جس کی وجہ سے کام آگے بڑھ سکا۔“
فادر جوناتھن کی تیز نگاہیں بدستور شامیر کے سراپا پر دوڑ رہی تھیں۔ پھر شامیر نے محسوس کیا کہ وہ اس کے پاؤں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اچانک انہوں نے شامیر کی جرابوں کی طرف اشارہ کیا اور قدرے خفا لہجے میں بولے۔
”مسٹر شامیر! یہ کیا ہے؟“
شامیر نے دھیان سے اپنی براؤن جرابوں کی طرف دیکھا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن جب سفید بالوں اور بھاری پلکوں والے فادر نے دوبارہ انگلی سے اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی کراس کا نشان بنایا تو شامیر سمجھ گیا۔ جرابوں کی ایک سائڈ پر کچھ ایسا ڈیزائن تھا جس کے نچلے حصے کو صلیب سے مشابہ کہا جا سکتا تھا۔ یقیناً یہ صلیب نہیں بنائی گئی تھی مگر اسے باقی کے ڈیزائن سے جدا کر کے دیکھا جاتا تو صلیب دکھائی دیتی تھی۔
فادر جوناتھن کی بھاری آواز شامیر کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”یہ سب خدا کو ناراض کرنے والی باتیں ہیں۔ ایسی سرکشی، ایسی بے خوفی، بنانے والوں پر تو خدا کی لعنت ہونی ہی چاہیے، پہننے والوں کی بے احتیاطی بھی قابلِ سرزنش ہے۔“
”ویری سوری فادر! میرا دھیان اس طرف نہیں گیا۔ ویسے بھی یہ ڈیزائن......“
”پلیز چپ رہو۔“ فادر نے ذرا تیز لہجے میں شامیر کی بات کاٹی۔ ”گناہ کا عذر کئی دفعہ گناہ سے بھی برا ہوتا ہے...... تم مسلمان ہو۔ جس طرح تم اپنے مذہب کا احترام کرتے ہو اس طرح دوسروں کے مذہب کا بھی کرنا چاہیے۔ صلیب کے نشان کی توہین بے حد و بے شمار لوگوں کے لیے توہین اور تکلیف کا باعث بنتی ہے۔“
فادر جوناتھن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوشش کر کے خود پر ضبط کر رہے ہیں۔
شامیر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”فادر! اگر آپ کو برا لگا تو مجھے افسوس ہے مگر یہ جرابیں اور کچھ دیگر چیزیں میں نے یہیں فرینکفرٹ سے خریدی ہیں...... جیمز اینڈ جانسن اسٹور سے...... بہرحال میں انہیں اتار دیتا ہوں۔“
شامیر نے اسی وقت تسمے کھولے اور جرابیں اتار کر پینٹ کی جیب میں رکھ لیں...... یہ سن کر کہ شامیر نے یہ جرابیں یہیں سے خریدی ہیں، فادر جوناتھن کا غصہ کافی کم ہو گیا۔ رہی سہی کسر جرابوں کے اتر جانے سے پوری ہو گئی۔
اس کے بعد فادر نے نسبتاً نرم لہجے میں ایک لمبی چوڑی تقریر شامیر کے سامنے کر ڈالی۔ پند و نصائح سے بھری ہوئی یہ تقریر خالص مذہبی نوعیت کی تھی۔ اس کو کسی حد تک تبلیغی بھی کہا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے عقیدے اور مسلک کی خوبیاں بے تلے انداز میں بیان کر رہے تھے۔ شامیر بڑے صبر و تحمل سے ان کی باتیں سنتا رہا...... جواب تو اس کے پاس بھی کئی تھے مگر اس نے صرف وہ جوابات دھیمے انداز میں دیے جن سے نزاع کی کیفیت پیدا نہ ہو۔
آخر وہ بولا۔ ”فادر! آپ سے تو ایک تفصیلی نشست ہونی چاہیے۔“
اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتے دروازے پر

''ناک'' ہوئی اور پھر خشامہ چھپاک سے اندر آگئی۔ اس کا خیال یہی تھا کہ کمرے میں صرف زویا اور شامیر ہوں گے۔ وہ بڑا بولڈ قسم کا ڈریس پہنے ہوئے تھی۔ یہ نیلا ڈریس ''میکسی'' کی طرز کا تھا...... تاہم کندھے اور گردن سے نیچے کا جسم ڈھانپنے سے تقریباً قاصر تھا۔ بازو بھی عریاں تھے۔ اس نے پاؤں میں نیلے ہی رنگ کی اونچی ایڑی والی سینڈل پہن رکھی تھی۔

فادر جوناتھن کو وہاں دیکھ کر وہ دفعتاً ٹھٹکی۔ ''سوری۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

وہ پلٹ کر باہر نکلنے لگی تو اس کا بھانڈا مزید پھوٹا۔ وہ ''بیک لیس'' لباس پہنے ہوئے تھی یعنی کمر دو تہائی سے زیادہ عریاں۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی سی باہر نکل گئی۔

فادر جوناتھن نے برا سا منہ بنایا اور کچھ بڑبڑائے۔ زویا بھی ذرا خجل نظر آئی۔

فادر، زویا سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''یہی بے راہ روی ہے جو ہمیں تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ عورت کے لیے مرد اور مرد کے لیے عورت کا حصول اتنا آسان ہوتا جا رہا ہے کہ اب اس تعلق میں فطری دلچسپی ہی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اب اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے ہمارا بے راہ رو معاشرہ اور بے ڈھنگے طریقے ڈھونڈ رہا ہے۔''

انہوں نے ذرا توقف کیا پھر زویا کو مخاطب کر کے ذرا پست لہجے میں بولے۔ ''اس کو سمجھاؤ بیٹی! مجھے اس کے طور طریقے اچھے نہیں لگتے۔ اگر سمجھانے سے بھی نہیں سنبھلتی تو پھر بے شک اس اسے اپنی رہائش علیحدہ کر لو۔ صحبت کا اثر کسی نہ کسی طور پر انسان پر ضرور پڑتا ہے۔''

اسی دوران میں خشامہ واپس آگئی۔ اس نے غالباً کسی پڑوسی سے ایک براؤن شال لے کر اپنے کندھوں اور کمر پر ڈالی لی تھی۔

خشامہ، شامیر اور فادر میں چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا۔ اس کے بعد شامیر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے جانے کی اجازت چاہی۔ فادر کے تاثرات دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ اب خشامہ کی ''کلاس'' لگنے والی ہے۔ اس کا جانا ہی مناسب تھا۔ اس نے تینوں سے اجازت چاہی۔ فادر جوناتھن نے کہا۔ ''شامیر! ابھی میں دو روز یہیں فرینکفرٹ میں ہوں۔ شاید کل دوپہر بھی یہاں زویا کی طرف آنا ہوگا۔ ہو سکے تو آجانا۔''

شامیر صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس نے زویا سے وعدہ کیا تھا کہ اسے مزید ڈسٹرب نہیں کرے گا اور وہ واقعی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ عجیب دھند سی بھری ہوئی تھی اس کے سینے میں۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اس کا جی چاہا کہ ایک بار مڑ کر زویا کے تاثرات دیکھے مگر پھر اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا اور سیدھا نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

بازو کی چوٹ کی وجہ سے زویا کو آفس سے دو ہفتے کی چھٹی مل گئی تھی۔ اس کی گاڑی کو خشامہ مرمت کے لیے ورکشاپ چھوڑ آئی تھی۔ زویا زیادہ وقت فلیٹ میں ہی گزار رہی تھی۔ وہ عجیب کیفیت سے دوچار تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اسے خود اپنی ہی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ شامیر کا خیال اکثر اس کے دماغ سے چمٹ جاتا تھا اور چھوڑنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ وہ منظر بار بار زویا کی نگاہوں میں گھومتا تھا جب زویا نے غصے میں اسے دھکیلا تھا اور اس کے چہرے پر راکھ بکھر کر رہ گئی تھی۔ شاید اس کی طرف سے کچھ زیادتی ہی ہوگئی تھی۔ اس پاکستانی ہم کار کے ساتھ۔ ایک دوبار اس کا دل چاہا کہ شامیر سے فون پر رابطہ کرے مگر پھر اس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اس خیال کو بری طرح لتاڑ دیا۔ جس راہ پر چلنا ہی نہیں تھا، اس کے بارے میں سوچنے یا اس کے قریب سے گزرنے سے کیا مطلب؟ یہ خیال لڑکپن سے ہی اس کے ذہن میں راسخ ہو چکا تھا کہ وہ کسی ایشیائی مرد بالخصوص انڈین یا پاکستانی سے شادی نہیں کرے گی۔ شادی کرنا تو دور کی بات اسے عمومی زندگی میں بھی ان لوگوں سے ملنا جلنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر اس شخص کے حوالے سے پتا نہیں کیا تبدیلی آئی تھی، وہ اس کو دماغ سے نکال ہی نہیں پا رہی تھی۔ اسے خود پر طیش آنے لگا۔ فادر جوناتھن واپس جا چکے تھے ورنہ وہ سکونِ قلب کے لیے ان ہی سے کوئی نسخہ دریافت کرتی۔ پھر اس کا دل چاہا چند روز کے لیے میونخ میں ماما کے پاس چلی جائے لیکن پتا نہیں کیوں ماما کے موجودہ شوہر سے وہ عجیب سی ہچکچاہٹ اور گریز کی کیفیت محسوس کرتی تھی۔

اس نے بستر پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کیں اور خاموشی کی زبان میں اپنے آپ سے ایک سوال کیا۔ ''پچھلے دو تین دنوں میں ایسا کیا ہوا ہے کہ تم اس شخص کے بارے میں اتنی ہمدردی سے سوچنے لگی ہو؟''

اس کا جواب بہ زبانِ خاموشی اس کے اندر سے ہی آیا۔ ''اس کا جواب بڑا اہم ہے اور وہ جواب یہ ہے کہ تم اس شخص کو اپنے پاپا سے بہت مختلف پا رہی ہو۔ یہ شخص تمہیں اپنے پاپا کے بالکل برعکس لگ رہا ہے۔ تم نے بچپن سے لے کر جوانی تک کبھی اپنے پاپا کو ماما سے معافی مانگتے یا

معذرت کرتے نہیں دیکھا ہوگا۔ شاید تم تینوں بہنیں اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھیں کہ پاپا اپنی کسی زیادتی پر شرمندہ ہوں گے یا ندامت کا اظہار کریں گے......''

اس نے خود ہی سوال کیا۔ ''لیکن کیا اتنی سی بات پر کسی شخص کے بارے میں اپنی منفی رائے کو تبدیل کیا جاسکتا ہے؟''

اس کے اندر سے جواب آیا۔ ''بات صرف یہی نہیں ہے۔ تم کئی پہلوؤں سے اس شخص کو انڈین اور پاکستانی لوگوں سے مختلف دیکھ رہی ہو۔ اس کے طور اطوار، اس کی بول چال، اس کے خیالات۔ تم شاید جان بوجھ کر نظرانداز کررہی ہو مگر فادر جوناتھن والے واقعے نے تمہیں بہت متاثر کیا ہے۔ تم کتنا ڈر گئی تھیں جب فادر نے مذہبی تقریر شروع کی تھی مگر اس شخص نے فادر کی باتیں کتنے تحمل اور کتنی برداشت کے ساتھ سنیں۔ کیا یہ سب کچھ غیر اہم تھا؟ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، کیا یہ سب کچھ غیر اہم تھا؟''

ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنی پلاستر شدہ زخمی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے تھاما اور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑکی سے نیچے اس ذیلی سڑک پر اکادکا گاڑیاں رواں تھیں مگر شور نہیں تھا، کسی انجن کا، نہ ہارن وغیرہ کا۔ وہ بظاہر سڑک کو دیکھ رہی تھی مگر دراصل ماضی میں جھانک رہی تھی۔

اپنے بچپن میں ماما پاپا کا جو پہلا شدید جھگڑا زویا کے ذہن پر نقش ہوا تھا، اس کا تعلق فادر جوناتھن سے ہی تھا۔ فادر کی عمر اس وقت بھی پچاس پچپن کے قریب تھی۔ ماما کی فیملی کیتھولک تھی اور فادر جوناتھن سے بہت عقیدت رکھتی تھی۔ جب ماما نے اسلام قبول کرکے پاپا سے شادی کی تو فادر کو بہت رنج ہوا تھا تاہم دوسروں کی طرح انہیں بھی اس فیصلے کو قبول کرنا پڑا تھا۔ ایک روز زویا اپنی منجھلی بہن حولیہ کے ساتھ اسکول سے واپس آئی تو اس نے فادر جوناتھن کو کامن روم میں پاپا اور ماما کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ فادر کا سفید لباس اور ان کا روشن، آسودہ چہرہ فوراً دیکھنے والے کو متوجہ کرتا تھا۔ وہ تینوں چائے پی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے مگر پاپا کا چہرہ دیکھتے ہی بہنیں سمجھ گئی تھیں کہ وہ سخت غصے میں ہیں اور فی الحال خود پر ضبط کیے ہوئے ہیں۔ جونہی فادر چائے پی کر رخصت ہوئے، پاپا طیش کے عالم میں ماما پر پھٹ پڑے تھے۔ ''وہ کیوں گڈ فرائیڈے کا ذکر لے کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے ہزار بار کہا ہے، اگر وہ ملنے کے لیے آتا ہے تو صرف ملنے کے لیے آئے۔ مذہبی باتیں شروع نہ کرے اور اسے کیا ضرورت ہے بار بار یہاں آنے کی۔''

ماما نے کہا تھا۔ ''راشد! وہ کہاں آتے ہیں بار بار۔ کوئی چھ مہینے پہلے نومبر میں ان کا چکر لگا تھا...... اور اگر فرائیڈے والی بات انہوں نے کردی تو کون سا ایسا گناہ کردیا۔ ہم بھی تو ان کے سامنے اپنے تہواروں کا ذکر کرہی رہے تھے۔''

''ہم عام انداز میں بات کر رہے تھے، اس نے جان بوجھ کر اور تبلیغی انداز میں بات کی۔ اسے کیا حق پہنچتا ہے ہمارے گھر میں آکر ہمیں اور ہمارے بچوں کو گمراہ کرنے کا۔ اور تم بھی کس طرح مریدنیوں کی طرح اس کی بات پر ہاں...... ہاں کرتی چلی جارہی تھیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے اپنے رویے پر۔''

''پلیز راشد! خوامخواہ بات کو مت بڑھاؤ۔ بس تمہیں بہانہ چاہیے ہوتا ہے لڑنے کا۔ غصہ کسی اور بات کا ہوتا ہے اور گھر آکر نکال ہم پر دیتے ہو۔''

''تم پر اس لیے نکلتا ہے کہ تم آگے سے زبان چلاتی ہو۔ بک بک کرتی ہو۔'' پاپا دہاڑ کر بولے تھے۔

''میں بک بک کرتی ہوں اور تمہارے منہ سے تو پھول جھڑتے ہیں...... شہد کے قطرے ٹپکتے ہیں۔'' ماما بھی چلائی تھیں۔

''بند کرو بکواس۔'' پاپا کی آواز سے گھر کے در و دیوار لرزے اور انہوں نے ماما کو زور سے دھکا دیتے ہوئے گالیوں کی بوچھاڑ کردی۔ ماما صوفے پر گریں اور ان کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ وہ رونے لگیں۔ پاپا طیش میں کھولتے اور بولتے ہوئے باہر نکل گئے۔ دونوں بہنیں ماما کو سنبھالنے میں لگ گئیں مگر اسی رات اس سے بڑا جھگڑا ہوگیا تھا۔ اسکول کا کام ختم کرکے زویا کچھ دیر ٹی وی دیکھتی رہی تھی پھر اسے اونگھ آنے لگی۔ دونوں بڑی بہنیں پہلے ہی سو چکی تھیں۔ دفعتاً ماما پاپا کے بند بیڈروم میں سے ماما کی چلاتی ہوئی آواز ابھری۔ ''مجھے ہاتھ مت لگائیں...... پیچھے ہٹیں مجھ سے...... پیچھے ہٹیں۔''

اس کے چند ہی سیکنڈ بعد ایک ڈیکوریشن پیس ٹوٹنے کی زوردار آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی پاپا کی دہاڑ سنائی دی۔ جواب میں ماما بھی دہاڑی تھیں پھر یہ دہاڑیں بڑھتی چلی گئیں۔ مختلف چیزوں کے ٹوٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ماما بھی طیش میں بے حد سخت بول رہی تھیں۔ دونوں بڑی بہنیں بھی جاگ گئیں اور ڈری سہمی سی بیڈروم کے بند دروازے کو دیکھنے لگیں۔ پھر دروازہ ایک دھماکے سے کھلا تھا اور پاپا اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتے اور گرجتے برستے باہر نکل گئے تھے۔ ماما بھی اندر چلا رہی تھیں اور بول رہی تھیں۔

زویا نے ایک جھرجھری سی لے کر اپنے سر کو دائیں بائیں ہلایا اور ماضی کے اس منظر سے نکل کر واپس حال میں آ گئی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک بار پھر شامیر کا چہرہ گھومنے لگا۔ پرسوں وہ کس طرح ایک پُروقار خاموشی کے ساتھ فادر جون (جوناتھن) کے سامنے بیٹھا تھا اور ان کی کچھ ناپسندیدہ باتیں سننے کے ساتھ ساتھ مدلل انداز میں ان سے سوال بھی پوچھ رہا تھا۔ اس کے دل ودماغ میں ایک کشادگی اور معاملہ فہمی تھی جو قلب ونظر کو متاثر کرتی تھی۔

اگلے تقریباً دو روز بھی زویا نے اپنے ہی خیالات سے لڑتے ہوئے گزار دیے۔ شامیر کے ساتھ زندگی بھر کا ناتا جوڑنے کا تصور تو دور دور تک اس کے ذہن میں نہیں تھا، مگر اس سے معمول کے تعلقات دوستی کی حد تک تو بحال کیے جاسکتے تھے۔ جرمنی میں اس کے یہ چند روز اس کی وجہ سے ناخوشگوار نہیں رہنے چاہیے تھے۔ خشامہ کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ شامیر کے یوں اچانک ہوٹل میں شفٹ ہونے کی وجہ سے متعجب تھی۔ اسے اصل بات کا پتا نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ تینوں کہیں اکٹھے گھومنے پھرنے نکلیں۔

یہی باتیں سوچتے سوچتے زویا سوگئی۔ رات دوسرے پہر وہ درد کی ایک ٹیس کی وجہ سے جاگی تھی۔ وہ بہت احتیاط کرتی تھی پھر بھی نیند میں کروٹ بدلتے ہوئے زخمی بازو کسی وقت کہیں ٹکرا جاتا تھا۔ وہ ہاتھ کو سہلانے کے بعد کروٹ بدل کر سونے کا ارادہ ہی کررہی تھی کہ ایک بہت مدھم آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ خشامہ کی آواز تھی اور اس اسٹور روم نما چھوٹے سے کمرے سے ابھر رہی تھی جسے وہ لوگ ڈریس وغیرہ بدلنے کے لیے استعمال کرتے تھے......

تجسس سے مجبور ہو کر زویا نے بیڈ چھوڑا اور لکڑی کے فرش پر بے آواز چلتی اسٹور روم کے دروازے کے عین سامنے پہنچی۔ خشامہ کے ہنسنے کی آواز آرہی تھی۔ زویا نے جھک کر کی ہول سے آنکھ لگائی۔ خشامہ کا ایک پہلو نظر آنے لگا۔ اس نے وہی بے ہودہ لباس پہن رکھا تھا جو چار پانچ روز پہلے شامیر کی یہاں آمد پر پہنا تھا۔ اس دن تو فادر جون کو سامنے دیکھ کر وہ بوکھلاہٹ میں باہر نکل گئی تھی مگر آج بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھی تھی۔ اپنے براؤن بال ایک شانے پر بکھیر رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں اسمارٹ فون تھا......اور وہ کسی سے باتیں کررہی تھی۔

آواز بہت دھیمی تھی مگر پھر بھی زویا کے کانوں تک پہنچی۔ ''میں تو اس سے بہت کہتی ہوں کہ وہ بھی چلے...... لیکن شاید وہ ابھی اپنی چوٹ کو کچھ آرام دینا چاہتی ہے۔ چلیں میں تو ہوں۔ کچھ بھی نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہوتا ہے۔'' وہ ذرا اٹھلا کر بولی اور اپنے بالوں کو ہلکا سا ہلکورا دیا تاکہ پورا شانہ ہی ان کے نیچے چھپ کر نہ رہ جائے۔

دوسری طرف سے فون پر کچھ کہا گیا جو زویا کے کانوں تک نہیں پہنچا۔

خشامہ نے منہ سے ''چچ'' کی آواز نکالی اور ذرا مایوس لہجے میں بولی۔ ''شامیر! کیسی بات کرتے ہو۔ بندۂ خدا اگر یہاں آکر کمرے میں ہی بند ہو کر بیٹھنا ہے تو پھر یہ کام پاکستان میں بھی بہ آسانی ہوسکتا ہے۔ اتنا خرچہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

وہ فون کے کیمرے کے سامنے اپنے تنتے ہوئے جسم کو یوں حرکت دے رہی تھی جیسے کسی فوٹو سیشن میں حصہ لے رہی ہو۔ اس کی گفتگو کا انداز بھی معنی خیز اور اکسانے والا تھا۔ تاہم یہ بھی عیاں تھا کہ دوسری جانب سے اسے حوصلہ بخش جواب نہیں مل رہا...... کچھ دیر بعد اس نے کل دوبارہ فون کرنے کا کہہ کر گفتگو ختم کردی۔

اس کے باہر نکلنے سے پہلے ہی زویا جلدی سے آکر بستر پر لیٹ گئی اور کروٹ بدل لی۔ وہ دیر تک جاگتی رہی اور سوچتی رہی۔ اسے پہلے سے ہی خشامہ کے رویے پر شبہ تھا۔ ابھی جو کچھ اس نے دیکھا تھا اس سے تصدیق بھی ہوئی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود زویا نے ایک بار پھر شامیر کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔ اپنے انڈین والد کے حوالے سے اس کے ذہن میں جو بھی تصورات موجود تھے، شامیر ان سے یکسر مختلف ثابت ہورہا تھا۔ اس کی پاپا کی کہی ہوئی یہ بات بھی کچھ ایسی درست نہیں لگ رہی تھی کہ یہ ایشیائی مرد پرلے درجے کے دل پھینک ہوتے ہیں۔

چہرہ...... چہرے پر بکھری ہوئی راکھ......لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹنا اور پھر لاچاری سے زویا کی طرف دیکھنا...... یہ سب کچھ ایک بار پھر زویا کے پردۂ خیال پر ابھر آیا۔ اگلے روز دوپہر کے بعد وہ شامیر کو فون کررہی تھی۔

پہلے تین چار سیکنڈز کے اندر ہی شامیر نے کال ریسیو کرلی۔ ''ہیلو۔'' اس کی آواز میں بے تابی تھی۔

''میں زویا بول رہی ہوں۔'' اس نے انگلش میں کہا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ آپ نے فون کیا ہے۔ بڑی خوشی ہورہی ہے آپ کی آواز سن کر۔''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''مجھے لگا...... کہ مجھے آپ کو فون کرنا چاہیے۔ اس دن...... ہوٹل میں جو واقعہ ہوا اس پر مجھے بھی افسوس ہے۔''

''پلیز...... وہ بات اب ختم ہوگئی۔ اسے نہ چھیڑیں۔'' شامیر نے اپنایت سے کہا۔

وہ تقریباً پندرہ منٹ تک گفتگو کرتے رہے۔ اس گفتگو میں زویا نے شامیر کو باور کرادیا کہ وہ اس کے حوالے سے رومانی انداز میں سوچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ ویسے بھی اس کے رشتے کی بات چل رہی ہے اور عنقریب پایۂ تکمیل کو پہنچنے والی ہے۔ ہاں، وہ اس کی شخصیت سے متاثر ہوئی ہے اور وہ دونوں اچھے دوستوں کی طرح کچھ وقت گزار سکتے ہیں۔ فرینکفرٹ میں گھوم پھر سکتے ہیں۔

☆☆☆

وہ شامیر کے لیے ایک نہایت پُرمسرت دن تھا۔ وہ آج زویا کے ساتھ فرینکفرٹ میں گھومنے پھرنے کے لیے نکل رہا تھا۔ اس نے صبح نو بجے کے قریب آنا تھا۔ وہ آٹھ بجے ہی تیار ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا...... فرینکفرٹ خوبصورت دکھائی دینے لگا تھا۔

زویا وقتِ مقررہ پر پہنچ گئی۔ اس نے اپنا پلاسٹر والا بازو گلے میں لٹکا رکھا تھا مگر ویسے وہ چاق وچوبند اور خوشگوار موڈ میں تھی۔ براؤن شرٹ کے نیچے سفید پتلون کے ساتھ سفید جوگرز اچھے لگ رہے تھے۔ انہوں نے ''سٹی ٹرین'' پر بیٹھ کر فرینکفرٹ کا ایک چکر کاٹا اور پھر ایٹمی بجلی گھر کا نظارہ کرتے ہوئے، پون چکیوں کے خوبصورت سلسلے کی طرف نکل گئے۔ زویا نے بتایا کہ یہاں کے شہروں اور خاص طور سے قصبوں میں پون چکیوں سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ بہت عام ہوچکا ہے۔ اس نے کہا۔ ''پاپا نے بھی جب پینتیس چالیس سال پہلے جرمنی میں قدم رکھا تو انہوں نے پون چکیاں اور پن چکیاں بنانے والی ایک فیکٹری میں ہی ملازمت کی۔ تاہم بعد میں انہوں نے ان چکیوں کے پرزہ جات کی فروخت کا کام ایک ترک باشندے کے ساتھ مل کر شروع کردیا اور اس میں کامیاب ہوئے۔''

زویا بڑے خوشگوار بلکہ چنچل موڈ میں آگئی تھی۔ اپنے پلاسترشدہ بازو کی پروا کیے بغیر وہ شامیر کے ساتھ تیزی سے مختلف ''ٹرینوں'' پر اتر چڑھ رہی تھی۔ شامیر اسے بار بار احتیاط کرنے کا کہہ رہا تھا۔ وہ ایک لگژری بس کے ذریعے اسے شہر کے بارونق مرکز میں لے آئی۔ پختہ فرش والے ایک بہت وسیع میدان کے اندر بہت سے سنگی مجسمے استادہ تھے۔ یہ جرمنی کے ان مشاہیر کے مجسمے تھے جو نجانے کب کے اپنی اپنی قبروں میں اتر چکے تھے۔ زویا نے ایک بلند وبالا مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک نامور قائد ہیں۔ انہوں نے جرمنی کے لیے بہت سی قربانیاں دیں۔ ان پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔''

شامیر نے دیکھا ایک جنگلی کبوتر مجسمے کے کندھے پر بیٹھ کر اسے اپنی بیٹ سے داغدار کررہا تھا۔ شامیر نے اس کبوتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''زویا! مجھے لگتا ہے کہ یہ نابنجار پرندہ جرمنی کی تاریخ سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہے۔''

زویا اس بات پر ہنسی تو اس کے گال کا گڑھا نمایاں ہوگیا، بولی۔ ''میری بڑی بہن ایمہ جب یہاں آئی تھی تو اس نے بھی اس سے ملتی جلتی بات ہی کہی تھی۔ یہ کبوتر یہاں ہر وقت گل کاریاں کرتے رہتے ہیں۔''

شامیر نے کہا۔ ''تم نے بہن کا ذکر کیا ہے تو اس بارے میں تجسس پیدا ہورہا ہے۔ وہ دونوں کہاں ہیں؟''

''اپنے اپنے گھروں میں۔'' زویا نے رسان سے کہا۔

''ان کی شادیاں ہوچکی ہیں۔ مختلف شہروں میں رہتی ہیں۔''

''ظاہر ہے کہ آپ کی طرح وہ بھی مسلمان ہی ہوں گی۔ اس کا مطلب ہے کہ شوہر بھی......''

''نہیں نہیں۔'' زویا نے شامیر کی بات کاٹی۔ ''شوہر مسلمان نہیں ہیں اور وہ دونوں خود بھی کچھ نہیں ہیں۔ نہ مسلمان...... نہ عیسائی۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ مذہب سے ویسے ہی دور ہوچکی ہیں شومیر! یعنی وہ کسی بھی مذہب کو...نہیں مانتیں۔'' وہ تاسف سے بولی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جرمنی میں بلکہ یورپ میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کسی مذہب کو نہیں مانتے۔ انہیں Atheist کہا جاتا ہے۔''

''ہاں زویا! یہ تو مجھے بھی پتا ہے لیکن جب تمہارے ماما پاپا مسلمان ہیں، تم مسلمان ہو تو وہ دونوں......''

''ان دونوں کے مذہب سے باغی ہونے کی وجہ ماما پاپا کا رویہ ہی تو ہے شومیر! انہوں نے بچپن سے جوانی تک جو کچھ دیکھا اس نے ان پر اثر کیا۔ رہی سہی کسر ماما کی حوصلہ افزائیوں نے پوری کی۔ انہوں نے طے کررکھا تھا کہ وہ اپنے بچوں کی شادیاں اپنی مرضی سے کریں گی اور اس سلسلے میں پاپا کی نہیں چلنے دیں گی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ پاپا اپنے خاندان میں سے کسی انڈین کو میری کسی بہن کا دُلہا بنادیں۔ اس کے لیے انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو کرسکتی تھیں اور میرا خیال ہے کہ......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئی اور سامنے استادہ مجسموں کو گھورنے لگی۔

"آپ نے اپنا فقرہ مکمل نہیں کیا زویا؟"
وہ پتھریلے بینچ پر پہلو بدل کر بولی۔ "ویسے دیکھا جائے شومیر، تو ماما نے بیٹیوں کی شادیوں کے بارے میں تو ٹھیک فیصلے ہی کیے۔ دونوں کے شوہر جرمن ہیں۔ برسرروزگار ہیں اور وہ دونوں اپنے اپنے گھروں میں خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔"
"آپ کی...... شادی بھی...... آپ کی والدہ ہی کریں گی؟" شامیر نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں...... وہ لڑکا تقریباً دیکھ چکی ہیں۔ شاید کچھ دنوں تک اس کے ساتھ یہاں فرینکفرٹ بھی آئیں۔ میں نے بس ایک ہی شرط رکھی ہے۔ اس کو مسلمان ہونا پڑے گا اور سوچ سمجھ کر ہونا پڑے گا۔"
"کیسا ہے وہ؟ کوئی تصویر وغیرہ ہے؟" شامیر نے پوچھا۔
وہ کچھ دیر تک ہچکچاتی رہی پھر اس نے اپنے موبائل فون میں موجود تصویر شامیر کو دکھا دی۔ وہ ہلکی نیلگوں آنکھوں والا دبلا پتلا ہینڈسم جرمن تھا مگر نقوش سے تھوڑی سی سختی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ زویا نے بتایا کہ اس کا نام رابرٹ لوئیس ہے۔
پتا نہیں کیوں شامیر کا دل بجھ سا گیا تھا۔ تاہم وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے تاثرات سے کچھ ظاہر نہ ہو۔ دل دیا بھی تو کہاں دیا...... اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ زویا اٹھ کھڑی ہوئی۔ "شومیر! اس جگہ کو Roma Platz کہتے ہیں۔ چلیں آپ کو یہاں کی پری سے ملواؤں! اس کے ساتھ تصویریں بنوائیں گے۔"
"پری کے ساتھ تصویریں؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔ حالانکہ وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ کیا یہاں اور بھی کوئی پری موجود ہے۔
وہ چنچل انداز میں اس کے ساتھ چل دی اور قریب ہی ایک مقام پر لے آئی۔ زویا کے مطابق اس جگہ کو "ولی برانڈ پلاٹز" کہا جاتا تھا۔ پری والا سین کچھ آگے جا کر دکھائی دینا تھا۔ پھولوں سے گھری ہوئی ایک جگہ زویا کو رکنے کے لیے پسند آئی۔ اس نے ایک چبوترے کی صاف ستھری سیڑھیوں پر بیٹھنے کے لیے جگہ منتخب کی اور بڑے پرشوق انداز میں شامیر کو اپنے موبائل فون میں موجود اپنی فیملی کی تصاویر دکھانے لگی۔ اتفاقاً ان تصاویر میں اس کے پاپا کی کوئی واضح تصویر موجود نہیں تھی۔ ایک گروپ فوٹو میں وہ نظر آئے مگر دور سے۔ درمیانی عمر، چھریرے بدن اور مناسب نقوش کے لگتے تھے۔ والدہ فربہ اندام تھیں، بھی خوش شکل بھی رہی ہوں گی۔ ہاں بہنیں تینوں پیاری تھیں...... اور زویا، ان تینوں میں سب سے زیادہ نفیس اور اسمارٹ تھی۔
ایک تصویر میں تینوں بہنیں دھینگا مشتی کرتی نظر آئیں۔ دونوں بڑی بہنوں نے پندرہ سولہ سالہ زویا کو دبوچ رکھا تھا۔ زویا نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر رکھے تھے۔ انہوں نے کوئی فرنی جیسی چیز زویا کے چہرے پر مل دی تھی۔ زویا ہنسنے لگی۔ اس نے شامیر کو تصویر کا پس منظر بتاتے ہوئے کہا۔ "دراصل میں بچپن سے ہی کسی کی جھوٹی چیز نہیں کھاتی تھی۔ بڑی بہنیں اسے میرا نخرہ کہتی تھیں اور چڑتی تھیں۔ ایک دن بڑی بہن ایمہ نے زبردستی مجھے اپنی کھائی ہوئی آئس کریم کھلانے کی کوشش کی...... اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوگئی۔ یہ اسی موقع کی تصویر ہے۔"
ایک تصویر میں تینوں بہنیں ایک دوسری کے گلے میں بانہیں ڈالے ایک بینچ پر بیٹھی نظر آئیں۔ وہ ایک دوسرے کی آغوش میں بیٹھی تھیں۔ ان کے عقب میں رہائشی مکانوں کی پھولوں سے لدی ہوئی بالکونیاں نظر آتی تھیں۔ شامیر نے دیکھا تھا کہ جرمنی میں گھروں کی بالکونیوں کو پھولوں سے خوب خوب آراستہ کیا جاتا تھا۔ رہائشی مکانوں کے پس منظر میں کچھ بلند عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں اور ان میں شٹل کاک سے مشابہ وہ لینڈ مارک اسٹائل کی عمارت بھی تھی جس نے یہاں ڈبل اے چینل والوں کا ایک اہم مسئلہ بذریعہ شامیر حل کیا تھا۔ زویا نے بھی تصویر میں عمارت کو دیکھا اور بولی۔ "ہم جب بھی اس عمارت کو دیکھیں گے آپ یاد آجائیں گے۔ واقعی آپ کی کھوج لگانے کی حس بہت زبردست ہے۔ کیا پتا کس وقت مجھے بھی آپ کی ضرورت پڑ جائے۔"
"کیا مطلب؟"
"کسی دوسرے شہر میں گھومنے پھرنے میں اکثر گم ہوجاتی ہوں۔ کیا پتا کہ ایسا ہوجائے اور میرے گھر والے مجھے ڈھونڈنے کے لیے آپ کو بلالیں۔"
"چیز جتنی اہم اور قیمتی ہوتی ہے اسے ڈھونڈنے کی فیس بھی اتنی ہی ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو بھاری فیس لوں گا۔"
وہ بلند آواز میں ہنس دی۔ شامیر بھی مسکرا دیا۔ ان کے سروں پر "چیری" کی شاخوں سے بہت اوپر، گہرا نیلا آسمان اپنی بھیدوں بھری خاموشی کے ساتھ انہیں دیکھ رہا تھا۔
کچھ دیر وہاں بیٹھ کر وہ آگے چل دیے۔ تفریحی پارک کے ایک حصے میں کچھ افراد نے ڈیوکس اور کاؤنٹس وغیرہ کے بہروپ بھر رکھے تھے۔ کچھ افراد قدیم جنگجوؤں

کے لباس میں نظر آتے تھے۔ ایک خوبرو لڑکی نے پری کا روپ دھار رکھا تھا۔ دوسروں کی طرح زویا اور شامیر نے بھی اس کے ساتھ تصویر بنوائی۔ اس نے ان دونوں کو گرل اور بوائے فرینڈ سمجھ کر مقدر کا چھوٹا سا موتی دیا اور معاوضے میں انہوں نے پری کے سامنے رکھے ہوئے ڈبے میں چند سکے ڈال کر اپنے اچھے ''آدم زاد'' ہونے کا ثبوت دیا......

وہ آگے بڑھے۔ زویا نے کہا۔ ''آپ بات کریں، چپ چپ کیوں ہوگئے ہیں؟''

شامیر نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ ''چپ چپ اس لیے ہوگیا ہوں کہ آپ مسلسل انگلش پر مہربانی فرما رہی ہیں۔ آپ کی اس مہربانی سے آپ کا وہ ظلم زیادہ اچھا لگتا ہے جو آپ اردو پر ڈھاتی ہیں۔ میں تو وہی گلابی اردو سننے کے لیے آپ کے ساتھ آیا ہوں۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''آپ کہتا تو ہام اسی طرح بولتا۔ اب بتائیں کدھر جانا ہے؟''

شامیر اردو میں بولا۔ ''یہاں کے چڑیا گھر کی بہت تعریف سنی ہے۔ سنا ہے وہاں ایک قدیم بندر بھی موجود ہے، ہٹلر کے دادا جان کے زمانے کا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''خیر اتنا زیادہ اولڈ تو نا ہیں مگر ستر اسّی سال کا تو ہوئیں گا۔ ویسے وہاں دیکھنے کو اور بھی بہت کچھ ملیں گا۔''

وہ دونوں ایک بار پھر سٹی ٹرین پر سوار ہوئے اور شہر کے ''زو'' میں پہنچ گئے۔ یہاں کی تفریح بھی اچھی رہی۔ شامیر نے پہلی بار بنگلا ٹائیگر اور افریقن شیر جیسے درندوں کو آہنی پنجرے کے بجائے مضبوط شیشوں کے عقب میں دیکھا اور ان کی تصویریں بنائیں۔ آبی جانوروں والا شعبہ بے مثال تھا۔ یہاں ایک کیبن میں چھوٹے مگرمچھوں کو بالکل قدرتی ماحول فراہم کیا گیا تھا۔ ان پر مصنوعی بارش برس رہی تھی، بادل گرج رہے تھے اور بجلی چمک رہی تھی۔

ایک پنجرے میں برفانی ریچھ کا ایک جوڑا افزائش نسل کے لیے اپنی فطری تگ و دو میں مصروف تھا۔ سفید فام لڑکیوں کے ایک چنچل گروپ نے اس منظر کو دیکھ کر ''ہوہا'' کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔ شامیر نے دیکھا زویا کے چہرے پر شرم کی سرخی سی لہرا گئی۔ وہ اس آزاد معاشرے میں پلنے بڑھنے کے باوجود یہاں کی نئی نسل سے قدرے مختلف تھی۔ پردے یا نماز روزے کی پابندی تو شامیر نے اس میں بھی نہیں دیکھی تھی مگر وہ حرام حلال کا خیال رکھتی تھی اور اخلاقیات کی پاسداری بھی اس میں نظر آتی تھی۔

اگلے دو تین روز شامیر اور زویا نے شہر کی سیر و سیاحت میں گزارے۔ خشامہ صرف ایک مرتبہ دو تین گھنٹوں کے لیے ان کے ساتھ رہی پھر پتا چلا کہ اس کے آفس میں کوئی ''ریلیز'' ہے اور اسے اوور ٹائم لگانا پڑ رہا ہے۔ شامیر کے لیے یہ صورت حال، اس کی مرضی کے عین مطابق تھی۔ وہ اس تفریح میں خشامہ کا ساتھ کم سے کم چاہتا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ وہ ایک فلرٹ لڑکی ہے بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر ان یورپین لڑکیوں میں سے ہے جو مرد و زن کے میل جول میں کسی حد کو اپنے لیے حد نہیں سمجھتیں۔

ایک روز شہر کے جنوبی حصے میں گھومتے گھومتے وہ دونوں تھک سے گئے اور ایک پارک میں لکڑی کی ایک بینچ پر جا بیٹھے۔ بے شک یہ سیر و سیاحت شروع کرنے سے پہلے زویا نے ایک حد مقرر کر دی تھی اور اسے دوستی کا نام دیا تھا...... مگر شامیر صاف محسوس کرتا تھا کہ اس کی طرح زویا کے اندر بھی ایک شدید قسم کی اتھل پتھل موجود ہے۔ ایک شدید قسم کی کشمکش...... ایک جسم و جاں کو پگھلا دینے والی، گھول دینے والی آتشیں الجھن۔ یہ کیا تھا؟ شامیر کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا...... اور شاید زویا کی سمجھ میں بھی نہیں آتا ہوگا۔

انڈین لباس والی ایک ادھیڑ عمر عورت سر پر ایک پٹاری سی رکھے ان کے پاس پہنچی۔ وہ پان چبا رہی تھی اور ساڑی کے پلو سے ہونٹ بھی پونچھ رہی تھی۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر زویا کے چہرے پر بیزاری سی نظر آئی۔ شاید اس بیزاری کی وجہ وہی کہنہ گریز تھا جو وہ برصغیر کے باشندوں سے رکھتی تھی۔ عورت نے پاس آ کر شامیر کو مخاطب کیا۔ ''بھگوان تم دونوں کا پریم برقرار رکھے۔ اپنی دوست کے ہاتھوں پر مہندی لگواؤ گے؟''

شامیر نے کہا۔ ''موسی! دیکھتی نہیں ہو بے چاری کے ہاتھ پر پلاستر چڑھا ہوا ہے۔''

''پر دوسرا تو ٹھیک ہے۔ اس پر لگوا لو...... اور بڑی شاندار چوڑیاں بھی ہیں میرے پاس۔ اصل لکھنؤ کی۔ پردیس میں دیس کی یاد تازہ ہو جائے گی۔''

زویا منع کرتی رہ گئی لیکن شامیر نے بھی چوڑی فروش کی حمایت کی۔ اس نے نہ صرف زویا کو ست رنگی چوڑیاں پہنائیں بلکہ اس کی ایک ہتھیلی پر ''کون مہندی'' کے ذریعے دلکش نقش و نگار بھی بنا دیے۔

وہ تو معاوضہ لے کر رخصت ہوگئی اور وہ دونوں مشرقی رسم و رواج کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کو بے تکلفی سے ''تم'' کہہ کر مخاطب کرنے لگے

تھے۔ ''بھوک لگ رہی ہے زویا۔'' شامیر نے کہا۔
''تھوڑا تھوڑا مجھ کو بھی۔'' زویا نے کہا۔
سامنے ہی ایک اسٹال پر چکن برگرز موجود تھے۔ یہ کسی ترکش کا اسٹال تھا۔ شامیر دو برگرز اور ڈرنک وغیرہ لے آیا لیکن جب کھانے کا وقت آیا تو زویا ''بے دست و پا'' نظر آئی۔ اس کا ایک ہاتھ پلاسٹر میں تھا اور دوسرے پر مہندی لگی ہوئی تھی۔ اس نے مہندی اتارنا چاہی تو شامیر نے اسے منع کر دیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں اپنا برگر اور دوسرے میں زویا والا پکڑ لیا۔ وہ اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے لگا۔ وہ پہلے تو شرمائی پھر چھوٹے چھوٹے لقمے لینے لگی۔
شامیر کا دل چاہا کہ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو مگر برگر آخر برگر تھا، ختم ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں بڑے بے تکلف دوستانہ موڈ میں تھے۔ زویا کے منع کرنے کے باوجود شامیر نے کوک بھی اسے اپنے ہاتھ سے پلائی۔ وہ پی رہی تھی اور اس صورتِ حال پر ہنس بھی رہی تھی۔ بولی۔ ''بچپن یاد آ گیا۔ جب پاپا اس طرح کھلایا کرتے تھے۔''
''تو کیا میں تمہیں پاپا کی طرح لگ رہا ہوں؟''
''نو نو...... تم اپنی طرح ہی لگتے ہو اور یہی اچھا ہے۔''
بے دھیانی میں شامیر نے اس کوک میں سے بھی دو تین گھونٹ بھر لیے جو وہ زویا کو پلا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کسی کا جھوٹا نہیں کھاتی پیتی۔ ''اوہ سوری! میں تمہارے لیے اور لاتا ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔
''میں نے بس اتنا ہی پینا تھا۔'' زویا نے اسے اٹھنے سے روک دیا۔
شامیر دوبارہ بیٹھ گیا۔ وہ اپنا برگر اور کولڈ ڈرنک ختم کر چکا تھا۔ زویا کا تھوڑا سا برگر باقی تھا جو شامیر نے اسی طرح اسے اپنے ہاتھ سے کھلایا۔
وہ کچھ چپ سا ہو گیا تھا۔ اپنے طور پر اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے بے خیالی میں زویا کو امتحان میں ڈال دیا۔ اب جھوٹی کوک اس کے سامنے پتھر کی میز پر پڑی تھی اور وہ کہہ رہی تھی کہ اسے اور پینا ہی نہیں تھی۔
شاید زویا نے بھی اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ شامیر ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھ رہا تھا جب اس نے دل دھڑکا دینے والا منظر دیکھا۔ زویا نے ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی اور پھر خود کو تھوڑا سا جھکا کر اسی کوک کے اسٹرا سے منہ لگا لیا تھا جو جھوٹی ہو چکی تھی۔
شامیر کے لیے یہ بڑا دل آویز اشارہ تھا۔ زویا نے چند گھونٹ لے کر کوک ایک طرف رکھ دی۔ مسکراتی نظروں سے شامیر کو دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ شامیر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میز پر پڑی بوتل میں اب بھی ایک گھونٹ کوک باقی تھی۔ شامیر نے اس کا اسٹرا نکالا، اس پر کیپ چڑھائی اور اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔
''اوہو، تو تم اس کو کیوں سنبھالتا؟'' زویا نے چونک کر پوچھا۔
''میری مرضی۔'' شامیر نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔
دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ دریائے مائنز کی طرف سے آنے والی ہوا کے جھونکے نے ان کے چہروں کو چھوا...... اور پرنیلا آسمان مسکرایا۔ شاخ پر بیٹھی ایک خوش رنگ چڑیا نے پُرمسرت آواز نکالی اور جیسے اعلان کیا کہ ایک نئی کہانی کا آغاز ہو چکا ہے۔

☆☆☆

وہ سٹی ٹرین نمبر **21** کا آخری اسٹیشن تھا۔ یہ شہر کا مضافاتی علاقہ تھا۔ یہاں ریلوے سے وابستہ کچھ عجائبات رکھے تھے اور اردگرد جنگل کا سا سماں تھا۔ ایک قدیم انجن سے کچھ فاصلے پر وہ دونوں خوبانی کے ایک درخت تلے بیٹھے تھے۔ سامنے ایک طویل کیاری میں سرخ اور پیلے ٹیولپ کے بہت سے پھول کھلے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا مگر یوں لگ رہا تھا کہ شام ہو گئی ہے۔ موسم کی ادا دیکھتے ہوئے، زویا گھر سے چھتری لے کر نکلی تھی اور اب یہ چھتری واقعی کام آ رہی تھی۔ بارش شروع ہو گئی تھی اور وہ کچھ دیگر جوڑوں کی طرح اپنی چھتری کے نیچے سمٹے ہوئے تھے۔ جوں جوں بارش بڑھ رہی تھی وہ مزید سمٹ رہے تھے۔ سرد موسم کی دلکشی اور ایک دوسرے کے نیم گرم لمس نے انہیں دل گداز کیفیت سے دوچار کر دیا تھا۔ زویا جب سنجیدہ ہوتی تھی تو انگلش میں بات کرتی تھی۔ اب بھی وہ انگلش بول رہی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی آواز میں کہنے لگی۔ ''شومیر! یہ بڑا مشکل راستہ ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ مم...... میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔''
''کیا نہیں سوچا تھا؟'' اس نے بھی انگلش میں پوچھا۔
''یہی کہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔
''یہی کہ تم کسی غیر جرمن کی محبت کا جواب محبت سے دو گی۔'' شامیر نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔
''شاید تم ٹھیک کہتے ہو شومیر! جو کچھ بھی والد اور والدہ کے درمیان ہوا، اس نے ہم تینوں بہنوں کے ذہنوں کو بری طرح متاثر کیا۔ خاص طور سے میں نے تو اپنے طور پر تہیہ کر رکھا تھا کہ بھول کر بھی اس راستے پر قدم نہیں رکھوں گی۔''

''یہی تو محبت کی خوبصورتی ہے زویا...... یہ مشکل ترین راستے چنتی ہے۔'' اس نے زویا کو ہولے سے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''کیا تم نے بھی اپنے لیے مشکل راستہ چنا ہے؟'' زویا نے پوچھا۔

''مشکل تو نہیں مگر حیران کن ضرور کہہ سکتی ہو۔ میرا بھی تہیہ تھا کہ میں پیار محبت کے چکر میں نہیں پڑوں گا...... کبھی نہیں پڑوں گا۔ جب بھی شادی کا وقت آئے گا تو میں اپنی زندگی کے اس باب کو اپنی امو خالہ کے لیے کھلا چھوڑ دوں گا مگر دیکھو...... امو خالہ ہزاروں میل دور بیٹھی ہیں۔ انہیں کچھ پتا نہیں کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں کس تیز دھارے میں بہہ گیا ہوں۔ فرینکفرٹ کی اس لڑکی نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا لہجہ ذرا شریر ہو گیا۔

زویا نے زور سے شامیر کے بازو پر چٹکی کاٹی۔

''فرینکفرٹ کی اس لڑکی نے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کیا ہے تم نے کیا ہے...... خود امتحان میں پڑے ہو اور اسے بھی ایک بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔''

''شاید تم اپنی ماما کی بات کر رہی ہو؟''

''شومیر! ہمیں اب بھی سوچ لینا چاہیے...... وہ کبھی نہیں مانیں گی۔ وہ تو دو چار ماہ میں میری شادی کا سوچ رہی ہیں۔''

''اب واپسی ممکن نہیں زویا۔ کم از کم میرے لیے تو ممکن نہیں۔'' اس نے زویا کے نم بالوں کو چوما۔

وہ اپنے آپ میں جیسے کچھ اور سمٹ گئی۔ ''یہ سب کیا ہے شومیر! ہمیں تو صرف دوستی کی حد تک رہنا تھا۔'' وہ جیسے ٹھنک کر بولی تھی۔

شامیر نے سامنے کیاری میں بھیگتے ہوئے ''ٹیولپ'' کے خوشنما پھولوں کو دیکھا اور کہا۔ ''شاید ہم نے اپنے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔'' اس نے دوبارہ زویا کے بالوں کو چوما۔

زویا کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی نظر آ گئی۔ شامیر نے اپنے شولڈر بیگ سے وہی کل والی بچی ہوئی ایک گھونٹ کوک نکالی اور اسے ہونٹوں سے لگا کر خالی کر دیا۔

''تم بہت عجیب ہو شومیر۔'' وہ کچھ شرما سی گئی۔

''تم نے عجیب کر دیا ہے۔'' وہ ترت بولا۔

اس مرتبہ اس کے بازو پر زویا کی چٹکی زیادہ سخت تھی۔

اگلے روز ہوٹل کے کمرے میں شامیر ویڈیو لنک کے ذریعے پاکستان میں اپنی امو خالہ سے بات کر رہا تھا۔ زویا بھی ساتھ تھی۔ زویا نے امو خالہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''خالہ! آپ کا بیٹا مجھ کو بہت زیادہ تنگ کرتا۔ ہر ٹائم ستاتا۔''

''کیا کہتا ہے؟'' خالہ ثمینہ نے پیار سے پوچھا۔

''پہلے مجھ کو فورس کرتا کہ میں اُردو بولوں۔ پھر میری اُرڈو کا مذاق چلاتا۔''

''چلاتا نہیں اُڑاتا۔'' شامیر نے تصحیح کی۔

خالہ نے کہا۔ ''شامیر! یہ کیا بات ہوئی۔ میری تو چلو مجبوری ہے کہ میں انگریزی نہیں سمجھتی لیکن تمہارے ساتھ تو یہ انگریزی میں بات کر سکتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے خالہ! مگر میں تھوڑی سی ہوشیاری دکھاتا ہوں۔ زویا انگلش میں بولے تو ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے بولتی ہے۔ اردو میں رفتار بیس پچیس میل فی گھنٹا رہ جاتی ہے۔ یوں مجھے بھی بات کرنے کا تھوڑا بہت موقع مل جاتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''خالہ! یہ مرڈ (مرد) لوگ ہام لیڈیز کو یونہی بڈنام بناتا۔ بولنے میں یہ بھی کچھ کم ناہیں۔ جب یہ آپس میں ہوتا تو بہت زیادہ بولتا اور صرف زیادہ ہی نہیں گندا بھی بولتا۔''

شامیر نے کہا۔ ''سوری زویا! مجھے لگتا ہے کہ تم ''اپنی'' فیملی کے مردوں کی بات کر رہی ہو۔''

زویا نے شامیر کو مکا دکھایا۔

امو خالہ نے کہا۔ ''شامی! مجھے اپنی بیٹی سے بات کرنے دو۔ چلو تم تھوڑی دیر کے لیے دائیں بائیں ہو جاؤ...... چلو شاباش۔''

خالہ نے اصرار کیا تو شامیر سر کھجاتا ہوا کمرے سے نکلا اور لابی کی طرف چلا گیا۔ زویا اور خالہ ثمینہ بات کرتی رہیں پھر شامیر کی کزن فارہ بھی اس گفتگو میں شریک ہو گئی۔

زویا کے ہوٹل سے واپس جانے کے بعد شامیر نے دوبارہ ویڈیو لنک پر امو خالہ سے رابطہ کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی رائے جاننا چاہی۔ ''کتنے نمبر امو؟'' اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

وہ ہنسیں۔ ''ابھی تو ایک پیپر ہوا ہے۔ دو چار بار بات ہو گی تو پھر ٹوٹل نمبروں کا پتا چلے گا۔''

''چلیں...... اس پیپر کا رزلٹ تو بتائیں۔''

''اتنا اچھا نہیں۔'' وہ بولیں۔ شامیر ایک دم چپ ہو گیا۔ وہ زور سے ہنس کر کہنے لگیں۔ ''مذاق کر رہی ہوں۔ بڑی اچھی، بڑی پیاری لڑکی ہے...... جی چاہتا ہے کہ خود وہاں آ جاؤں۔ اس سے اچھی طرح ملوں۔''

''تو پھر آ جائیں نا...... بلکہ فارہ کو بھی لے آئیں۔ میں ویزے کے لیے کوشش کرتا ہوں۔''

''تم ہوش میں تو ہو۔ تین چار لاکھ کا خرچہ ہے۔ یہی تین چار لاکھ تمہاری شادی پر نہ لگاؤں گی۔'' اتنے میں فارہ بھی آگئی اور اسے چھیڑنا شروع ہوگئی۔

اگلے چھ سات روز شامیر کے لیے یادگار رہے۔ موسم بھی بہت خوشگوار تھا۔ وہ دونوں فرینکفرٹ اور اس کے گردونواح میں گھومتے رہے...... ایک بس یا ٹرین میں بیٹھتے اور اس کے آخری اسٹاپ پر پہنچ جاتے، پھر کوئی دوسری بس یا ٹرین پکڑتے اور شہر کے کسی اور حصے کی طرف چل نکلتے۔ ایک بے پناہ کشش تھی جو ہر لحظہ انہیں ایک دوسرے کی طرف کھینچتی تھی۔ رات کو جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے تو یوں لگتا کہ درمیان میں برسوں کا فاصلہ ہے۔ رات کو ایک دوبار زویا کی کال آجاتی اور دو تین بار شامیر اس کا نمبر پریس کر دیتا۔ زویا کی روم میٹ خشامہ سے اب کوئی پردہ نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ وہ اس کھیل سے نکل چکی ہے اور یہ کھیل تو تھا بھی نہیں...... یہ تو سمندر کی طرح گہرا، پہاڑوں کی طرح بلند اور طوفانوں کی طرح سرکش ایک انوکھا جذبہ تھا جو برق رفتاری سے انہیں اپنے حصار میں لیتا جارہا تھا۔ اس تعلق میں بے پناہ شدت ہونے کے باوجود یہ بے لگام نہیں تھا۔ اس میں پھولوں کی نزاکت اور شبنم کی سی شفافیت تھی۔ ایک ایسی قربت جو نگاہوں کے ملاپ اور ہاتھوں کے لمس سے شاید ہی کبھی آگے بڑھی ہو۔

شامیر کے اصرار پر زویا اپنی والدہ سارہ کو شامیر کے بارے میں بتا چکی تھی۔ شروع میں تو وہ بہت سیخ پا ہوئی تھیں اور فون پر ہی زویا کو ان کے دو تین آتشیں لیکچر سننا پڑے تھے۔ تاہم اب وہ کسی حد تک دھیمی پڑی ہوئی تھیں۔ ایک روز دریائے مائنز کے بڑے پل پر دوپہر کے وقت زویا اور شامیر کی ملاقات طے تھی۔ وہ پل پر کھڑا نیچے سے گزرتی ہوئی تفریحی کشتیوں اور لانچوں وغیرہ کو دیکھ رہا تھا، جب عقب سے کسی نے آہستگی کے ساتھ اسے بانہوں میں جکڑ لیا۔ وہ کچھ بولا نہیں لیکن اس کا تعارف کرانے کے لیے اس کی خوشبو اور اس کا دل گداز لمس ہی کافی تھا۔ یہ زویا تھی۔ وہی جو طوفان کی طرح اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اور اس کے دل و دماغ اور اس کی ساری حسیات پر پوری طرح قابض ہوچکی تھی۔

وہ اسی طرح اسے عقب سے بانہوں میں لیے کھڑی رہی۔ اس کے نرم رخسار کا لمس شامیر اپنی کمر پر شانوں کے درمیان محسوس کر رہا تھا۔ ''آئی لو یو شومیر۔'' زویا نے اسی طرح اسے بانہوں میں جکڑے ہوئے کہا۔

''یہ تو بہت پرانی بات ہوچکی زویا...... کچھ نیا کہو۔''

''شومیر! مجھ کو بہت زیادہ ڈر لگتا۔''

''کیوں؟''

زویا نے اسے کچھ اور اپنے ساتھ بھینچا۔ ''ماما یہاں فرینکفرٹ آتا۔ وہ توم سے میٹنگ کرنا مانگتا...... کبھی کبھی وہ ایک دم بہت اینگری وومن بن جاتا۔ غصے میں کچھ بھی بول ڈیتا۔ توم کو 'تحمل' سے کام لینا ہوئیں گا۔''

''تحمل؟ یہ کون ہے؟'' پھر جیسے ایک دم شامیر کی سمجھ میں آگیا۔ ''شاید تم تحمل کہنا چاہ رہی ہو؟''

''ہاں ہاں، وہی۔'' اس نے کہا اور بازوؤں کی گرفت شامیر کے گرد ڈھیلی کردی۔

شامیر نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے اپنے

بادشاہ کی فراخدلی

1751ء کا ذکر ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کردیا، پنجاب کے حاکم معین الملک نے شاہ کو وہ خراج ادا نہیں کیا تھا جو 1750ء کے معاہدے کی رو سے طے پایا تھا۔ ابدالی لشکر نے مختصر لڑائی کے بعد لاہور فتح کرلیا اور چار مہینے قابض رہنے کے بعد اس نے لاہور خالی کرنے کا فیصلہ کیا اور معین الملک کو صلح کی شرطیں طے کرنے کے لیے طلب کیا۔ معین الملک، شاہ کے سامنے حاضر ہوا تو احمد شاہ ابدالی نے پوچھا۔ ''اگر تم مجھے قید کرلیتے تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟''

معین الملک نے جواب دیا۔ ''میں آپ کا سر کاٹ کر شہنشاہ کو دلی بھیج دیتا۔''

اس پر شاہ نے کہا۔ ''اب میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟''

نڈر اور دلیر معین الملک نے جواب دیا۔ ''اگر آپ دکاندار ہیں تو تاوان کی غرض سے مجھے بیچ دیں۔ اگر آپ قصائی ہیں تو مجھے قتل کردیں اور اگر آپ بادشاہ ہیں تو مجھے معاف کردیں۔'' احمد شاہ ابدالی اس جواب پر بہت خوش ہوا۔ اس نے نہ صرف معین الملک کو معاف کردیا بلکہ اسے اپنی دستار پہنا کر اسے دوبارہ لاہور کا حاکم بنادیا۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

ساتھ لگایا اور پہلی بار اس کے رخسار کو بوسہ دیا۔ اس نے اپنا سر شامیر کے چوڑے سینے سے ٹکا دیا۔ آدھی آستینوں والی ہلکی گلابی شرٹ میں وہ بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ کریم کلر پتلون کے نیچے سفید جوگرز اسے کسی ٹین ایجر جیسی لُک دے رہے تھے۔ شامیر اسی طرح اسے اپنے ساتھ لگائے لگائے پل سے نیچے اتر آیا۔ دونوں مہکتے پھولوں کے درمیان لکڑی کی ایک سبز بینچ پر جا بیٹھے۔

''شومیر! میں نے اپنی سسٹرز سے بھی بات کیا۔ وہ بھی خوش ناہیں۔ وہ بھی ماما کی حمایت میں ہی بولتا۔''

''اور پاپا؟''

''پاپا سے تو رابطہ ہی ناہیں ہوتا۔ وہ اپنی وائف کے ساتھ سنگاپور کے ٹور پر گیا۔ اگر رابطہ ہو بھی جائیں گا تو کیا فائدہ ہوئیں گا۔ وہ تو اپنے حال میں مست ہے۔''

شامیر نے زویا کا شانہ سہلایا۔ ''جان! پریشان نہ ہو۔ مجھے امید ہے کہ میں تمہاری ماما کو فیس کرلوں گا۔ ہاں، ماما سے بات چیت کے حوالے سے تم مجھے کچھ ٹپس دینا چاہو تو اور بات ہے۔''

''میں کیا ٹپس دوں شومیر! کچھ سمجھ میں ناہیں آتا۔ دماغ تو بالکل...... بالکل...... کنجر ہوکر رہ گیا ہے۔'' اس نے منہ بسورا۔

''کنجر ہوکر رہ گیا ہے؟ کیا مطلب؟'' شامیر نے بے حد حیران ہوکر پوچھا۔

وہ اسی طرح سٹپٹائی ہوئی بیٹھی تھی۔ چند سیکنڈ بعد شامیر کے منہ سے بے ساختہ ہنسی کا فوارہ سا پھوٹ پڑا۔ وہ ہنستے ہنستے دہرا ہوگیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ زویا حیرت آمیز سادگی کے ساتھ اسے دیکھتی جارہی تھی۔ آخر بولی۔

''کیا ہوا شومیر! واٹ از رانگ؟ میں نے کیا کہہ دیا؟''

وہ خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''بس جو کہہ دیا اسے دوبارہ نہیں کہنا اور کسی دوسرے کے سامنے تو بالکل بھی نہیں کہنا۔ دماغ کنجر نہیں ہوتا، دماغ بنجر ہوتا ہے۔''

''ہاں...... ہاں...... ہام یہی کہنا مانگتا تھا۔''

شامیر دوبارہ ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے وہ بینچ پر ہی لیٹ گیا۔ جب وہ لیٹا تو اس کا سر زویا کے زانو پر آگیا۔ زویا نے اسے ہٹانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ خوشگوار چمکیلی دھوپ نے لالے اور ڈیزی کے پھولوں کی مہک کو دوچند کرکے ہوا کے جھونکوں میں فراوانی سے تقسیم کردیا تھا۔ اردگرد بہت سے لوگ موجود تھے لیکن کسی نے خصوصی طور پر زویا اور شامیر کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہاں اور بھی کئی جوڑے موجود تھے اور کہیں زیادہ ''رومانیت'' کا شکار تھے۔ ان کی طرف بھی کوئی نہیں دیکھتا تھا۔

''امو خالہ کا کیا فیلنگو ہے میرے بارے میں؟'' زویا نے پوچھا۔

''زبردست...... بس وہ ایک ہی بات کہتی ہیں۔ زویا کو جلد از جلد پاکستان لاؤ۔ میں اس کی پکائی ہوئی گلابی بریانی اور گلابی کوفتے کھانا چاہتی ہوں۔''

''گلابی کوفتے؟'' زویا نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں بھئی۔ جس طرح تم گلابی اردو بولتی ہو اس طرح پاکستانی کھانے بھی تو گلابی ہی پکاؤ گی نا۔''

''تو امو چاہتا کہ میں تمہارے ساتھ پاکستان آجائے؟'' وہ اس کے مزاح کو نظرانداز کرکے بولی۔

''اس طرح نہیں بھئی، دلہن بن کر۔ اپنے ایک ہاتھ پر نہیں بلکہ دونوں پر مہندی لگوا کر۔ پوری طرح سج دھج کر۔''

اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیلی تاہم اس کے ساتھ ساتھ ہلکا سا تفکر بھی تھا۔

☆☆☆

زویا کی والدہ سارہ جیم کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ جوانی میں وہ خوبصورت رہی ہوں گی تاہم اب جسم بھدا ہوچکا تھا۔ انہوں نے اپنی عمر کو فیشن اور لباس کے ذریعے چھپانے کی کوشش کر رکھی تھی اور اس میں کسی حد تک کامیاب نظر آتی تھیں۔ بوائے کٹ بال سرخ رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اسکرٹ کی آدھی آستینوں میں سے فربہ بازو نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ گلے میں چھوٹی سی چین تھی اور چہرے کے نقوش سے پتا چلتا تھا کہ وہ گاہے بگاہے سخت طیش میں بھی آتی ہیں۔

وہ جب فرینکفرٹ زویا اور خشامہ کے فلیٹ پر پہنچیں تو زویا ابھی آفس سے نہیں لوٹی تھی۔ خشامہ واپس آچکی تھی اور موقع غنیمت جان کر زویا کی والدہ سے گفتگو میں مصروف تھی۔ اس نے کہا۔ ''آنٹی! میں ایک بار پھر کہتی ہوں۔ غصہ دکھانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ معاملہ کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ وہ مانے گی نہیں۔ اب اگر آپ اسے روکنا ہی چاہتی ہیں تو پھر برداشت اور تدبیر سے کام لینا ہوگا اور اس سے بہتر تدبیر کوئی نہیں جو میں نے آپ کو بتائی ہے۔''

''لیکن اگر وہ یہ بات بھی مان گیا تو؟'' سارہ جیم

نے اپنی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔
''مجھے نوّے فیصد یقین ہے کہ وہ نہیں مانے گا۔ وہ اپنی اس خالہ سے بہت پیار کرتا ہے۔ ماں کا درجہ دیتا ہے اور وہ یہی چاہتی ہے کہ اس کا بھانجا اس کے پاس پاکستان میں رہے۔ وہ اسے دور کرنے کا سوچ بھی کیسے سکتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کے گھر کا کفیل بھی یہی شامیر ہے۔ سنا ہے کہ تھوڑی بہت زمین بھی ہے جہاں سے اناج آتا ہے لیکن صرف اناج سے تو گھر نہیں چلتے نا۔''
سارہ جیم کے میک اپ زدہ چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ وہ بولیں۔ ''لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جب یہ بات بڑھے تو وہ عورت بھانجے کے ساتھ ہی یہاں شفٹ ہونے کا سوچ لے۔''
''ایسا کچھ نہیں ہوگا سویٹ آنٹی! میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ وہاں گھر کے علاوہ ان کی کچھ زمین بھی ہے۔ وہ اسے کیسے چھوڑیں گے۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ اس عورت کی تیرہ چودہ سالہ بیٹی بھی ہے۔ یہ بدیسی لوگ جوان ہوتی بیٹیوں کے ساتھ ہمارے ملکوں میں رہنے کا سوچتے بھی نہیں بلکہ جو یہاں موجود ہوتے ہیں وہ بھی بیٹیوں کے ذرا بڑا ہونے پر یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ تب یہی ممالک جوان کے لیے جنت کا نمونہ ہوتے ہیں، خطرناک قرار پاجاتے ہیں۔'' خشامہ کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔
سارہ جیم کی گدلی آنکھوں میں کدورت کے آثار نمودار ہوئے۔ اسی دوران میں نیچے سیڑھیوں کی طرف سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔
خشامہ نے جلدی سے رسٹ واچ دیکھی اور بولی۔
''آنٹی! میرا خیال ہے کہ وہ آگئی ہے۔ آپ اس سے محبت سے ہی بات کیجیے اور یہ نکتہ اس کے ذہن میں ڈالیے...... اور میرا ذکر درمیان میں نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔''
''میں بچی نہیں ہوں۔ تم بے فکر رہو۔'' سارہ جیم نے تیوری چڑھا کر کہا۔
کچھ ہی دیر بعد زویا دروازہ کھول کر فلیٹ میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں شاپنگ کے تین چار بڑے لفافے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ماما آرہی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئیں۔ زویا کچھ ڈری ڈری نظر آتی تھی مگر ماما کے نسبتاً نرم رویے نے اسے کچھ مطمئن کیا۔ اس نے ماما کا رخسار چوما۔
''یہ کیا کر کے بیٹھ گئی ہو بازو کو۔'' سارہ نے بیٹی کے پلاستر شدہ بازو کو چھوا۔
''کچھ نہیں ماما! اب تو تین چار روز میں پلاستر بھی اتر جائے گا۔'' وہ ماما کو اپنے بازو کی تازہ صورتِ حال بتانے میں مصروف ہوگئی۔

☆☆☆

آفس سے فارغ ہوکر زویا کسی مقناطیس کی طرح ٹرین کے مرکز میں اسٹیشن ہافٹ بانوف کی طرف لپکتی چلی گئی۔ شامیر سے دور رہ کر گزرنے والے چند گھنٹے اسے ایک طویل زمانے کی طرح محسوس ہوتے تھے۔ کسی وقت وہ یہ سوچ کر کانپ جاتی تھی کہ خدانخواستہ...... خدانخواستہ اسے چند مہینوں کے لیے شامیر سے جدا ہونا پڑا تو وہ کیا کرے گی؟ آج اس کا دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ ہر دھڑکن کے ساتھ جیسے ایک شادیانہ سا بھی بجتا تھا۔ اس نے صبح فون پر شامیر کو کچھ نہیں بتایا تھا وہ خود اس سے مل کر اسے بتانا چاہتی تھی۔ وہ بارونق پُرشور مرکزی اسٹیشن پر پہنچی تو اس نے دور ہی سے شامیر کو اپنا منتظر دیکھ لیا۔ وہ کسی وقت جان بوجھ کر اس کے عقب سے نمودار ہوتی تھی۔ اس مرتبہ بھی اس نے جان بوجھ کر ایسا ہی کیا۔ مین دروازے سے داخل ہونے کے بجائے وہ کلاوا کاٹ کر ایک بغلی راستے سے آئی اور اسٹیشن کے اندر ایک برگر شاپ کے پاس کھڑے شامیر کو عقب سے بانہوں میں لے لیا۔
''پورے پندرہ منٹ لیٹ ہوئی ہو۔'' وہ اسی طرح کھڑے کھڑے بولا۔
''پندرہ نا ہیں...... بارہ منٹ...... جو ٹائم تم سے دُور گزرتا اس کے ہر ہر سیکنڈ کا حساب رکھتی ہوں۔'' وہ عجب جذباتی لہجے میں بولی۔ شامیر کے عقب میں رہنے کا ایک فائدہ اسے یہ بھی ہوتا تھا کہ دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے اسے زیادہ شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔
''اچھا مجھے چھوڑو تو سہی، اپنی شکل تو دیکھنے دو۔'' اس نے مڑنے کی کوشش کی۔
''پہلے آچھی نیوز نا ہیں سنو گے؟'' زویا نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔
شامیر کے جسم میں جیسے ایک خوشگوار سی لرزش نمودار ہوئی۔ ''کیا نیوز؟''
''ماما...... تقریباً 80 پرسنٹ تک مان گئی ہیں۔'' اس نے لرزاں آواز میں کہا۔
اس بار شامیر نے مڑ کر خود کو اس کی بانہوں

میں گھمایا...... اور اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ ''واقعی؟'' وہ خوشی سے ٹوٹتی ہوئی آواز میں بولا۔

نم آنکھوں کے ساتھ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''بس ایک دو چھوٹا چھوٹا شرطیں ڈالا انہوں نے۔''

''شرطیں ڈالتے نہیں رکھتے ہیں...... چلو خیر...... ادھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ اگر اسی فیصد مان گئی ہیں تو پھر باقی بھی مان جائیں گی۔''

وہ کولڈ ڈرنکس لے کر برگر شاپ کی ہی ایک میز پر جا بیٹھے۔ زویا نے ''سپ'' لیتے ہوئے کہا۔ ''ایک دو شرطوں کا تو میں نے یونہی بول ڈیا۔ بس یہ ایک ہی شرط ہے اور آئی تھنک یہ زیادہ مشکل بھی نا ہیں۔''

''کچھ بتاؤ بھی؟''

زویا نے پہلے تھوڑی سی تمہید باندھی پھر مختصر الفاظ میں شامیر کو بتایا کہ ماما چاہتی ہیں کہ شادی کے بعد وہ ان سے دور نہ چلی جائے بلکہ یہیں جرمنی میں رہے۔

یہ بات سن کر شامیر کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ تاہم وہ اس بارے میں زیادہ کچھ بولا نہیں۔ اس قدرے کٹھن سی شرط کے باوجود اسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ خوشی کا موقع ہے اور انہیں یہ موقع ''سیلیبریٹ'' کرنا چاہیے۔

وہ بولا۔ ''چلو اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت ہمیں کچھ کھانا پینا چاہیے۔''

وہ انگلش میں بولی۔ ''شومیر! مجھے لگتا ہے کہ ماما نے خود کو بہت زیادہ ایڈجسٹ کیا۔ کمپرومائز کرنے کی یہ ایک زبردست مثال ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس طرح مان جائیں گی۔''

''خدا کرے وہ باقی بھی مان جائیں۔'' شامیر نے کہا۔

اس سے پہلے کہ زویا جواب میں کچھ کہتی، اس کی نگاہ اپنے سامنے گئی اور وہ بری طرح چونک گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دکھائی دی تھی۔ ''ٹام...... ٹام!'' وہ پکاری۔

قریباً بائیس تیئیس سال کا ایک جرمن نوجوان ٹھٹک کر رکا۔ اس کے گلے میں غلاف کے اندر لپٹا ہوا گٹار تھا۔ زویا کو دیکھ کر وہ بھی خوشی سے نہال نظر آیا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور بغلگیر ہو گئے۔ مسرت کے عالم میں نوجوان لڑکے نے زویا کو بانہوں میں بھر کر اس طرح اونچا کیا کہ زویا کے پاؤں فرش سے اٹھ گئے۔ اسی طرح زویا کو ایک بار گھما کر اس نے پھر فرش پر ٹکا دیا۔

زویا نے دانت پیس کر اس کو سر کے بالوں سے جھنجوڑا پھر اس کے دونوں گالوں پر دو زوردار چٹکیاں بھریں۔ ''کہاں دفعان ہو گئے تھے۔'' وہ بلند آواز میں بولی۔ ''نہ نیٹ پر ملتے ہو، نہ فون پر تمہارا پتا چلتا ہے۔ پتا ہے ہم کتنا یاد کرتے رہے ہیں تمہیں۔''

ہاف پینٹ پہنے ہوئے ماڈرن لڑکے نے اپنے بازو زویا کی کمر کے گرد حمائل کر دیے اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ زویا بھی رطب اللسان تھی۔ قریباً دو منٹ بعد زویا کو احساس ہو سکا کہ شامیر بھی یہاں موجود ہے۔ وہ بری طرح چونکی اور پھر جرمن لڑکے کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی شامیر کے پاس لائی۔ ''شومیر! اس سے ملو۔ یہ ٹام ہے۔ ٹالنگ میں میرا پرانا پڑوسی۔ میری اور خشامہ کی اس سے بہت دوستی رہی ہے۔ اتنا اچھا میوزک پلے کرتا ہے کہ تمہیں کیا بتاؤں۔''

پھر وہ ٹام سے مخاطب ہوئی۔ پہلے جوش سے بولنے لگی پھر اس کے چہرے پر جھجک کی سرخی سی پھیل گئی۔ ذرا دھیرج سے بولی۔ ''اور ٹام یہ ہیں شومیر۔ ڈبل اے چینل کے سب سے ذہین رپورٹر۔ یہاں بھی رپورٹنگ کے سلسلے میں ہی آئے ہیں۔''

ٹام اور شامیر نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ زویا چہک کر بولی۔ ''شومیر! پچھلے دنوں ہم نے اسکائی لین میں ایک راک اسٹار کو سنا تھا نا۔ یہ ٹام بھی اسی کے بینڈ میں پرفارم کرتا تھا لیکن اب یہ ایک دوسرے بینڈ میں چلا گیا ہے۔ اس کے پاؤں میں چکر ہے۔ پتا نہیں کہاں کہاں بھاگا پھرتا ہے۔ بس کبھی کبھی اس کا کوئی گایا ہوا گانا ہمارے کانوں تک پہنچ جاتا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے اسے مکا دکھایا اور پھر بڑی بے تکلفی سے اس کے سر کے بال بکھیر دیے۔

گہرے سرخ ہونٹوں والا قبول صورت ٹام بس مسکراتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ ٹٹولنے والی نظروں سے شامیر کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ زویا نے فون پر خشامہ کو ٹام کے بارے میں بتایا۔ تب وہ ایک بار پھر جوشیلے انداز میں اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی۔

(جاری ہے)

شامیر کھلے دل ودماغ کا شخص تھا، مگر زویا کے حوالے سے اس کے احساسات اتنے خاص الخاص ہو چکے تھے کہ اس میوزیشن ٹام کے ساتھ اس کی یہ غیر معمولی بے تکلفی اسے کھلنے لگی۔ اس نے عام تاثرات تو نارمل ہی رکھے مگر سینے میں جیسے مسلسل کچھ چبھ رہا تھا۔ وہ زویا کو اس ماحول اور اس مادر پدر آزاد معاشرے سے دور لے جانا چاہتا تھا۔ وہ شبنم کی طرح پاک اور پھولوں کی طرح عطر بیز تھی۔ وہ جیسے یہاں کی تھی ہی نہیں...... اس کا دل چاہا کہ وہ اسے کسی موتی کی طرح اپنی بانہوں کے سیپ میں سمیٹے اور کہیں بہت دور نکل جائے...... پاکستان کی فضاؤں میں پہنچ جائے مگر ابھی تھوڑی دیر پہلے زویا نے جو بات کی تھی، وہ اس کے برعکس تھی۔

رات کو ویڈیو لنک کے ذریعے امو خالہ سے اس کی تفصیلی بات ہوئی۔ انہیں بھی زویا تقریباً پسند آچکی تھی مگر یہ بات تو ان کے لیے بھی قابلِ قبول نہیں تھی کہ وہ شامیر کی شریک زندگی تو بن جائے مگر پاکستان نہ آئے۔ شامیر کی پریشانی دور کرنے کے لیے امو خالہ نے بڑی محبت سے کہا۔

''شامی! میرا دل کہتا ہے کہ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے اور جہاں سچی محبت ہوتی ہے، وہاں دیواریں خود بخود گر جاتی ہیں۔ تم جلد بازی نہ کرنا۔ طریقے سے کوشش کرو۔ وہ مان جائے گی۔ اسے ماننا ہی پڑے گا۔ ایک دفعہ وہ پاکستان آگئی اور اس نے ہم سے مل لیا تو اس کے سارے خوف دور ہوجائیں گے۔''

قریباً یہی وقت تھا جب زویا کے فلیٹ میں اس کی ماما اسے سمجھا رہی تھیں۔ ''زویا! یہ لڑکا اپنے ہم قوم لوگوں سے کچھ مختلف لگتا ہے مگر کم از کم اپنی اس شرط سے ہرگز پیچھے نہ ہٹنا۔ اگر وہ تم سے محبت کرتا ہے تو اتنی قربانی وہ تمہارے لیے ضرور دے گا۔ یہاں اس کی ترقی کے مواقع بھی پاکستان سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ وہ یہاں رہ کر اپنی خالہ کی کفالت بھی پہلے سے بہتر کرسکتا ہے اور پھر یہ جدید دور ہے۔ انٹرنیٹ نے دنیا کو گلوبل ویلیج بنا رکھا ہے، وہ یہاں رہ کر بھی ہر وقت اپنے اہلِ خانہ سے رابطے میں رہ سکتا ہے۔''

زویا نے کہا۔ ''ماما! شومیر کہتا ہے کہ خالہ کی کفالت والی تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دیہی علاقے میں ان کی کچھ زمین ہے جہاں سے معقول آمدنی بھی ہوجاتی ہے...... اصل بات یہ ہے کہ وہ خالہ سے بہت محبت کرتا ہے......''

ماما بولیں۔ ''تم نے زمین والی بات کی ہے تو مجھے ایک اور بات یاد آگئی ہے۔ کوئی دو سال پہلے ہمارے پڑوس کی ایک لڑکی بھی ایک ایسے ہی پاکستانی زمیندار گھرانے میں شادی کر کے گئی تھی۔ یہ لوگ جن کا تعلق دیہاتی علاقے سے ہوتا ہے، ایک اور ہی مائنڈ سیٹ کے مالک ہوتے ہیں۔ خدانہ کرے کہ یہ لڑکا ایسا ہو مگر اس لڑکی کا تو پاکستان جا کر جو حشر ہوا وہ سن کر دل کانپ جاتا ہے۔ اسے پردے میں بٹھا دیا گیا، گھر جیل بن گیا اس کے لیے۔ ایسی ایسی پابندیاں لگیں جو تصور میں نہیں آسکتیں۔ شوہر نے اسے بچے پیدا کرنے والی مشین بنانا چاہا۔ اپنے دو بچوں سمیت وہ بڑی مشکل سے وہاں سے جان بچا کر نکلی تھی۔''

زویا اس واقعے کے بارے میں پہلے بھی تھوڑا بہت جانتی تھی۔ اب ماما نے اسے مزید تفصیل اور شدت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔

☆☆☆

زویا اور شامیر ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ باہر ہلکی بارش ہورہی تھی۔ یہاں حلال گوشت کا اہتمام بھی تھا مگر ان دونوں میں سے کسی نے بھی کھانا نہیں منگوایا تھا۔ بیٹھنے کے لیے بہانہ درکار تھا اس لیے شامیر نے آئس کریم منگوالی تھی۔ زویا کا دل شاید آئس کریم کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ یونہی آئس کریم کے کپ میں چمچ گھماتی جارہی تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ گال کا ڈمپل بھی کچھ ماند پڑا محسوس ہوتا تھا۔ وہ ایک بار پھر ملتجی لہجے میں بولی۔ ''شومیر! پلیز...... تم مان کیوں نہیں جاتے؟ یہاں شفٹ ہوجاؤ۔ بہت آسانیاں پیدا ہوجائیں گی۔ یہاں بھی چینل کا سیٹ اپ موجود ہے۔ روزگار کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ ترقی کے مواقع پیدا ہوجائیں گے۔''

شامیر نے کہا۔ ''زویا! میرے لیے یہ کوئی ضد یا انا کا مسئلہ نہیں ہے۔ کچھ مجبوریاں ہیں جو تمہارے سامنے ہیں۔''

وہ شامیر کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''ہم خالہ اور ان کی بیٹی کو بھی یہیں بلا لیتے ہیں۔ بچے تعلیم کے لیے ویسے بھی تو لاکھوں خرچ کر کے یہاں آتے ہیں۔ فارہ کو بہترین اسکول میں داخلہ مل جائے گا۔ خالہ کے جوڑوں کی جو تھوڑی بہت تکلیف ہے، وہ بھی دیکھنا یہاں کتنی اچھی طرح ٹریٹ ہوگی...... تم نے خود بتایا ہے کہ تمہارا اور تو کوئی قریبی عزیز ایسا ہے نہیں جو پاکستان میں ہو۔''

وہ دیر تک شامیر کا ہاتھ تھام کر بیٹھی رہی اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ شامیر جانتا تھا کہ زویا کا موقف یہاں رہنے کے حوالے سے اگر سخت ہوا ہے تو اس کے پیچھے اس کی ماما کا ہاتھ...... بھی ہے۔ شامیر کی معاملہ فہمی

اسے خشامہ کے حوالے سے بھی شک میں مبتلا کر رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ بھی کوئی کردار ادا کر رہی ہو۔

اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''زویا! میرا جی چاہتا ہے کہ ایک بار براہِ راست تمہاری ماما سے ملوں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم اس کا کوئی درمیانی حل نکالنے میں کامیاب ہوجائیں۔''

''اور اگر...... خدانخواستہ حل نہ نکلا تو؟'' وہ مزید زرد ہو کر بولی۔

''پھر میں...... وہی کروں گا جو تم کہو گی...... اور جس میں ہماری محبت کی آبرو ہوگی۔'' اس نے زویا کے ہاتھوں کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسا کر اسے تسلی دی۔

''تو پھر کل ہی مل لو۔ کل ان کا موڈ بڑا اچھا ہوگا کیونکہ یہ ان کی سالگرہ کا دن بھی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کسی تحفے کا انتظام بھی کرتا ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

اگلے روز شام کو فلیٹ کے ایک قریبی ریستوران میں شامیر، زویا کی ماما سارہ جیم کے روبرو بیٹھا تھا۔ وہ نہایت قیمتی شال کا تحفہ ان کو پیش کر چکا تھا جسے خوش اخلاقی سے قبول کرلیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد اب وہ اصل موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ شامیر کہہ رہا تھا۔ ''آنٹی سارہ! زویا کو وہاں اتنی محبت ملے گی جس کا وہ تصور نہیں کرسکتی۔ وہ ایک سال یا چند ماہ وہاں رہے، مجھے یقین ہے کہ وہ وہاں رہنے کو ترجیح دے گی۔''

''اور اگر اس کے برعکس ہوا تو؟'' آنٹی سارہ نے گرین ٹی کی چسکی لیتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''فرضِ محال ایسا ہوا تو...... ہم...... یہاں آنے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔''

''مقامی لڑکیوں کا وہاں جاکر آنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ کچھ ایسے کیس میرے علم میں ہیں۔ میں وہاں کے ماحول کو اچھی طرح جانتی ہوں...... کیونکہ میں نے اپنی زندگی کے پچیس سال ایک ایسے شخص کے ساتھ گزارے ہیں جو وہیں کا پلا بڑھا تھا۔''

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، آنٹی سارہ جلدی سے بولیں۔ ''شامیر! تم واقعی یہاں جرمنی میں آ ہی کیوں نہیں جاتے۔ ان ملکوں کے لوگ تو مرتے ہیں یہاں آنے کو۔''

شامیر کو ناگواری محسوس ہوئی مگر اس نے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ متانت سے بولا۔ ''آنٹی! میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔''

آنٹی سارہ کی آنکھوں کا گدلا پن کچھ اور گہرا ہوگیا۔ وہ اپنے سرخی لگے ہونٹ بھینچ کر کچھ دیر گہری نظروں سے شامیر کو دیکھتی رہیں پھر کاٹ دار لہجے میں بولیں۔ ''مجھے پتا ہے تم خالہ بھانجے کی سب سے بڑی مجبوری کیا ہوگی۔ وہی فارہ نام کی لڑکی۔ وہ یہاں اس ناپاک ملک میں آئے گی تو ناپاک ہوجائے گی لیکن ناپاکی کا یہ خطرہ تو صرف عورتوں کے لیے ہے۔ وہاں تمہارے ملک کے مرد حضرات تو یہاں آکر ناپاک نہیں ہوتے۔ وہ تو مزید معزز اور شان و شوکت والے ہوجاتے ہیں۔''

''سوری تو سے، آنٹی سارہ! آپ سب کے بارے میں تو یہ بات نہیں کہہ سکتیں۔''

''میں کہہ سکتی ہوں۔'' وہ سخت لہجے میں بولیں۔ ''ہاں، میں کہہ سکتی ہوں کیونکہ میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ایک ایسے ہی کمینے کے ساتھ برباد کیا ہے۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ ان ملکوں میں بس تب تک عیش و آرام سے رہا جاسکتا ہے جب تک بچیاں اسکول کی عمر تک نہ پہنچ جائیں۔ پھر یہاں سے بھاگ جانا چاہیے...... ورنہ وہ بچیاں نہیں رہیں گی، بلائیں بن جائیں گی۔ اپنے پیدا کرنے والوں کا خون چوس لیں گی...... لہٰذا بھاگ جانا چاہیے۔''

آنٹی سارہ ہیجانی انداز میں بولی۔

شامیر نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''آنٹی جان! یہ بات مکمل طور پر غلط بھی تو نہیں ہے۔ اس معاشرے کی بے راہ روی سے تو آپ لوگ خود بھی پریشان ہیں، کیا کچھ نہیں ہوجاتا یہاں۔''

''کیا کچھ ہوجاتا ہے؟'' وہ مزید بھڑک کر بولیں۔ ''اور کیا کچھ ہے جو تمہارے ملک میں نہیں ہوتا۔ اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں...... ایسی باتیں کرتے ہوئے تم لوگوں کی عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ نیکی اور بدی ہر بندے کے اندر ہوتی ہے۔ اب دیکھو میری بیٹیوں کو۔ یہیں پلی بڑھی ہیں نا۔ تمہیں کیا خرابی نظر آئی ہے میری زویا میں...... میری ایما اور حولیہ بھی اسی طرح ہیں اور وہ تمہارا اہم قوم...... وہ باسٹرڈ...... وہ باپ ان کا۔ انہیں لے کر بھاگ جانا چاہتا تھا وہاں انڈیا میں...... اگر میں اس کے سامنے دیوار نہ بنتی تو یہ برباد ہوچکی ہوتیں۔''

''پلیز آنٹی! آپ ذرا تحمل سے بات کریں۔ آپ سب کو ایک لاٹھی سے ہانک رہی ہیں۔''

''تو کیا غلط کر رہی ہوں۔ ایک جیسے ہو تم سب......

ایک ہی خصلت ہے تم سب کی۔'' وہ مزید بھڑکتی جارہی تھیں۔ جیسے وہ طے ہی یہ کر کے آئی تھیں کہ معاملے کو مزید بگاڑنا ہے۔

شامیر نے پھر کوشش کر کے اپنے طیش کو دبایا اور بولا۔ ''آنٹی جان! اونچا بولنے سے جھوٹ کو سچ نہیں بنایا جاسکتا۔لوگ تماشا دیکھ رہے ہیں۔''

''میں جھوٹی نہیں ہوں۔ تم جھوٹے ہو...... تم سب جھوٹے ہو......تمہارا خمیر ہی جھوٹ سے اٹھا ہے۔لعنت ہے تم سب پر۔'' انہوں نے میز پر ہاتھ مار کر وہ باکس دور پھینک دیا جس میں شامیر قیمتی شال لے کر آیا تھا۔

دو قدم آگے بڑھ کر وہ شامیر پر گرجیں۔ ''اپنی کسی باسٹرڈ بہن یا بھتیجی کو تو کیوں نہیں بیاہتا یہاں کسی جرمن کے ساتھ۔ کیوں یہاں آجاتے ہو دولت کے پیچھے اور لڑکیوں کے پیچھے......'' اس کے بعد وہ سیدھی سیدھی گالیوں پر اتر آئیں۔

اب شامیر سے مزید برداشت نہیں ہوا۔ اس نے جواب دیا تو وہ چیل کی طرح شامیر پر جھپٹ پڑیں۔ اپنا وزنی شولڈر بیگ گھما کر شامیر کے منہ پر دے مارا۔ انہوں نے دوبارہ مارنے کے لیے بیگ بلند کیا تو شامیر نے بیگ کو اسٹریپ سے پکڑلیا اور پھر اسے زور سے کھینچ کر دور پھینک دیا۔ بیگ کے ساتھ ہی آنٹی سارہ بھی ریستوران کی کرسیوں پر لڑھک گئیں۔ انہوں نے ماتھا پکڑلیا اور چلانا شروع کردیا۔ ایک دم بہت سے لوگ بیچ میں آ گئے۔ کچھ شامیر پر برسنے لگے کہ اس نے اس طرح کیوں کیا ہے۔

ایک تنومند جرمن گرج کر بولا۔ ''پولیس کو کال کرو۔ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔''

اسی دوران میں شامیر نے خشامہ کو دیکھا۔ وہ شاید کہیں آس پاس ہی موجود تھی۔ وہ فوراً موقع پر پہنچ گئی۔ اس نے کینہ توز نظروں سے شامیر کو دیکھا پھر آنٹی سارہ کو سنبھلنے میں مدد دی۔ ان کی پیشانی کے اوپر بالوں کے درمیان سے کچھ خون رس رہا تھا۔

دو تین منٹ تک خوب شور شرابا رہا، بہرحال پولیس تک نوبت نہیں پہنچی کیونکہ ریستوران کا مالک بھی اس بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہ رہا تھا۔ آنٹی سارہ بکتی جھکتی اور صلواتیں سناتی ہوئی خشامہ سمیت باہر چلی گئیں۔ خشامہ نے اپنا رومال ان کے ماتھے پر رکھا ہوا تھا......

☆☆☆

زویا نے نماز روزے کی طرف شاید ہی کبھی توجہ دی ہو لیکن ان دنوں وہ جس طرح کے حالات سے گزر رہی تھی، اسے روحانی سہارے کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ان دو تین ہفتوں میں جیسے سرتاپا بدل گئی تھی۔ کسی کی محبت نے ایسی بے پناہ شدت سے اسے جکڑا تھا کہ رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کسی وقت وہ آنکھیں بند کر کے بہ زبانِ خاموشی خود ہی سے جھگڑنے لگتی...... اے نکمے، نادان دل تو نے رول ڈالا مجھے...... تنکے سے ہلکا کردیا۔ یہ کیا ہو گیا ہے تجھے؟ اب تک تو بڑی شرافت سے دھڑک رہا تھا تو...... تجھ سے ایسی امید تو ہرگز نہیں تھی۔ ایسی دیوانگی؟ طلب کی ایسی شدت؟ اتنی محبت کہاں چھپا رکھی تھی تو نے؟

اب بھی دل بڑے بے ڈھنگے طریقے سے دھڑک رہا تھا۔ گاہے بگاہے دھڑکن زیروزبر ہو جاتی تھی۔ ایک قریبی ریستوران میں ماما اور شامیر کی ملاقات تھی۔ وہ مسلسل دعا گو تھی کہ یہ ملاقات کامیاب ہو جائے اور کوئی درمیانی راستہ نکل آئے۔ وہ اب شامیر کو کھونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ جینز اور شرٹ میں تھی۔ تاہم اس نے اچھی طرح اسکارف اوڑھا اور مغرب کی نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ خشامہ بھی ماما کے ساتھ گئی تھی تاہم جس دوران میں ماما اور شامیر کی ملاقات ہونا تھی اس نے ایک قریبی مارکیٹ میں شاپنگ کرنا تھی۔

زویا نماز سے فارغ ہو کر کچن میں آ گئی۔ اس کے بازو کا پلاستر اب اتر چکا تھا۔ اسی اثنا میں اسے اندازہ ہوا کہ ماما اور خشامہ واپس آ گئی ہیں۔ ''یا اللہ خیر'' اس نے اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

سیڑھیوں پر ماما اور خشامہ کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے بے تابی سے بڑھ کر دروازہ کھولا...... جو کچھ نظر آیا اس نے اسے سکتہ زدہ کردیا۔ ماما کی شرٹ پر خون کے چھینٹے تھے۔ خشامہ نے ان کے ماتھے پر رومال رکھا ہوا تھا اور وہ کراہتی ہوئی آرہی تھیں۔

''اوہ گاڈ۔'' زویا تقریباً چلا اٹھی۔ ''کیا ہوا ماما؟''

خشامہ، انہیں لے کر اندر آ گئی اور بولی۔ ''یہ پوچھو کیا نہیں ہوا؟ وہ پرلے درجے کا بدتمیز بلکہ جانور ہے۔ جھوٹی شرافت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا خبیث نے۔'' زویا کو لگا جیسے ایک لمحے میں اس کا جسم خون سے خالی ہو گیا ہے اور دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا ہے۔

''کس کی بات کر رہی ہو خشامہ؟'' وہ رو دینے والے انداز میں بولی۔

''اسی شامیر کی...... غصے میں ہوش گم ہو رہے تھے

اس کے...... میں تو کہوں گی جانور ہے وہ...... اگر لوگ روک نہ لیتے تو پتا نہیں کیا کر جاتا...... یوں آنٹی پر جھپٹ رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔''

زویا کی ماما کراہتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ پیشانی سے ذرا اوپر بالوں کے درمیان زخم زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن چونکہ بینڈیج نہیں کرائی گئی تھی اس لیے خون کے کچھ چھینٹے رخسار اور شرٹ پر نظر آ رہے تھے۔ خشامہ نے اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر یوں بیان کیا کہ زویا پتھرا سی گئی۔ جو کچھ وہ کہہ رہی تھی اس سے تو یہی پتا چلتا تھا کہ ماما کی کوئی بڑی لکی کام آ گئی ہے جس کے سبب وہ شدید زخمی ہونے اور اسپتال وغیرہ پہنچنے سے بچ گئی ہیں۔

زویا کے پوچھنے پر ماما نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''کچھ بھی نہیں ہوا زویا! مجھے تو سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ اتنا کیوں بھڑکا ہے۔ میں نے اس آپشن کی بات کی تھی کہ کیوں نہ ہم اس کی خالہ اور اس کی بچی کو بھی یہاں بلالیں۔ مجھے پتا ہے کہ اسے جو غصہ آیا ہے، وہ بچی کے ذکر پر ہی آیا ہے۔ اپنی جوان ہوتی بچیوں کو یہاں لانا یا یہاں رکھنا ان لوگوں کے لیے بڑی شرمندگی کی بات ہوتی ہے...... وہی...... تمہارے باپ والا مائنڈ سیٹ۔''

''کیا کہا اس نے؟'' زویا ٹوٹتی ہوئی آواز میں بولی۔

''میں نے بس اتنی ہی بات کی کہ شاید تم اس لیے یہاں شفٹ ہونا نہیں چاہتے ہو کہ خالہ کی بیٹی کو بھی ساتھ آنا پڑے گا۔ یہ بات اس کے دل میں تیر کی طرح لگی۔ بدزبانی پر اتر آیا۔ یہ لوگ ایسے معاملوں میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ شاید غلطی میری ہی تھی۔ مجھے یہ بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔'' زویا کی ماما نے آزردہ لہجے میں کہا اور آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔

زویا جیسے تڑپ کر رہ گئی۔ اس کا اپنا دل بھی گواہی دیتا تھا کہ شامیر اگر یہاں شفٹ ہونے کی بات پر چپ سا ہو جاتا ہے تو اس کے پیچھے کچھ ایسی ہی وجہ ہے۔

☆☆☆

وہ بڑے تکلیف دہ شب و روز تھے۔ شامیر نے زویا سے ملنے کی بڑی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ ہاں فون پر دو تین بار زویا سے طویل گفتگو ضرور ہوئی۔ شامیر نے ہزار صفائیاں پیش کیں...... اصل صورت حال بتائی...... آنٹی سارہ کی زیادتی اور اپنے صبر و تحمل کا ذکر کیا، مگر زویا پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ بس ایک ہی بات کہتی تھی۔ ''شومیر! میں نے تم کو اپنے والد سے بہت مختلف سمجھا تھا۔ مجھے تم سے ایسے رویے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ تم نے میری ماما کی جو توہین کی ہے وہ میں بھول نہیں سکتی۔''

اس نے زویا سے معافی بھی مانگ لی مگر یوں لگتا تھا کہ اس کے دل میں جو گرہ پڑ گئی ہے، وہ کھلنے کا نام نہیں لے رہی۔ ہوٹل کے کمرے میں تنہا بیٹھا وہ اپنے ہی پسینے میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ وہ تو اس کے بغیر ایک دن یا چند گھنٹوں کا وقت بھی گزار نہیں پاتا تھا۔ ہفتے اور مہینے کیسے گزار سکے گا اور اگر خدانخواستہ مستقل دوری کی صورت حال پیدا ہو گئی تو وہ زندہ کیونکر رہ پائے گا؟ یہ کوئی عام تعلق نہیں تھا...... یہ محبت بھی نہیں تھی...... یہ روح کی گہرائیوں سے ابھرنے والا عشق تھا شاید...... اور یہ ایک شدید عارضے کی طرح اسے لاحق ہو چکا تھا۔ فرینکفرٹ کے باغیچوں اور گھروں کی بالکونیوں میں ڈیزی اور گلاب کے سارے پھول بے رنگ ہو چکے تھے۔ در و دیوار پر زرد اداسی کے سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔

اس کی واپسی کے دن قریب آ رہے تھے بلکہ اب تو صرف تین چار روز باقی تھے۔ سیاحت کے بقایا سارے پروگرام دھرے رہ گئے تھے۔ تاریخی شہر ہیمبرگ کو دیکھنا، دیوار برلن کا نظارہ کرنا، بلیک فارسٹ میں جانا، کچھ بھی تو نہیں ہو سکا تھا لیکن وہ اس طرح اس کہانی کو ادھورا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ زویا سے کم از کم ایک ملاقات تو ضرور کرنا چاہتا تھا...... ایک فیصلہ کن ملاقات!

خشامہ سے تو کسی طرح کے تعاون کی توقع رکھنا...... بیکار تھا۔ شامیر نے اس دوسری دبلی پتلی دراز قد لڑکی جین سے رابطہ کیا جو زویا والی بلڈنگ میں ہی رہائش پذیر تھی اور اس کی عزیز دوست بھی تھی۔ جین نامی اس لڑکی نے ایک رات، زویا اور شامیر کے ساتھ زویا کے فلیٹ میں قیام بھی کیا تھا۔ بہت کوشش کے بعد شامیر اس لڑکی کے ذریعے زویا کو ایک بار ملنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

شامیر اور زویا کی یہ ملاقات ٹرین نمبر 21 کے اس آخری اسٹاپ پر ہوئی جہاں وہ اس سے پہلے بھی ایک بار ملے تھے۔ گھنے سیاہی مائل درختوں کے نیچے یہ وہی جگہ تھی جہاں ریلوے کے کچھ عجائبات رکھے تھے اور پکنک اسپاٹ کا سا ماحول تھا۔ یہاں چند روز پہلے زویا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شامیر نے کوک کا بچا ہوا گھونٹ اپنے گلے میں اتارا تھا اور دونوں کے چہرے ایک بے ساختہ مسکراہٹ سے کھل اٹھے تھے مگر تب کے اور آج کے ماحول میں بہت فرق تھا۔ وہ دونوں گم صم سے پتھریلی بینچ پر بیٹھ گئے۔ آج

بھی سہ پہر کا ہی وقت تھا مگر بارش نہیں تھی...... شامیر نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا چلو، یہ بحث چھوڑتے ہیں کہ زیادتی کس کی طرف سے ہوئی اور کیوں ہوئی؟ میں جا کر تمہاری ماما سے غیر مشروط معافی مانگ لیتا ہوں اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ مجھے معاف کر دیں گی۔“

زویا بولی۔ ”شومیر! بات معافی کی نہیں ہے۔ اگر معافی کی ہے تو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیتی ہوں۔ دل کی گہرائی سے تمہیں سوری بولتی ہوں۔“

اس نے واقعی پلکیں جھکا کر شامیر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی آنکھوں سے دو موتی ڈھلک کر رخساروں پر پھسل گئے۔

شامیر نے جلدی سے اس کے ہاتھ تھامے۔ ”زویا! ایسا مت کرو، مجھے تکلیف ہو رہی ہے...... مجھے یہ بتاؤ کہ ہم...... اس معاملے کو سدھارنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ میں بہت آگے نکل گیا ہوں زویا! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں سچ کہتا ہوں۔ اس تھوڑے سے وقت میں، میں نے بہت لمبا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی اب مجھے محال لگتا ہے۔“

وہ شامیر کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے انگلش میں بولی۔ ”پلیز...... پلیز...... شومیر! میری بات مان لو۔ یہاں جرمنی آجاؤ۔ تم یقین کرو ہم بہت خوش رہیں گے۔ ہم سب کچھ ٹھیک کر لیں گے۔ خالہ اور فارہ کے سلسلے میں تمہارے جو اندیشے ہیں وہ سارے کے سارے دور ہو جائیں گے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ یہاں آنا چاہیں گی تو ہم ان کو پھولوں کی طرح رکھیں گے۔ اتنا تحفظ اور اطمینان دیں گے کہ وہ پاکستان میں شاید تصور بھی نہ کر سکتی ہوں۔“

شامیر کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آئے۔ وہ پہلو بدل کر بولا۔ ”زویا! تم یہ بات سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ امو خالہ اور فارہ پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ میں انہیں کہہ تو سکتا ہوں لیکن انہیں مجبور کر کے یہاں جرمنی نہیں لا سکتا۔ اگر وہ نہ آنا چاہیں گی تو پھر میں انہیں چھوڑ کر یہاں کیسے آسکتا ہوں؟“

زویا کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ ”وہ کیوں آنا نہ چاہیں گی شومیر! مجھے بتاؤ نا... وہ کیوں آنا نہ چاہیں گی؟ دنیا کی کون سی سہولت ہے جو یہاں موجود نہیں ہے۔ ترقی کے مواقع ہیں۔ بہترین لائف اسٹائل ہے، ہر طرح کا تحفظ ہے۔“

”زویا! وہ جگہ امو خالہ کی جنم بھومی ہے۔ وہ اس جگہ کو چھوڑنا نہیں چاہیں گی۔“

زویا کی گرفت شامیر کے ہاتھوں پر ڈھیلی پڑ گئی۔ چہرے پر کرب نمودار ہوا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔ ”شومیر! مجھے ایک بات بالکل سچ سچ بتاؤ۔ اگر تمہاری امو خالہ کے ساتھ ان کی بیٹی نہ ہوتی تو کیا وہ پھر بھی اسی طرح سوچتیں؟ اسی طرح یہاں آنے کے خیال سے خوفزدہ ہوتیں؟“

”زویا! تم بار بار فارہ کو بیچ میں کیوں لے آتی ہو؟“ وہ زچ ہو کر بولا۔ ”میں تمہیں درجنوں مرتبہ بتا چکا ہوں، بات وہ نہیں ہے جو تمہارے پاپا کی سوچ میں تھی یا تمہاری ماما تمہارے ذہن میں ڈال رہی ہیں۔ بے شمار ایسے خاندان یہاں جرمنی میں موجود ہیں جن کی جوان بچیاں بھی ہیں بلکہ اب تو لڑکیاں پڑھنے کے لیے بھی پاکستان سے یہاں آجاتی ہیں......“

”تم دوسروں کی بات کیوں کرتے ہو شومیر! تم اپنی بات کرو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری امو خالہ اور فارہ یہاں آسکتی ہیں؟ عزت اور تحفظ کے ساتھ رہ سکتی ہیں؟ تم...... ایسا نہیں سمجھتے ہو شومیر۔ تمہارے لیے ایک جوان لڑکی کو یہاں لانا ایسے ہی ہے جیسے بھیڑ کے کسی بچے کو شکاری جانوروں سے بھرے ہوئے جنگل میں لے آنا...... اسی لیے تم مجھے بھی یہاں سے نکالنا چاہتے ہو۔ اپنی دانست میں تم مجھے بھی اس نہایت گندی اور پُرخطر جگہ سے نکالنے کا شبھ کام کر رہے ہو۔“

”زویا...... زویا...... تمہیں کیا ہو جاتا ہے جب اس موضوع پر بات ہوتی ہے...... تمہارا ذہن ایسا نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ذہن میں یہ سب کچھ ڈالا جا رہا ہے...... تمہیں میرے حوالے سے میرے ملک کے حوالے سے بدظن کیا جا رہا ہے...... خوفزدہ کیا جا رہا ہے۔“

”خوفزدہ میں نہیں ہوں...... تم ہو شومیر...... اور تمہارا یہ خوف مستقل نہیں ہے۔ یہ خوف صرف اس وقت تمہارے ذہنوں کو ڈھانپتا ہے جب بات تمہاری بہنوں، بیٹیوں کے یہاں آنے کی ہوتی ہے۔“ زویا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کے لہجے میں بیگانگی آتی جا رہی تھی۔

شامیر نے جزبز ہو کر کہا۔ ”زویا...... دیکھو اب تم اپنی بہن اور اپنی ماما کی زبان بول رہی ہو...... اور یہی وہ پوائنٹ ہے جہاں......“

زویا نے شامیر کی بات کاٹی۔ ”چلیں، ٹھیک ہے۔ میں اپنی ماما کی زبان ہی بول رہی ہوں۔ تم بھی تو اپنی امو

خالہ اور اپنی بہن کی زبان بول رہے ہو۔'' وہ جیسے کراہ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

شامیر کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ زویا کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''زویا! دیکھو ہم یہاں کوئی درمیانی راہ ڈھونڈنے کے لیے آئے تھے۔ اگر پھر وہی باتیں چھیڑ دیں گے تو کوئی حل کیسے نکلے گا؟''

اس نے چہرہ جھکایا۔ دو قیمتی موتی پھر اس کی آنکھوں کی سیپیوں سے جھڑ کر نیچے گھاس میں گم ہو گئے۔ اس نے شامیر کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا اور ہولے سے بولی۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ اس کا کوئی حل نکلے گا۔ شش...... شاید ہمیں ایک دوسرے کو بھولنا پڑے گا۔''

اس نے جھک کر سنگی بینچ سے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ایک بار بھرپور نظروں سے شامیر کی طرف دیکھنا چاہتی ہے لیکن وہ نہیں دیکھ سکی۔ ایکدم پلیٹ فارم کی طرف مڑ گئی۔

شامیر بے ساختہ دو یا تین قدم اس کے پیچھے گیا، پھر سکتہ زدہ سا رک گیا۔ ان لمحوں میں جیسے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کرے۔ ٹرین کو بھی عین اسی وقت آنا تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ زویا جا رہی تھی۔ شامیر کا سکتہ ٹوٹا۔ وہ لپک کر اس کی طرف گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر اب انا آڑے آ رہی تھی۔ اسی دوران میں وہ دروازے میں داخل ہو گئی اور آٹومیٹک دروازے نے اسے شامیر کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔

☆☆☆

جوں جوں جانے کا وقت قریب آ رہا تھا، شامیر کی بے قراری اور تڑپ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یوں اپنا سب کچھ کھو کر وہ کس طرح واپس جا سکتا ہے۔ اس نے اپنی ''انا'' کو زیر کیا اور ایک بار پھر زویا سے ٹیلی فونک رابطے کی کوشش کی۔ شروع میں ایک دو مرتبہ بیل گئی، مگر پھر فون مستقل طور پر آف ہو گیا۔ یہ بڑا سنگین اشارہ تھا۔ وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

رات کا بیشتر حصہ شامیر نے جاگتے اور سوچتے ہوئے گزارا۔ لاہور سے امو خالہ کی کال بھی آئی مگر شامیر نے زویا کے حوالے سے انہیں گول مول جواب ہی دیے۔ دوسرے روز اس نے فون پر جبین سے رابطہ کیا۔ وہ ایک طرح سے اس کی رازدار کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

''پلیز جبین! زویا سے کہو کہ وہ بس ایک آخری دفعہ مجھ سے فون پر بات کر لے۔'' وہ ملتجی لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے برادر! میں کوشش کرتی ہوں۔'' جبین نے بجھے ہوئے سے انداز میں کہا۔

''لیکن میں کل واپس جا رہا ہوں جبین! صبح گیارہ بجے میری فلائٹ ہے۔''

''او کے۔ میں ابھی اس سے بات کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔''

شامیر کو تھوڑی بہت شاپنگ کرنا تھی۔ وہ بازار چلا گیا اور ساتھ ساتھ جبین کی کال کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد اس کی کال آئی۔ اس نے کہا کہ زویا کا فون بند جا رہا ہے۔ ہاں، اس کی ایک فرینڈ نے بتایا ہے کہ وہ اور خشامہ ویک اینڈ پر قریبی قصبے کوزے وان گئی ہیں۔ شاید انہوں نے رات وہیں رہنا ہے۔ ان کی واپسی کل دوپہر تک ہو گی۔

''پلیز جبین! کسی بھی طرح اس سے کونٹیکٹ کرو۔ اس تک میرا پیغام پہنچاؤ۔''

''میں پوری کوشش کر رہی ہوں برادر۔ جیسے بھی بات ہوتی ہے...... اور جو بھی ہوتی ہے، میں تمہیں آگاہ کرتی ہوں۔''

شامیر پیکنگ کرتا رہا اور ساتھ ساتھ بے تابی سے جبین کی کال کا انتظار بھی۔ تھک کر اس نے شام چھ بجے کے قریب پھر جبین کا نمبر ملایا...... اس مرتبہ اس کے اندر جیسے ایک سرد اندھیرا سا اتر گیا۔ اب جبین کا فون بھی بند جا رہا تھا۔

جو بھی صورتِ حال تھی، وہ سامنے دیوار پر لکھی نظر آ رہی تھی۔ زویا اب اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

رات نو دس بجے تک کا وقت شامیر نے سخت بے قراری کے عالم میں گزارا۔ تب ایک بار پھر اپنے اندر انا کی دیوار کو ڈھایا اور جبین سے ملنے اس کے فلیٹ کی طرف چل دیا۔ ٹیوب کے ذریعے دس منٹ کا فاصلہ طے کر کے وہ جبین کے فلیٹ تک پہنچا۔ یہ وہی بلڈنگ تھی جس میں زویا کا فلیٹ بھی واقع تھا۔ وہی فلیٹ جس سے شامیر کی بہت سی یادیں نتھی ہو گئی تھیں۔

جبین کا فون مسلسل بند تھا۔ وہ زینے طے کر کے فرسٹ فلور پر اس کے دروازے تک پہنچا۔ دھڑکتے دل سے اس نے کال بیل دی۔ اندر موجود روشنی اور آہٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ فلیٹ خالی نہیں ہے۔ چار پانچ مرتبہ بیل دینے کے باوجود اندر خاموشی رہی۔ وہ ڈھیٹ بن کر کھڑا

رہا۔ آخر ایک سیاہ فام لڑکی باہر نکلی۔ اس نے ادھ کھلے دروازے سے شامیر کو آگاہ کیا کہ جین گھر میں نہیں ہے۔ اس کا لب ولہجہ اس کے جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا۔ شاید دروازے کے ''پیپ ہول'' سے شامیر کو دیکھا جاچکا تھا۔ وہ اس سے آگے اب نہیں جاسکتا تھا۔ اس کا دل جیسے سو ٹکڑوں میں تقسیم تھا اور شیشے کی کرچیوں کی طرح سینے میں بکھرا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ فام لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ جھکے سر اور مرے مرے قدموں کے ساتھ وہ واپس پلٹ آیا۔

اور اگلے روز یہ منظر فرینکفرٹ کے بارونق ائرپورٹ کا تھا۔ چار پانچ ہفتے پہلے جب وہ اس ائرپورٹ پر اترا تھا تو اس کی زندگی کتنی مختلف تھی پھر سب کچھ کتنی تیز رفتاری سے بدلا۔ آج درد کی شدت سے اس کے دل کی رگیں ٹوٹ رہی تھیں۔ دکھ کا ایک ہمالیہ تھا جس کے بوجھ تلے اس کے جسم وجاں کچلے جارہے تھے مگر آس تو ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتی۔ معلوم نہیں کیوں اب بھی شامیر کی نگاہیں بار بار داخلی دروازوں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ شاید وہ آجائے...... شاید آخری وقت پر وہ اس کے بے پناہ کرب کو محسوس کرلے۔ اس کا حساس دل اس امر کو گوارا نہ کرے کہ شامیر یوں ٹوٹی پھوٹی حالت میں یہاں سے واپس جائے۔ نگاہیں ڈھونڈتی رہیں۔ جس کو نہیں آنا تھا، وہ نہیں آیا۔

منزلوں پہ آکے لٹتے ہیں دلوں کے کارواں
کشتیاں ساحل پہ اکثر ڈوبتی ہیں پیار کی

شامیر کی آنکھیں خشک تھیں مگر سینے میں جیسے آنسوؤں کا آبشار گر رہا تھا۔ وہ اپنی سامان والی ٹرالی دھکیلتا ہوا ائرپورٹ کی اندرونی حدود میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

شامیر کو جرمنی سے واپس پاکستان آئے دس بارہ روز ہوچکے تھے۔ وہ بہت اداس تھا۔ اس کی امو خالہ اس کی اداسی کی وجہ بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔ انہیں پتا تھا کہ وہ فرینکفرٹ سے ایک بڑا زخم لے کر لوٹا ہے لیکن اس میں کوئی کیا کرسکتا تھا؟ وہاں فرینکفرٹ میں شامیر اور زویا کا تعلق جتنی تیزی اور شدت سے پروان چڑھا تھا، اتنی ہی سرعت سے ختم بھی ہوگیا تھا۔ اس کا آغاز انوکھا تھا اور پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بھی انوکھا تھا۔

شامیر آج پہلے دن آفس گیا تھا۔ فارہ اسکول سے واپس آچکی تھی اور ابھی تک اسکول یونیفارم میں تھی۔ ماں بیٹی مصروفِ گفتگو تھیں۔ فارہ بولی۔ ''لیکن ماما! آپ نے بھی تو کوئی درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ نے بھی شامیر بھائی سے صاف کہہ دیا کہ زویا کو شادی کے بعد یہاں آنا چاہیے۔ ایسا ضروری تو نہیں ہوتا نا کہ لڑکی شادی کے بعد ضرور ہی اپنا گھر بار چھوڑے۔''

امو خالہ نے شفقت سے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''ایسا ضروری ہوتا ہے بیٹا! تب ہی لڑکی پچھلی زندگی کے دکھ سکھ بھول کر نئی زندگی میں قدم رکھنے کے قابل ہوتی ہے اور پھر زویا تو یہاں سے سات سمندر پار بیٹھی تھی۔ وہ شامیر کو اپنے ساتھ لے جاتی تو پھر ہم اس کی صورت دیکھنے کو ترس جاتے۔ وہ اگر شامیر سے سچی محبت کرتی ہے تو پھر اسے کم ازکم اتنی قربانی تو دینی ہی چاہیے تھی۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ اس کی محبت سچی نہیں تھی؟''

''ہوسکتا ہے سچی ہو لیکن سچے جذبے، ثبوت اور قربانی مانگتے ہیں اور یہ تو کوئی ایسی بڑی قربانی بھی نہیں ہے۔ اسے شامیر کی بات مان لینی چاہیے تھی۔''

''کیا شامیر بھائی پھر اسے منانے کی کوشش کریں گے؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ شامیر کی بھی ایک آن ہے، ایک انا ہے اور اس انا کو بری طرح ٹھیس پہنچی ہے۔ زویا کا رویہ بڑا سخت ہے۔ اگر وہ اب اس طرح ہے تو پھر شادی کے بعد اس سے کیا امید رکھی جاسکتی ہے...... کہتے ہیں کہ ہر کام میں اللہ کی کوئی بہتری ہوتی ہے۔'' امو خالہ نے طویل سانس لی۔

''لیکن ماما! شامیر بھائی کب تک یوں اداس پھریں گے۔'' فارہ ٹھنک کر بولی۔ ''نہ خود کہیں باہر نکلتے ہیں، نہ ہمیں لے کر جاتے ہیں۔ نہ ہنستے بولتے ہیں۔ ایک دم بور کردیا ہے انہوں نے۔''

''تو تم اسے بور نہ کرنے دو نا۔ آج شام گھر آئے تو اس کے پیچھے پڑجاؤ۔ کہو کہ گھمانے کے لیے لے جائے تمہیں۔ بلکہ میں بھی چلی جاؤں گی۔ ذرا تفریح ہوجائے گی اور اس کا دل بھی بہل جائے گا۔''

شام کو شامیر گھر آیا تو فارہ واقعی اس کے درپے ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ''شامیر بھائی! آج تو ہر صورت آپ کو جانا ہوگا۔ یوں لگتا ہے کہ آپ کے ساتھ آئس کریم کھائے پورے ایک ہزار سال ہوگئے ہیں۔ شاید فرعون کے دور میں ہم آخری بار اکٹھے گئے تھے۔''

شامیر زبردستی مسکرایا...... ''تم غلط کہہ رہی ہو۔ فرعون کے دور کو زیادہ عرصہ گزر گیا ہے۔ یہ ہزار سال تو کل کی بات ہے۔ میں ہر ہزار پانچ سو سال بعد تمہیں آئس کریم کھلانے نہیں لے جاسکتا۔''

''تو ٹھیک ہے۔ اگلے ڈھائی تین ہزار سال تک میں بھی آپ سے بات نہیں کروں گی۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تم اپنے میٹرک کے امتحان کو بھی وقت کے اسی حساب کتاب کے ساتھ دیکھ رہی ہو۔ اس لیے یوں اڑتی پھرتی ہو۔ خدا کی بندی امتحان آنا فانا سر پر پہنچ جائے گا۔ کچھ کرلو۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔''

اسی دوران میں امو خالہ بھی اندر داخل ہوگئیں۔ شامیر ان کا چہرہ دیکھ کر ہی ان کے دل کی بات جان جایا کرتا تھا۔ وہ بھی یہی چاہ رہی تھیں کہ شامیر آج کہیں گھومنے پھرنے نکلے۔ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بولا۔ ''امو! آپ بھی چلیں گی نا؟''

''میرا بیٹا کہہ رہا ہے تو ضرور چلوں گی۔'' وہ شامیر کے کندھے کو سہلا کر بولیں۔

☆☆☆

شامیر کو جرمنی سے واپس آئے اب تقریباً دو ماہ ہونے والے تھے۔ ان دو ماہ کا ہر ہر پل اس نے جیسے ایک جانکاہ انتظار میں گزارا تھا۔ ہاں آسیں ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتیں۔ اسے پتا تھا کہ زویا کے پاس، فون نمبر موجود ہے۔ اگر وہ چاہتی تو ایک پل میں اس سے رابطہ کرسکتی تھی مگر اس نے نہیں کیا تھا۔ اب ادھر شامیر بھی فیصلہ کرچکا تھا کہ وہ اپنے آپ کو مزید نہیں گرائے گا۔ اس نے جیسے خود سے عہد کرلیا تھا کہ وہ خود زویا سے رابطہ نہیں کرے گا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا...... جس سے محبت ہو اسے کسی پرندے کی طرح آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر وہ واقعی ہمارا ہے، ہمارے پاس پلٹ آئے گا۔ دوسری صورت میں یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ کبھی ہمارا تھا ہی نہیں۔

اسے زویا کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آتیں۔ اس کی ہنسی، اس کا چنچل پن، اس کی گفتگو کا انداز، اس کے گال کا گڑھا۔ اس کا، بلی کی چال چل کر عقب سے آنا اور شامیر کو اپنی بانہوں میں لے لینا۔ کسی وقت اسے بالکل یہی لگتا کہ ابھی قدموں کی مدھم چاپ سنائی دے گی۔ وہ عقب سے آکر اس کے ساتھ لگ جائے گی۔ اس کی گرم خوشبودار سانس اس کے کان سے ٹکرائے گی۔ وہ سرگوشی میں بولے گی اور اس کے نام کا حلیہ بگاڑ کر مخصوص انداز میں کہے گی۔

''شومیر! تم نے کیا سمجھا تھا۔ تم اس طرح روٹھ کر چلے آؤ گے اور وہ سب کچھ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا جو ہمارے درمیان اس ''حسین جولائی'' میں شروع ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے اتنی جلدی کیسے ختم ہوسکتا ہے شومیر۔''

تب اسے اس کی گلابی اردو یاد آتی اور اس اردو میں کہی اس کی دلنشین باتیں۔ آفس سے آکر شامیر اکثر خود کو کمرے میں بند کرلیتا۔ اپنا سیل فون سامنے رکھ کر دیر تک اس کی اسکرین کو گھورتا رہتا۔ ایک چھوٹے سے میسج کی صورت میں یا ایک کال میوزک کی صورت میں یہ اسکرین اسے کتنی بڑی خوشی دے سکتی تھی۔ مگر اب اسکرین نے بھی جیسے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس کی نگاہوں کو کسی بھی خوش کن منظر سے محروم ہی رکھنا ہے۔ کسی وقت وہ سوچتا، کتنی عجیب بات ہے جن لوگوں کے بغیر کسی موقعے پر گھنٹے اور منٹ گزارنا مشکل ہوتا ہے، ان کے بغیر مہینے...... سال...... اور پھر پوری پوری زندگیاں گزارنا پڑ جاتی ہیں۔

امو خالہ اس کی حالت سے آگاہ تھیں...... اور اکثر کڑھتی رہتی تھیں لیکن اس معاملے میں، وہ کیا کرسکتی تھیں۔ کوئی بھی کیا کرسکتا تھا؟ یہ رنج و غم کا ایک ایسا شکنجہ تھا جس سے صرف اور صرف زویا ہی اسے رہائی دلا سکتی تھی۔

انہی دنوں چینل کی دی ہوئی ایک اسٹوری پر کام کرنے کے لیے شامیر کو مری اور ایوبیہ وغیرہ جانا پڑا۔ یہاں بھی زویا کی یادوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ زویا نے پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی خوبصورتی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ فرینکفرٹ میں اس نے دو تین بار ان علاقوں کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ان خوبصورت جگہوں کو دیکھنا چاہتی ہے۔

وہ بولی تھی۔ ''شومیر! میرا ڈل چاہتا کہ ہام اور توم دونوں کسی بیوٹی فل واڈی کے کنارے کھڑے ہوں۔ توم میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے پکارو...... میں توم سے محبت کرتا ہوں۔ توم سے شاڈی بنانا چاہتا ہوں...... پھر تمہاری آواز واڈی میں گونجے۔''

شامیر نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ''پاکستان میں ایسی باتوں کو اتنی اونچی آواز میں نہیں کہا جاتا...... میں کہوں گا تو میری بات کے جواب میں دس پندرہ خان صاحبان ڈنڈے سوٹے لے کر آجائیں گے اور میری مرمت کر ڈالیں گے۔''

''میں کہوں گی کہ توم نے یہ بات میرے لیے کہی تھی۔''

''تب تو وہ اور ماریں گے۔ ان کے غصے میں تھوڑی بہت رقابت بھی شامل ہوجائے گی۔''

''یہ رقابت کیا ہوتا؟''

''یہ ہوتا نہیں...... ہوتی ہے۔ مثلاً اب دیکھو...... تم نے گلے میں یہ گولڈ کی جو چھوٹی سی چین پہن رکھی ہے۔

مجھے اس سے بڑی رقابت محسوس ہو رہی ہے۔ اس پر غصہ آ رہا ہے۔"

"غصہ آ رہا ہے؟ وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ تمہارے بہت قریب ہے۔ اسی کو رقابت کہتے ہیں۔"

اس کے چہرے کا رنگ گلابی ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی شدت سے شامیر کے بازو پر چٹکی کاٹی تھی، پھر دفعتاً موضوع بدلتے ہوئے بولی تھی۔ "میں نے سنا تھا کہ وہاں نتھیا گلی میں ایک بڑا ماؤنٹین ہے۔ اسے دور سے دیکھیں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی بیوٹی فل لڑکی لیٹ کر آسمان کو دیکھ رہا ہے۔"

"وہ پہاڑی نتھیا گلی میں نہیں کہیں بلوچستان میں ہے۔ شاید کوئٹہ کے آس پاس اور یہ بات پرانے دور میں کسی بیوقوف، نکمے انگریز نے کہی تھی۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں، جنہیں بادلوں میں، پہاڑوں میں اور قدرت کے دیگر مظاہر میں بس عورت ہی نظر آتی ہے۔ عرف عام میں یعنی عام زبان میں ایسے لوگوں کو "ٹھرکی" کہا جاتا ہے۔"

"ٹھر...... کی۔ یہ کیا ہوتا ہے؟"

"اب تمہارے ساتھ چلوں گا تو ایک ڈکشنری ساتھ لے لیا کروں گا۔"

"پھر بھی بتاؤ نا... پلیز...... کیا یہ ٹھرے کی کوئی قسم ہوتی؟"

شامیر نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ "سمجھو کہ کسی عورت سے پیار کرنے والے کو یا اس کے پیار کی تلاش میں رہنے والے کو ٹھرکی کہتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد تب شامیر کو ہنسی روکنا مشکل ہو گیا تھا جب زویا نے اپنے نانا کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بڑھاپے میں بھی اپنی بیوی سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے بلکہ سمجھو کہ...... وہ بھی ٹھرکی ہی تھے۔

شامیر کو اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے زویا کی ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آتی رہتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے پرلطف، معصوم جملے۔ وہ ایوبیہ سے واپس لاہور پہنچا تو نیو ایئر کی آمد آمد تھی۔ پتا نہیں کیوں ایک نئی طرح کی آس نے اس کے دل میں جگہ بنانا شروع کر دی۔ عین ممکن تھا کہ نئے سال کے اہم موقعے پر ہی وہ اسے کوئی میسج بھیج دیتی یا کسی طرح گڈ وشز کا اظہار کر دیتی۔ نیو ایئر کے موقع پر وہ دیوانوں کی طرح سارا دن اپنے سیل فون کی طرف متوجہ رہا تھا۔ بہت سے پیغامات آئے لیکن وہ نہیں آیا جس کا اسے انتظار تھا۔ شام کے بعد اسے لگا کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ وہ کھلی ہوا میں سانس لینے کے لیے تڑپنے لگا...... یہ کیسی سزا تھی؟ یہ کیسا کڑا امتحان تھا؟ اس کے اندر بے پناہ مایوسی پھیلنے لگی۔ یہ مایوسی اب اس کی مستقل ساتھی تھی۔ مگر یہ مایوسی اکیلی نہیں تھی، اس کے اندر ایک طرح کا رنج و غم بھی تھا...... اور یہ رنج و غم شامیر کے اندر انا کی دیوار کو بلند کرتا جا رہا تھا...... ٹھیک ہے وہ رابطہ نہیں کرے گی تو میں بھی نہیں کروں گا۔ چاہے ساری زندگی اسی طرح گزر جائے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا...... گھڑی کی سوئیاں حرکت میں رہیں۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے...... تہوار آتے رہے اور جاتے رہے۔ کبھی بہار کا تعاقب گرمیوں نے کیا اور کبھی گلابی سردیوں نے غم کے ماروں کو طویل راتوں کے حوالے کیا۔ کبھی کبھی تو شامیر کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ جی نہیں رہا ایک کڑی سزا بھگت رہا ہے۔ محبت کی غلطی کی پاداش میں ایک بے رحم حاکم نے اسے تپتی ہوئی سنگلاخ زمین پر ننگے پاؤں کھڑا کر دیا ہے۔ اس کے تلوے جھلس رہے ہیں۔ وہ کبھی ایک پاؤں اٹھاتا ہے کبھی دوسرا لیکن یہاں سے بھاگ نہیں سکتا۔ اس سزا سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اس اذیت سے اسے صرف اور صرف ایک شخص ہی رہائی دلا سکتا ہے...... اور یہ وہی ہے جس نے یہ سزا تجویز کی ہے۔ کچھ گم گشتہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور وہ ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے
اسے صحرا میں سایہ پسند نہیں
اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے......

کسی وقت رات کو سوتے میں سچ مچ شامیر کا دم گھٹنے لگتا۔ وہ یکایک جاگ جاتا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہوتا۔ لمبے سانس لیتا اور دل کی دھڑکن کو سنبھالنے کی کوشش کرتا۔ موسم کی پروا کیے بغیر وہ گھر کی چھت پر چلا جاتا۔ تازہ ہوا کو اپنے اندر کھینچنے کی کوشش کرتا۔ چھت پر سے اسے دور تک شہر لاہور کی جھلملاتی روشنیاں نظر آتیں۔ ان روشنیوں کے سلسلے مغربی افق تک چلے جاتے۔ وہ مغربی افق کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہتا۔ ہاں یہی سمت تھی جہاں وہ آباد تھی، جہاں وہ سانس لیتی تھی، ہنستی بولتی تھی۔ شامیر کو ایک کڑی سزا دینے کے بعد وہ اس سزا کو برخاست کرنا بھول گئی تھی، اس کا دم گھٹتا تھا۔

اسی طرح اس جان لیوا گھٹن میں سانس لیتے ہوئے کبھی اپنے جسم کا بوجھ ایک ٹانگ پر اور کبھی دوسری پر منتقل کرتے ہوئے...... اسی طرح اپنے سیل فون کی بے مہر

اسکرین کو دیکھتے ہوئے...... شامیر نے پورے چار سال گزار دیے۔

☆☆☆

عیدالفطر کا موقع تھا۔ ہر طرف خوشی کی ایک لہر سی پھیلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ عید کی نماز پڑھ کر شامیر گھر واپس آیا تو اموخالہ نے اسے گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوما اور ہمیشہ کی طرح سو روپے کا ایک سرخ نوٹ اسے عیدی میں دیا۔ اموخالہ کو سو کے اس نوٹ تک شامیر نے ہی محدود کر رکھا تھا۔ اموخالہ سے یہ سرخ نوٹ وہ بچپن سے وصول کرتا آیا تھا اور اب بھی وہ یہ ''سو'' ہی وصول کرنا چاہتا تھا۔ اپنی سنہری یادوں کو اس طرح سنبھال کر رکھنا شامیر کی پرانی خوشی تھی۔

شامیر کو عیدی دے کر اموکچن کی طرف چلی گئیں جہاں سے فرنی کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ شامیر اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو ادھ کھلے دروازے سے اس کی نگاہ فارہ پر پڑی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی سونے کی ایک زنجیر سے الجھ رہی تھی...... فارہ کی عمر اب سترہ سال تھی۔ وہ فرسٹ ایئر سے سیکنڈ ایئر میں جانے والی تھی...... اس نے اچھا قد کاٹھ نکالا تھا۔ آئینے میں ہی اس نے شامیر کو دیکھا اور زور سے ہانک لگائی۔ ''ادھر آئیں پلیز۔ میری تھوڑی سی مدد کریں۔''

شامیر اس کے پاس چلا گیا، وہ جس چیز سے الجھ رہی تھی وہ اس کا لاکٹ تھا۔ اس کا کلپ اس سے بند نہیں ہو رہا تھا۔ وہ شامیر کی طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی اور بولی۔

''پلیز! ذرا اس کا کلپ بند کر دیں۔''

''یہ اپنے بے ہودہ بالوں کو تو گردن سے ہٹاؤ۔'' شامیر نے کہا۔

وہ اس کی طرف رخ پھیرے بغیر بولی۔ ''آپ انہیں بے ہودہ کہتے ہیں اور سارے کالج میں ان کی تعریف ہوتی ہے...... خیر چھوڑیں اس بات کو بحث لمبی ہو جائے گی۔ آپ بس ذرا یہ کلپ بند فرما دیجیے۔''

اس نے اپنے گھنے بالوں کو سمیٹ کر آگے کی طرف پھینک دیا، تھوڑی سی کوشش کے ساتھ وہ زنجیر کا کھٹکا بند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سنہری زنجیر فارہ کے سینے پر چمک رہی تھی۔ یہ منظر ایک دم شامیر کو ماضی میں لے گیا۔ اسے وہ رقابت والی بات یاد آ گئی جو کبھی زویا سے کہی تھی۔ زویا نے رقابت کا مطلب پوچھا تھا اور شامیر نے کہا تھا۔

''اب اس چین کی مثال ہی لے لو۔ مجھے اس سے رقابت محسوس ہو رہی ہے۔''

''وہ کیوں؟'' زویا نے بھولپن سے دریافت کیا تھا۔

''اس لیے کہ یہ سنہری چین تمہارے بہت قریب ہے......''

ایک دم فارہ کی آواز نے شامیر کو خیال سے چونکایا۔

''کہاں کھو گئے جناب؟'' اس نے پوچھا۔

''کک...... کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔'' وہ گڑبڑا سا گیا۔

فارہ بولی۔ ''آج عید کا روز ہے جی...... کم از کم آج تو نارمل نظر آئیں۔''

''تو کیا میں ایب نارمل ہوں؟''

''نہیں...... لیکن کبھی کبھی لگنے لگتے ہیں...... بات کرتے کرتے کہیں کھو جاتے ہیں۔ آپ کو پتا نہیں چلتا ہوگا لیکن دیکھنے والے کو تو پتا چل جاتا ہے۔''

اس سے پہلے کہ شامیر جواب میں کچھ کہتا، کمرے میں رکھے اس کے سیل فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ یہ اس کے دوست فہد کی کال تھی۔ وہ اسے ریسیو کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسی دوران میں اموفرنی کی پلیٹ لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ''کہاں چلا گیا؟'' انہوں نے فارہ سے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں گئے ہیں، کوئی کال سن رہے ہیں۔''

امو نے عید کے سوٹ میں ملبوس خوبرو فارہ کو تعریفی نظروں سے دیکھا پھر اس سے پوچھا۔ ''شامی کیا کہہ رہا تھا؟''

''وہ تو کچھ نہیں کہہ رہے تھے، میں ہی کہہ رہی تھی۔ اتنا عرصہ گزر گیا پھر بھی، اس اسٹوپڈ لڑکی کو بھولے نہیں ہیں۔ بات کرتے کرتے، اچانک کہیں کھو جاتے ہیں، پتا نہیں کہ یہ اداسی کب ان کا پیچھا چھوڑے گی۔''

''پہلے سے بہت بہتر ہو چکا ہے فارہ...... وقت سے بہتر مرہم کوئی نہیں ہوتا اور یہ مرہم اپنا کام کر رہا ہے۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے وہ ہم نے پوری کرنی ہے۔ خاص طور سے تم اس میں بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہو...... اس سے ہنسا بولا کرو۔ کہیں تفریح وغیرہ کا کوئی پروگرام بنا لیا کرو......''

فارہ چہکی۔ ''ہاں...... تفریح سے یاد آیا، آپ نے کہا تھا کہ عید کے دوسرے روز کہیں سیر کو نکل جائیں گے۔ مری کی طرف۔''

''تو بھئی بنا لو نا... پروگرام۔ روکا کس نے ہے۔

یہاں بھی شہر میں کون سے رشتے دار بھرے پڑے ہیں جن سے ملنا ملانا ہے۔'' اموخالہ نے کہا اور ایک بار پھر تعریفی نظروں سے فارہ کو دیکھا۔

☆☆☆

سخت گرمی ہو اور عید بھی ہو تو مری میں میلا سا لگ جاتا ہے شامیر، فارہ اور اموخالہ کشمیر پوائنٹ کی طرف ایک چھوٹے سے خوبصورت گیسٹ ہاؤس میں موجود تھے۔ یہ گیسٹ ہاؤس اس چینل ہی کی ملکیت تھا جس میں شامیر کام کر رہا تھا۔ رات کو دیر تک جاگنے کی وجہ سے وہ تھکا ہوا تھا اور صبح دس بجے کے باوجود سو رہا تھا۔ اسے جگانے کے لیے فارہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ کبھی اس کی ناک میں تنکا گھماتی، کبھی اس کے کان میں گدگدی کرتی، وہ غنودگی میں بڑبڑایا۔ ''فارہ کی بچی، سونے دے مجھے۔ بس ایک گھنٹا اور۔''

''ایک منٹ بھی اور نہیں۔ ہم یہاں سونے کے لیے نہیں آئے۔ دیکھیں باہر موسم کتنا پیارا ہے۔ دسمبر جیسی میٹھی میٹھی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔'' اس نے پھر شامیر کے ایک کان میں تنکا گھمایا۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ وارننگ دینے والے لہجے میں بولی۔ ''اب بھی آپ نہیں اٹھے نا...تو میں آپ پر ٹھنڈے پانی کا جگ انڈیل دوں گی۔''

شامیر پڑا رہا۔ اسے معلوم تھا وہ صرف دھمکی دے رہی ہے لیکن جب یکا یک اسے اپنے چہرے اور سینے پر ایک سیال خنکی کا احساس ہوا تو اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ بیوقوف نے واقعی جگ اس پر الٹ دیا ہے۔ وہ بھنا کر اٹھا۔ وہ دروازے پر کھڑی ''کھی کھی'' کر رہی تھی۔ شامیر کچھ دیر تک تو حیرت زدہ سا اسے دیکھتا رہا پھر اسے واقعی غصہ آ گیا۔ قریب ہی درمیانے سائز کا واٹر کولر پڑا ہوا تھا۔ یہ آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔ شامیر نے واٹر کولر اٹھایا اور اس کے پیچھے لپکا۔ وہ بھاگ کر امو کے کمرے کی طرف گئی مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ پکاری ''ماما! بچاؤ...... بچاؤ۔''

شامیر اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ وہ باہر گراسی لان کی طرف لپکی۔ شامیر نے اسے گلاب اور ٹیولپ کے پودوں کے قریب دبوچ لیا اور کولر میں بھرا ہوا، چشمے کا پانی اس پر الٹ دیا۔ وہ دو سیکنڈ میں سرتاپا بھیگ گئی۔ کولر میں کچھ پانی ابھی باقی تھا۔ وہ زور لگانے لگی کہ باقی پانی شامیر پر الٹے۔ مگر شامیر نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اس دھینگا مشتی کے دوران میں اچانک...... شامیر کو احساس ہوا کہ وہ اب کوئی بچی نہیں رہی۔ ایک بھرپور جوان لڑکی ہے۔ اس نے یکلخت اسے چھوڑ دیا اور اپنے ہاتھ اس سے ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گرمیوں کے مہین لباس میں تھی، اس کے مکمل طور پر بھیگے سراپا نے شامیر کو نگاہیں پھیرنے پر مجبور کر دیا۔ اسی دوران میں اموخالہ بھی کمرے سے نکل آئیں۔ واٹر کولر اب فارہ کے ہاتھ میں تھا۔ شاید وہ بچا کھچا پانی شامیر پر الٹ دیتی مگر والدہ کو دیکھ کر رک گئی، پھر تکرار شروع ہو گئی۔ وہی تو، تو میں، میں...... پہل کس نے کی۔ زیادتی کس کی طرف سے ہوئی...... وغیرہ وغیرہ۔ اموخالہ پیار سے ان دونوں کو دیکھتی رہیں...... اور گا ہے لگا ہے فارہ کو تھوڑی بہت ڈانٹ بھی پلاتی رہیں۔

''بچوں جیسی حرکتیں چھوڑ دو فارہ! اب بڑی ہو گئی ہو۔'' انہوں نے کہا۔

''میں تو کہتا ہوں امو کہ اس کی شادی کر دیں...... کام نبٹائیں اس کا۔''

''مجھے شادی وادی کا کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ پہلے آپ کی شادی ہونی ہے پھر میری ہونی ہے اور آپ جناب کے ہاتھ پیلے ہونے کے ابھی دور دور تک کوئی آثار نہیں ہیں۔'' فارہ نے شامیر پر چوٹ کی۔

اگلے روز جاگنگ ٹریک پر جانے کا پروگرام تھا۔ امو خالہ نے بھی مقدور بھر شرکت کرنا تھی مگر عین موقع پر انہوں نے طبیعت کی کسلمندی کا کہہ کر صاف انکار کر دیا۔ شامیر کو فارہ کے ساتھ اکیلے جانا پڑا۔ وہ دونوں صبح نو بجے کے لگ بھگ نکل گئے۔ گھنے جنگل نما علاقے سے گزرتا ہوا یہ بڑا شاندار ٹریک تھا۔ یہ سوموار کا روز تھا شاید اسی وجہ سے ٹریک پر اکا دکا لوگ ہی نظر آتے تھے۔ وہ تصویریں اتارتے اور باتیں کرتے کافی آگے نکل گئے۔ انہوں نے وہیں پر لنچ بھی کیا اور لنچ کے فوراً بعد واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ فارہ ہمیشہ کی طرح چہک رہی تھی اور شامیر اس کی چہکاروں کا حتی المقدور جواب دے رہا تھا۔ وہ آدھے راستے میں تھے جب ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آ گیا۔ درخت کے ایک گرے ہوئے تنے کو فارہ نے پھلانگ کر گزرنے کی کوشش کی اور اس کا پاؤں بری طرح مڑ گیا۔ وہ بلند آواز میں کراہ کر رہ گئی۔ تکلیف کی شدت سے اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ شامیر نے جلدی سے اس کا جوگر اتارا۔ ٹخنے کے قریب سوزش نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یہ موچ کی نشانی تھی۔ ''بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'' وہ شامیر کے شانے سے

سر رگڑتے ہوئے بولی۔

''اٹھو اور آہستہ آہستہ چلنے کی کوشش کرو۔ پاؤں گرم رہے گا تو زیادہ پین نہیں ہوگا۔'' شامیر نے اس کے پاؤں پر اپنا مفلر باندھتے ہوئے کہا۔

وہ پہلے تو انکار کرتی رہی پھر شامیر کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شامیر اسے آہستہ آہستہ چلاتا رہا۔ ٹریک پر درمیانی عمر کا صرف ایک جوڑا نظر آرہا تھا...... دونوں شاید میاں بیوی تھے۔ مڑ مڑ کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ بھی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ چالیس پچاس قدم چلنے کے بعد فارہ پھر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ ''مجھ سے نہیں چلا جاتا۔'' وہ روہانسی ہوکر بولی۔ ''آپ فون کر کے کوئی جیپ وغیرہ منگوالیں۔''

''جیپ یہاں نہیں آسکے گی بھئی۔''

''گھوڑا تو آسکتا ہے؟''

''گھوڑوں والوں کے پاس موبائل فون کہاں ہوتے ہیں اور اگر ہوں بھی تو میں ان سے کیسے رابطہ کروں...... چلو...... اٹھو شاباش...... ہمت کرو۔ تھوڑا سا چلو گی تو پاؤں رواں ہوجائے گا۔ کچھ آگے جاکر شاید کسی گاڑی کا انتظام بھی ہوجائے۔''

''نہیں اب نہیں چلا جاتا۔'' وہ ٹھنک کر بولی۔

''دیکھو سائے لمبے ہورہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ راستے میں ہی شام ہوجائے چلو اٹھ جاؤ۔''

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ شامیر نے گہری سانس لے کر دائیں بائیں دیکھا۔ پھر جھک کر اسے گود میں اٹھالیا۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا...... اپنا ایک جوگر اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنا دایاں بازو شامیر کے کندھے پر رکھ دیا اور اپنا سر اس کے سینے پر ڈال دیا۔ وہ اسے اسی طرح اٹھائے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ وہ اس کے ساتھ جیسے پیوست سی ہوگئی تھی۔ پھر شامیر کو اپنے کھلے ہوئے گریبان کے قریب اس کے سانسوں کی حرارت محسوس ہوئی۔ اس کی ناک شامیر کے سینے کے بالوں سے رگڑ کھا رہی تھی۔ وہ جیسے کہیں گم سی ہوگئی تھی۔ اس کا انداز ٹھٹکا دینے والا تھا۔ ان لمحوں میں وہ شاید اپنی تکلیف کو بھی بھول گئی تھی۔

فارہ کے رویے میں کئی تبدیلیاں تو وہ پچھلے تقریباً ایک سال سے محسوس کر رہا تھا۔ مثلاً وہ خود کو گھر میں کافی سنوار کر رکھتی تھی۔ اس نے اسے بھائی جان کہنا بھی بتدریج ختم کر دیا تھا۔ ایک خاص قسم کی شوخی اس کے لہجے میں جھلک دکھانے لگی تھی...... مگر اس وقت جو کچھ شامیر نے محسوس کیا تھا وہ کافی واضح بلکہ واشگاف تھا۔

''فارہ! میرا خیال ہے تم کوشش کرو تو چل سکو گی۔''

اس نے اس کے سینے میں سر چھپائے چھپائے، نفی میں ہلا دیا۔

وہ بولا۔ ''میں تھک گیا ہوں بھئی اور نہیں چلا جا رہا۔'' اس نے اسے زبردستی نیچے گھاس پر اتار دیا۔

فارہ کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس نے مفلر کھول کر دیکھا۔ پاؤں کی سوزش کچھ بڑھ گئی تھی۔ شامیر کی گود سے اترنے کے بعد اس نے ایک بار پھر ''اُف...... ہائے'' کی گردان شروع کر دی۔ کچھ دیر سانس لینے کے بعد شامیر نے اسے پھر اٹھالیا۔ اس بار وہ زیادہ بے تکلفی اور سہولت کے ساتھ شامیر کے سینے سے پیوست ہوگئی۔

شامیر کے اندر ایک عجیب سی بے چین کر دینے والی کھلبلی تھی، درحقیقت زویا کی جدائی نے اس کی زندگی کی کتاب میں سے رومانس والا صفحہ ہی پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ فارہ تو دور کی بات ہے۔ اس نے پچھلے تین چار برسوں میں کسی لڑکی کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ فارہ اور اس کی عمر میں تقریباً دس سال کا فرق تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ اسے بڑے بھائی کا درجہ دیتی تھی لیکن اب لگتا تھا کہ اس کی سوچیں کسی اور سانچے میں ڈھل گئی ہیں۔ اس کے ماتھے پر پسینا آنے لگا۔ وہ سوچنے لگا امو خالہ کو اس انہونی تبدیلی کا علم ہوا تو ان کا ردعمل کیا ہوگا؟ اسے کیا علم تھا کہ اس کی پیاری امو خالہ کو اس تبدیلی کا علم ہے۔ نہ صرف علم ہے بلکہ یہ سب کچھ ان کے ایما پر ہی ہو رہا ہے...... اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ لوگ مری سے واپس لاہور آچکے تھے۔ شامیر دفتر گیا ہوا تھا۔ فارہ ابھی کالج سے لوٹی نہیں تھی۔ امو خالہ مضطرب سی صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ابھی ابھی راولپنڈی سے ان کی بڑی بیٹی شمائلہ کا فون آیا تھا۔ وہ اپنے سسرال میں خوش نہیں تھی۔ شادی کو تین سال ہوچکے تھے۔ ایک بچے کی ماں ہونے کے باوجود وہ ابھی تک سسرال میں قدم نہیں جما سکی تھی۔ شوہر ذیشان کے ساتھ اکثر اس کا جھگڑا رہتا تھا۔ ایک دو بار اس نے شمائلہ پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔ اب بھی ایک ایسے ہی جھگڑے کی خبر شمائلہ نے بذریعہ فون ماں کو سنائی تھی۔ امو خالہ سسرال میں شمائلہ کی پریشانی کی خبر جب بھی سنتی تھیں انہیں شمائلہ کے شوہر سے زیادہ غصہ اس شخص پر آتا تھا جس کے سبب شمائلہ کو اس گھر میں جانا پڑا تھا اور وہ شخص

کون تھا؟ وہ شامیر کا والد کمال احمد تھا۔ امو خالہ کی شدید خواہش رہی تھی کہ اس کی بڑی بیٹی شمائلہ کی شادی شامیر سے ہوجائے لیکن کمال احمد اس شادی کے راستے میں اس طرح دیوار بنا تھا کہ وہ سب سر پھوڑ کر رہ گئے تھے۔ اس کا سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ شمائلہ، شامیر سے کم پڑھی لکھی ہے اور قد کاٹھ کے لحاظ سے بھی ان دونوں کا جوڑ نہیں بنتا۔ شمائلہ کا قد قدرے چھوٹا تھا اور شامیر چھ فٹ سے ایک دو سینٹی میٹر زیادہ ہی تھا۔ بہرحال امو خالہ جانتی تھیں کہ یہ سب ڈھکوسلے ہی تھے۔ کمال احمد نے اس کی بیٹی نہیں لینی تھی اور اس نے نہیں لی تھی۔ امو کی بہن یعنی شامیر کی ماں آسیہ نے بھی بہت کوشش کی تھی مگر ناکام ہوئی تھی۔ اب کمال احمد اور آسیہ دونوں اس دنیا میں نہیں تھے۔ شمائلہ کی شادی ہوئے بھی پانچ سال ہوچکے تھے لیکن امو خالہ ثمینہ کے دل میں جو گرہ لگ چکی تھی وہ کسی صورت کھلنے میں نہیں آتی تھی۔ انہوں نے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ شامیر کو اپنا داماد بنا کر رہیں گی۔

فارہ اور شامیر کی عمروں میں نو دس سال کا فرق تھا، یہ اس سے بہت زیادہ بھی ہوتا تو وہ اپنے ارادے سے پیچھے ہٹنے والی نہیں تھیں۔ انہوں نے شامیر کو ہمیشہ محبت کی نظر سے دیکھا تھا اور یہ محبت ایک بھانجے کے لیے نہیں، ایک داماد کے لیے تھی۔ اگر وہ ان کا داماد نہیں تھا تو پھر کچھ بھی نہیں تھا۔

شاید وہ ایک بار پھر چھ سات سال پہلے کی ان تلخ یادوں میں کھو جاتیں جب ابھی کمال احمد اور آسیہ زندہ تھے اور شمائلہ اور شامیر کی شادی کی بات چلی تھی...... مگر اس دوران میں ڈور بیل ہوئی۔ امو خالہ نے دروازہ کھولا۔ فارہ کالج سے لوٹ آئی تھی۔ حدت سے اس کا رنگ شہابی ہورہا تھا۔ امو نے اس کا ماتھا چوما اور بولیں۔ ”وین سے اتر کر تمہیں آدھا کلومیٹر پیدل چلنا پڑتا ہے۔ گرمی بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ میں شامیر سے کہوں گی کہ واپسی پر وہ تمہیں چھوڑ دیا کرے۔ تب اس کا بھی تو لنچ ٹائم ہوتا ہے۔“

”اتنی آسانی سے نہیں مانیں گے وہ۔ سو عذر پیش کریں گے۔“ وہ اپنا شولڈر بیگ ایک طرف پھینکتے ہوئے بولی۔

”میری بات نہیں ٹالتا وہ...... اور نہ کبھی ٹالے گا۔ بس تم خوامخواہ اس سے چونچ نہ لڑایا کرو۔ زیادہ بحث کئی دفعہ مرد کو ہتھے سے اکھاڑ دیتی ہے۔“

فارہ منہ دبا کر ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے آگے کو جھک گئی۔

”اب کس بات پر ہنسی چھوٹ رہی ہے۔“ امو نے پوچھا۔

”چونچ لڑانے والی بات پر۔“ فارہ نے کہا اور بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

”بے شرم کہیں کی۔“ امو نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

کچھ دیر میں فارہ کچن میں سے پانی پی کر واپس آگئی۔ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ”ویسے امو! آپ ان کو کچھ زیادہ ہی سر پر چڑھاتی جارہی ہیں۔ بہت نخرے دکھانے لگے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے بڑا غصہ آتا ہے ان پر۔“

”وہ کیوں؟“

”اب دیکھیں نا...... اتنا لمبا ٹائم گزر گیا ہے وہ زویا والی بات کو...... پھر بھی اسے پوری طرح بھولے نہیں ہیں۔ اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا اور یہ اب بھی بیٹھے بیٹھے گم ہوجاتے ہیں کہیں۔ میں ان کے چہرے پر سب کچھ لکھا ہوا پڑھ لیتی ہوں۔“

امو نے کہا۔ ”پہلے سے بہت فرق پڑ گیا ہے فارہ...... جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے وہ بھی وقت کے ساتھ نکل جائے گی۔ دیکھنا اس نے اتنا پیار کرنا ہے تجھ سے کہ تو حیران رہ جائے گی۔“

”مجھے تو نہیں لگتا...... وہ کیا مثال دیتے ہیں کسی جانور کی ٹیڑھی دم والی۔“ وہ جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے بولی۔

”اچھا زیادہ زبان مت چلایا کرو۔ شام کو اس کے کپڑے استری کر دینا اور بڑے سلیقے سے ہینگروں میں لگا دینا۔ اسے کل شاید کراچی جانا ہے دو تین روز کے لیے۔“

کام کے ذکر پر فارہ نے تھوڑی سی ناک چڑھائی مگر کچھ بولی نہیں۔

☆☆☆

کراچی میں شامیر کو ہاکی کے ایک سابق کھلاڑی اور کوچ کا انٹرویو کرنا تھا۔ پورا ڈیڑھ دن تو بندے کو ڈھونڈنے میں ہی لگ گیا۔ بہرحال کام مکمل کر کے وہ آج رات ہی واپس آیا تھا اور... خود کو کافی تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ بیڈ پر جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ چینل کے کرتا دھرتا عظمت صاحب کا فون آگیا۔

”جی سر!“ شامیر نے مستعد ہو کر کہا۔

”لو بھئی! تمہیں پھر جانا پڑے گا۔“

”کراچی؟“ اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

”نہیں کراچی سے تھوڑا آگے......“

”کراچی سے آگے تو پھر سمندر ہے جناب۔“ وہ ذرا بے تکلفی سے بولا۔

”سمندر سے بھی تھوڑا آگے...... تمہیں آسٹریا جانا

ہوگا۔ وہاں ویانا میں کچھ کام ہے۔''
''کام؟''
''ایک بڑے سرکاری افسر نے گورنمنٹ کے کھاتے سے اپنے برادر نسبتی کا علاج کروایا ہے وہاں۔ اس وی آئی پی علاج پر ڈیڑھ دو کروڑ روپیہ قومی خزانے سے خرچ ہوا ہے کافی ثبوت تو مل چکے ہیں، باقی تم موقع پر جا کر دیکھ لو۔ اچھی خاصی ''ایکسکلیوسو'' اسٹوری بن جائے گی۔''
آسٹریا کے نام پر شامیر رکا یک ٹھٹک سا گیا۔ ایک طویل عرصے بعد عظمت سلطان صاحب ایک بار پھر اسے یورپ بھیجنے کی بات کر رہے تھے...... وہی یورپ جہاں سے وہ ایک بہت گہرا زخم لے کر لوٹا تھا۔ وہ اب دوبارہ ادھر کا رخ کرنا نہیں چاہتا تھا، کسی صورت نہیں۔ اسے یوں لگا کہ اگر اس نے عظمت صاحب کی بات مان لی تو اس کا گہرا زخم بری طرح کرید ا جائے گا اور بے تحاشا خون اگلنے لگے گا۔
''کس سوچ میں کھو گئے؟'' عظمت صاحب کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔
''کک...... کچھ نہیں سر! لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو...... لمبے سفر پر مجھے نہ ہی بھیجیں تو اچھا ہے۔ خالہ کی طبیعت بھی آج کل کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں ان کی دیکھ بھال مشکل ہو جائے گی اور......''
''بھئی یہ کام تو تم ہی کو کرنا ہے۔'' عظمت صاحب نے ٹھہری ہوئی آواز میں اس کی بات کاٹی۔ ''لیکن زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تمہیں۔ تم نے فوری روانہ نہیں ہونا۔ دو تین ہفتے کا ٹائم ابھی ہے ہمارے پاس۔ اس دوران میں انشاءاللہ تمہاری خالہ بہتر ہو جائیں گی۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا بھی تو اس کا حل میں نکال لوں گا۔''
اس بارے میں عظمت سلطان صاحب سے شامیر کی تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور وہ سمجھ گیا کہ یہ کام عظمت صاحب بہر صورت اسی سے کرانا چاہتے ہیں۔ ایک اور بندہ تو اس کام کے لیے ان کے پاس موجود تھا مگر وہ شامیر پر ہی بھروسا کر رہے تھے۔ غالباً چار سال پہلے کی وہ رپورٹ بھی ان کے ذہن میں تھی جسے شامیر نے ہی جرمنی پہنچ کر پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ وہ ڈرامائی سچویشن بھی ان کے ذہن پر نقش ہو چکی تھی جب شامیر نے ایک فوٹو گراف میں نظر آنے والے شیڈو سے ایک اہم سراغ تک رسائی حاصل کی تھی۔ وہ اکثر محافل میں شامیر کی خداداد صلاحیتوں کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔
عظمت سلطان صاحب سے بات کرنے کے بعد وقتی طور پر شامیر کی نیند اڑ گئی۔ وہ بیقرار سا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک درد تو پہلے ہی دل میں پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ اب ایک اور طرح کا میٹھا میٹھا درد بھی شروع ہو گیا تھا۔ اس درد کا تعلق بھی اس بے وفا کے خیالوں سے ہی تھا۔ سنگدلی سی سنگدلی تھی کہ پچھلے چار سالوں میں اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، رابطہ کرنا اور ایک دوسرے کے بارے میں جاننا کتنا آسان تھا مگر انا کی بلند و بالا دیوار نے اسے ناممکن بنا دیا تھا اور یہ دیوار شاید زویا کی طرف زیادہ بلند تھی۔ وہ کسی بند کمرے میں بیٹھ کر اپنے موبائل فون پر اسکائپ یا واٹس ایپ کا صرف ایک بٹن دبا کر اس سے رابطہ کر سکتی تھی۔ اپنی انگلی کو بس ایک ذرا سی حرکت دے کر وہ درمیان میں حائل پہاڑوں، سمندروں اور ویرانوں کی طویل مسافتوں کو پھلانگ سکتی تھی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ عورت نے کوئی راہ نکالنی ہو تو ہزار مشکلات کے باوجود نکال لیتی ہے اور اگر نہ نکالنی ہو تو پھر ایک قدم کی مسافت بھی تاعمر طے نہیں کرتی۔
وہ کہاں ہوگی؟ کیا کرتی ہوگی؟ کیا سوچتی ہوگی؟ ایسے ان گنت سوال شامیر کے ذہن میں کلبلانے لگے۔
پتا نہیں کیوں، یہ اس کے دل کی گواہی تھی کہ بے شک سارے ناتے ختم ہو چکے لیکن ناتے کا کوئی ایک تار کوئی ایک دھاگا اب بھی باقی ہے۔ یہ نہیں ٹوٹا...... اور یہ نہیں ٹوٹے گا اور کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ ایک تار...... یہ ایک دھاگا...... فولادی زنجیروں اور سخت ترین بندشوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ جس طرح اس مہین سے تار نے اس کی پوری ہستی کو لپیٹ رکھا ہے، اسی طرح زویا کی ہستی کو بھی لپیٹ رکھا ہوگا۔ معلوم نہیں کیوں شامیر کے اندر ایک وجدانی یقین سا تھا کہ زویا نے شادی نہیں کی ہوگی۔ اپنے اس یقین کی کوئی ظاہری وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر وہ اس یقین کو کسی بھی طرح رد نہیں کر پاتا تھا۔ پچھلے تقریباً چار سال اس نے زویا کے حوالے سے مکمل بے خبری میں ہی گزارے تھے۔ باس عظمت صاحب کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ چار سال پہلے شامیر کے جرمنی سے لوٹنے کے چند ہی ہفتوں بعد زویا نے چینل کی پارٹ ٹائم جاب چھوڑ دی تھی۔
یہ سب باتیں سوچتے سوچتے شامیر کو یوں لگا کہ اگر وہ پھر یورپ گیا تو شاید...... شاید خود کو جرمنی جانے سے باز نہ رکھ سکے اور اب وہ سبک سر ہو کر دوبارہ وہاں کا رخ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اس میں اپنے جذبے کی توہین و تحقیر محسوس

ہوتی تھی۔ اسے زویا سے ہمیشہ کی جدائی تو قبول تھی مگر محبت کا شرمسار ہونا گوارا نہیں تھا۔ اس نے سوچا وہ ایک بار پھر عظمت صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ اس کی جگہ کسی دوسرے کو یہ ٹاسک دے دیں۔

ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ جو نئے واقعات شامیر کی زندگی میں آنے والے تھے انہیں ہر صورت آنا ہی آنا تھا۔ ہوا کا تیز رخ اس کی کشتی کے بادبانوں کو ایک ان چاہی لیکن جانی پہچانی سمت میں دھکیل رہا تھا اور کسی وقت اسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ صرف ہوا کی تندی ہی نہیں ہے...... جو اسے دھکیل رہی ہے بلکہ ایک ان دیکھی ڈور بھی ہے جو اسے کھینچ رہی ہے۔ شاید وہی بے نام سا ناتا جو سارے ناتے ٹوٹنے کے باوجود ابھی تک ٹوٹا نہیں۔ شاید وہی کچا دھاگا جس نے اب تک اپنا وجود برقرار رکھا ہوا ہے۔ جو کہنے کو تو کچا ہے لیکن کچا ہے نہیں۔ شامیر کی کوشش کے باوجود عظمت سلطان صاحب کا یہ اصرار برقرار رہا کہ رپورٹ کی تکمیل کے لیے ویانا وہی جائے گا۔ انہوں نے صرف اتنی رعایت کی کہ اسے ایک دو ہفتے مزید دے دیے۔

شامیر عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا۔ اس کو وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس کیفیت میں شوق اور خوف، گریز اور چاہت، بیزاری اور طلب ایک ساتھ شامل تھے۔

☆☆☆

شامیر کو شملہ کی مرچ والا چکن کا قیمہ بہت پسند تھا۔ اموخالہ اس کی پسند و ناپسند کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ آج بھی انہوں نے یہی بنایا تھا۔ اکثر اوقات وہ کوئی ایسی ڈش خود ہی تیار کر لیتی تھیں اور بس فائنل ٹچ کے لیے فارہ کو بلا لیتی تھیں یوں وہ ڈش ''فارہ کی پکائی ہوئی ڈش'' بن جاتی تھی۔ اب بھی کوکنگ کے آخری مرحلے کے لیے وہ فارہ کو آواز دینے کا ارادہ کر رہی تھیں کہ وہ خود ہی آدھمکی۔

''امو! کچھ سنا آپ نے؟ آپ کے لاڈلے یورپ جا رہے ہیں اپنے کسی کام سے۔ مہینا ڈیڑھ مہینا وہاں رہیں گے۔''

''کب جانا ہے؟'' امو نے چونک کر پوچھا۔

''اگلے مہینے...... آسٹریا جائیں گے۔ کوئی رپورٹ شپورٹ تیار کرنی ہے۔''

یکایک امو خالہ کے چہرے کے تاثرات بدلے۔ آنکھوں میں پریشانی نظر آئی۔ ''یہ آسٹریا کہاں ہے بھئی؟'' انہوں نے چولہا بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہی تو میں آپ کو بتانے لگی تھی۔'' فارہ رازداری کے لہجے میں بولی۔ ''یہ آسٹریا ہے جی بالکل جرمنی کے پاس۔ ٹرین میں بیٹھو اور ''ٹھک'' سے جرمنی پہنچ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ...... آپ کے ان لاڈلے صاحب کا پرانا سوکھا ہوا عشق پھر سے ہرا ہو جائے اور یہ جا پہنچیں فرینکفرٹ۔''

امو خالہ چہرے پر تشویش لے کر گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ کچھ دیر بعد کہنے لگیں۔ ''فارہ! ویسے تو شامی نے اب بھی بھول کر بھی اس کا نام نہیں لیا۔ فون پر رابطے کرنے اب کتنے آسان ہیں لیکن پچھلے ساڑھے تین چار برسوں میں ان دونوں کے درمیان کبھی رابطہ بھی نہیں ہوا۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب وہ باسی کڑھی میں ابالا دے گا...... اور اس کی طرف پلٹے گا۔''

''مگر امو اندیشہ تو اپنی جگہ موجود ہے نا...؟''

''ہاں وہ تو موجود ہے۔'' انہوں نے اوپر نیچے سر ہلایا۔

ماں بیٹی کے درمیان اس ''تشویشناک'' موضوع پر دس پندرہ منٹ گفتگو ہوئی۔

اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ اگر ایک مہینے بعد واقعی شامیر کو آسٹریا جانا پڑتا ہے تو پھر فارہ اور امو بھی ساتھ جائیں گی۔ آسٹریا میں ویانا کے بالکل پاس ہی امو کی ایک کزن اپنے شوہر کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ انہوں نے کئی بار فارہ اور امو سے کہا تھا کہ وہ ان کے پاس آئیں۔ وقتاً فوقتاً اسکائپ پر بھی ان سے بات ہوتی رہتی تھی۔

☆☆☆

ایک ماہ گزرتے ہوئے کچھ پتا نہیں چلا تھا اور اب شامیر ایک بار پھر یورپ میں تھا۔ یورپ میں اس کی یہ آمد تقریباً چار سال بعد ہوئی تھی۔ وہ ویانا میں اترا تھا۔ سارے بھولے بسرے مناظر ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ اموخالہ اور فارہ بھی اس کے ساتھ تھیں۔ شامیر نے بہت کوشش کی تھی کہ ان دونوں کے ساتھ وہ یورپ کا سیاحتی ٹور پھر کبھی لگا لے گا مگر پتا نہیں کیوں فارہ نے ضد پکڑ لی تھی۔ بہرحال اب وہ تینوں ہوٹل کے بجائے اس گھر میں قیام پذیر ہوئے تھے جہاں اموخالہ کی کزن اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ رہتی تھیں۔ ویانا کے پاس ہی یہ ایک ''اسٹریٹ پولیٹن'' نامی قصبہ تھا۔

ویانا میں حسب عادت شامیر نے اپنا کام تیزی سے نمٹایا تھا...... آخری مرحلے میں اسے ایک بار سرحد پار کر کے جرمنی کے شہر ''میونخ'' میں بھی جانا پڑا۔ میونخ سے فرینکفرٹ کا فاصلہ بمشکل 300 کلومیٹر کے لگ بھگ تھا۔

اس کے باوجود اس نے فرینکفرٹ کی طرف رخ نہیں کیا اور جرمنی کے شہر ''میونخ'' میں اپنا کام نمٹا کر شام کو ہی بذریعہ ٹرین ویانا واپس آ گیا۔

بہر طور یہ بات وہ اچھی طرح محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ فرینکفرٹ جائے بغیر شاید رہ نہیں سکے گا۔ اس ''شہر محبت'' کے اتنا قریب آ کر وہ اسے دیکھے نہ، یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ نادیدہ ڈور کا کھچاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس شہر کے درودیوار اسے بلا رہے تھے...... اور وہ چہرہ بھی جو پچھلے کئی برسوں سے مکمل بے خبری کے اندھیرے میں گم تھا۔ ایک بے پناہ تجسس تھا اور ایک دکھ آمیز جستجو تھی جو ہر لمحے اس کے اندر شدید تر ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ پتا نہیں کیوں اس کا یہ یقین بھی پختہ ہوتا چلا جا رہا تھا کہ وہ آج بھی اس سے پیار کرتی ہے، وہ آج بھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی......

ایک سرمئی سی صبح کو شامیر کے قدم جیسے بے ساختہ مرکزی ریلوے اسٹیشن کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ اس کے پاس ''شینجین ویزا'' تھا۔ وہ آسٹریا سے جرمنی میں ایسے ہی داخل ہو سکتا تھا جیسے پاکستان میں ایک شہر سے دوسرے میں جایا جاتا ہے۔ وہ اموخالہ سے کچھ بھی چھپاتا نہیں تھا مگر اس خیال سے کہ وہ خوامخواہ پریشان نہ ہوں اس نے انہیں اور فارہ کو یہی بتایا تھا کہ وہ رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں ہی دوبارہ میونخ جا رہا ہے۔

شام چھ بجے کے قریب وہ پھر سے فرینکفرٹ میں تھا۔ ٹرین پر سوار وہ کامرس بینک کی اس 56 منزلہ عمارت کے پاس سے گزرا جس کی چھت پر .... ایک اہم ترین لمحہ اس کی زندگی میں وارد ہوا تھا۔ وہ ہوا کے مقابل کھڑی تھی۔ اپنا ہیئر کلپ دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے جھومتے بالوں کو باندھ رہی تھی...... اور شامیر پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا تھا کہ وہ اس لڑکی کو آج سے نہیں صدیوں سے جانتا ہے۔ اس کی محبت میں گرفتار ہے۔

ایک طویل سرد آہ شامیر کے سینے سے خارج ہوئی اور پھر قریباً چار برس بعد پہلی بار اس نے اپنے سیل فون پر زویا کا نمبر پریس کیا۔ کتنا آسان تھا یہ کام، کتنا مشکل ہو گیا تھا اور اب پھر...... آسان لگنے لگا تھا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اگلے چند سیکنڈ میں زویا کی آواز سن سکتا۔ پھر ایک دم جیسے دھڑکنیں تھم گئیں۔ ایک دودھیا روشنی سی اس کے اندر بجھ گئی۔ آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ''اس نمبر سے رابطہ ممکن نہیں ہے۔''

اتفاقاً اس دوسری لڑکی جین کا نمبر بھی شامیر کے فون میں محفوظ تھا جو زویا والی بلڈنگ میں ہی رہتی تھی اور ایک رات کے لیے اس نے زویا اور شامیر کے ساتھ زویا کے کمرے میں قیام کیا تھا۔ شامیر نے دھڑکتے دل کے ساتھ یہ دوسرا نمبر ٹرائی کیا...... مگر یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ یہ نمبر بھی اب کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ پچھلے برسوں میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔ ٹرین میں بیٹھے بیٹھے اس نے دونوں نمبرز پر کئی بار کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

وہ اسی جانے پہچانے اسٹاپ پر اترا جہاں پچھلی آمد کے موقع پر زویا کے ساتھ اترا تھا۔ یہاں سے زویا کا فلیٹ قریباً ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر رہا ہوگا۔ سب کچھ اسی طرح تھا۔ ڈرائی کلینر کی شاپ...... چھوٹا سا ترک ریستوران...... ایک میڈیکل اسٹور...... چھوٹے بڑے صاف ستھرے شوروم...... وہ اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھتا رہا...... اور پھر زینے طے کر کے زویا کے فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔

کال بیل پر جو شخص باہر آیا اسے شامیر نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ نیکر اور بنیان میں ملبوس اس ادھیڑ عمر برٹش نے یہاں موجود کسی بھی زویا نامی لڑکی سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا اور قدرے بے رخی سے دروازہ بند کر دیا۔ شامیر نے اس فرسٹ فلور پر ہی پندرہ بیس قدم کا فاصلہ طے کیا اور اس دوسرے فلیٹ پر پہنچا جہاں دراز قد جین ایک ساؤتھ افریقن لڑکی کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ یہاں بھی ایک اجنبی نسوانی چہرے سے ملاقات ہوئی۔ یہ ایک جواں سال جرمن خاتون تھی اور انگلش روانی سے بولتی تھی۔ اس نے شامیر کی بات تحمل سے سنی اور جوابات بھی دیے۔

خلاصہ یہاں بھی وہی تھا...... پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ اس بلڈنگ میں اب کوئی جین رہتی تھی اور نہ زویا۔ جرمن خاتون نے مزید مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم تفصیل سے جاننا چاہتے ہو تو پھر بلڈنگ کے اونر مسٹر فلیچر سے ملاقات کر لو۔ عین ممکن ہے کہ انہیں کچھ پتا ہو۔''

''مسٹر فلیچر کہاں ملیں گے؟'' شامیر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہ آج کل گراؤنڈ فلور میں رہ رہے ہیں لیکن کسی کام سے آؤٹ آف سٹی ہیں۔ دو روز بعد ان سے ملاقات ہو سکے گی۔''

شامیر نے مسٹر فلیچر کا فون نمبر وغیرہ پوچھا مگر جواں

سال خاتون نے نمبر نہیں دیا یا پھر واقعی اسے معلوم نہیں تھا۔

شامیر نے اگلے دو روز اسی کوچے کی سیاحی میں گزارے۔ یہ سڑک، یہ عمارت اور ارد گرد کا سارا علاقہ اس کے لیے جیسے ایک دلکش ''مونومینٹ'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس گرد و پیش سے اس کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ یہاں کی ہوا، یہاں کی خوشبو، یہاں کے رنگ ڈھنگ...... سب کچھ جیسے شامیر کے حافظے پر نقش ہو چکا تھا۔ زویا یہاں نہیں تھی لیکن وہ ہر منظر میں نظر آ رہی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً زویا اور جین کے نمبروں پر کال بھی کر رہا تھا مگر جواب ایک ہی تھا...... رابطہ ممکن نہیں۔ انا کی دیوار تو یورپ میں داخل ہوتے ہی لرزہ براندام ہو گئی تھی۔ اب وہ گری تھی اور مزید گرتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا، وہ جو اس کی زندگی میں اہم ترین حیثیت اختیار کر چکی ہے...... کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟

وہ زویا کے فلیٹ کے قریب ہی ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ امو خالہ کا فون ہر پانچ چھ گھنٹے بعد آ جاتا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ شامیر کا ابھی کتنا کام باقی ہے۔ وہ اس کی دوری پر بہت بے چین نظر آتی تھیں...... شامیر ان کی بے چینی کو ان کی محبت پر ہی محمول کرتا تھا۔

آخری کال کوئی ایک گھنٹا پہلے آئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔ ''شامی! یہ فارہ بہت تنگ کر رہی ہے۔ پڑے پڑے بور ہو گئی ہے۔ اگر فرینکفرٹ میں اتنا ہی ٹائم لگنا تھا تو تم اس کو بھی ساتھ لے جاتے۔''

''امو! یہ بھاگ دوڑ کا کام ہے۔ میں اسے کہاں لیے لیے پھرتا۔ ذرا فارغ ہو جاؤں پھر ہم تینوں اکٹھے آئیں گے۔ انجوائے کریں گے۔''

''شامی! تم نے تو صرف میونخ کا نام لیا تھا۔ فرینکفرٹ جانے کا تو تم نے نہیں کہا تھا۔'' انہوں نے ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

''بس امو! یہ انویسٹی گیشن کا کام ایسا ہی ہوتا ہے، ابھی شاید ایک دو شہروں کی خاک مزید چھاننا پڑے۔''

امو کے ساتھ گفتگو کا خاتمہ غیر تسلی بخش انداز میں ہی ہوا تھا۔ درحقیقت شامیر نے آج تک امو سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا، وہ اب بھی چھپانا نہیں چاہتا تھا...... اس کا ارادہ تھا کہ اپنے دل کی ساری واردات سے امو کو آگاہ کر دے گا اور انہیں بتا دے گا کہ تجسس سے مجبور ہو کر وہ زویا...... کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔

شامیر کی معلومات کے مطابق مسٹر فلیچر کو رات نو بجے کے لگ بھگ فرینکفرٹ واپس پہنچنا تھا۔ ان کی آمد میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے اور شامیر بے چینی سے ان کا منتظر تھا لیکن اس سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے مسٹر فلیچر کے انتظار کو بے معنی کر دیا۔

ہوٹل سے زویا کے فلیٹ کی جانب جاتے ہوئے شامیر ایک بغلی سڑک پر مڑا تو اچانک بے طرح ٹھٹک گیا۔ اس نے ایک لڑکی کو عقب سے دیکھا...... اور اسے یوں لگا جیسے وہ زویا کی لبنانی سہیلی خشامہ ہے۔ وہ سڑک کراس کر رہی تھی۔ شامیر بھاگ کر اس کی طرف جانا چاہتا تھا مگر پھر رک گیا۔ سڑک کراس کرنے کے بعد لڑکی کا رخ تھوڑا سا دائیں جانب ہوا تھا اور شامیر کا شبہ حقیقت میں بدل گیا تھا۔ وہ یقیناً خشامہ ہی تھی۔ اس نے بالوں کا رنگ ڈارک براؤن کر لیا تھا اور انہیں ڈیانا کٹ کی شکل دے دی تھی۔ باقی شکل صورت تقریباً وہی تھی۔ کندھے سے قیمتی شولڈر بیگ لٹکائے، منی اسکرٹ پہنے، اونچی ایڑی والے سینڈلز پر ٹھک ٹھک کرتی وہ ٹرین کے اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔

شامیر کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔ چار سال پہلے شامیر کلین شیوڈ تھا مگر اب اس نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ بالوں اور لباس کا اسٹائل بھی مختلف تھا۔ اسے یقین تھا کہ خشامہ اسے پہلی نظر میں پہچان نہیں سکے گی۔ خشامہ 12 نمبر ٹرین میں سوار ہوئی تو شامیر بھی سوار ہو گیا۔ اس کے سینے میں دل نے جیسے دھمال ساڈالنا شروع کر دیا تھا۔ اگر خشامہ نظر آ گئی تھی تو پھر زویا کے ملنے کا قوی امکان بھی پیدا ہو گیا تھا۔

پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ فوراً خشامہ کے پاس پہنچ جائے لیکن پھر نہ جانے کیوں اس نے تھوڑا مزید انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ خشامہ بہت بنی ٹھنی ہوئی تھی، بار بار اپنی رسٹ واچ بھی دیکھ رہی تھی۔ جیسے مقررہ وقت پر کسی سے ملنے جا رہی ہو۔ اس کے حلیے اور لباس وغیرہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی مالی حالت پہلے سے کافی اچھی ہے۔ چار یا پانچ اسٹاپ آگے جانے کے بعد وہ ٹرین سے اتر گئی، شامیر بھی اس کے ساتھ ہی اترا۔ وہ اترتے کے ساتھ ہی دائیں بائیں دیکھنے کے بعد تیزی سے ایک جانب بڑھ گئی۔ شامیر تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے گیا۔ اسٹاپ سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر ایک موٹا تازہ خوش پوش سفید فام اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ دونوں میں مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور موٹا کٹا شخص بے

تکلفی سے خشامہ کی پتلی کمر میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ خشامہ نے بھی اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر پر رکھ دیا تھا۔

اب شام کے سائے گہرے ہو کر تاریکی میں بدل گئے تھے۔ فرینکفرٹ کی ہزار ہا لائٹس آن ہو چکی تھیں۔ کسی قریبی ریستوران سے اطالوی موسیقی کی دھنیں بلند ہو کر فضا میں بکھر رہی تھیں۔ وہ دونوں ایک بغلی سڑک سے گزرے، سامنے ایک بڑے پارک کے آثار دکھائی دیے۔ پارک کے ساتھ ساتھ سڑک پر بہت سی گاڑیاں پارک تھیں۔ ان میں چند ایک ''کاروینز'' بھی نظر آرہے تھے۔ وہی چھوٹے چھوٹے سفری گھر جنہیں ڈرائیو کر کے کہیں بھی لے جایا جاسکتا ہے۔

خشامہ اس ہیوی ویٹ بندے کے ساتھ ایک ایسے ہی ٹریلر نما گھر میں گھس گئی۔ شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ یہاں ''ڈیٹ'' پر آئی تھی...... بلکہ شامیر کو یہ ڈیٹ سے بھی آگے کی بات لگ رہی تھی۔ وہ دونوں جس طرح کچھ کھائے پیے بغیر بے تابی سے ٹریلر میں گھس گئے تھے، یوں لگتا تھا کہ وہ ایک ''کال گرل'' کے طور پر یہاں آئی ہے اور موٹا تازہ شخص اس کا خریدار تھا۔ قریباً دو گھنٹے بعد اس کا ثبوت بھی مل گیا۔

یہ ایک ڈیڑھ گھنٹا شامیر نے اس پارک کے آس پاس گھومتے ہی گزارا تھا۔ اسے یہ اندیشہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں وہ چلتا پھرتا گھر یہاں سے روانہ ہو جائے اور وہ یہیں پر کھڑا منہ دیکھتا رہ جائے۔ ایسے میں فوری طور پر ٹیکسی کا ملنا یقینی نہیں تھا۔

قریباً دو گھنٹے بعد جب خشامہ ٹریلر سے برآمد ہوئی تو وہ دور سے ہی کچھ اجڑی بجڑی نظر آرہی تھی۔ اس کے ڈیانا کٹ بال منتشر تھے۔ اسے سی آف کرنے کے لیے ایک نہیں بلکہ دو مرد موجود تھے۔ دونوں نشے میں لگتے تھے۔ اپنے شولڈر بیگ کو کندھے پر درست کرتے ہوئے خشامہ نے ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گئی۔ شامیر ایک بار پھر اس کے پیچھے تھا۔ اب وہ مزید انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

قریباً دو منٹ بعد جب شامیر نے محسوس کیا کہ خشامہ محفوظ فاصلے پر پہنچ چکی ہے تو وہ فٹ پاتھ پر تیزی سے قدم اٹھا کر اس کے پاس آیا۔

''ہیلو۔'' اس نے کہا۔

خشامہ نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے پہچاننے میں ناکام رہی تھی۔ حالانکہ یہاں کافی روشنی موجود تھی۔

''جی فرمائیے۔'' وہ انگلش میں بولی۔

''اب فرمانا تو تمہیں چاہیے...... لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم مجھے پہچان نہیں سکی ہو۔''

اس نے ایک بار پھر بڑے دھیان سے شامیر کی طرف دیکھا اور تب اس کے چہرے کے تاثرات بدلنا شروع ہو گئے۔ وہ پوری کی پوری شامیر کی طرف مڑ گئی۔ ''او مائی گاڈ...... او مائی گاڈ...... یہ تم ہو...... مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔'' وہ جیسے چلا اٹھی۔

☆☆☆

شامیر اور خشامہ ایک کشادہ اپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ یہ کافی سجا سجایا اپارٹمنٹ تھا۔ خشامہ کی اس بدلی ہوئی مالی حالت کی وجہ وہی تھی جس کا اندازہ شامیر پہلے لگا چکا تھا۔ خشامہ نے بے باکی سے اسے بتایا کہ وہ ایک ''سیکس ورکر'' کے طور پر کام کر رہی ہے۔ اس کے اظہار میں ایک ذرا سی بھی شرمندگی یا خجالت شامل نہیں تھی۔ شامیر نے جب اس سے پوچھا کہ اس کا آفس کا کام کیسے چھوٹا تو وہ بولی کہ باس کی مہربانی سے ہی اسے یہ جاب ملی تھی اور باس کی نامہربانی کے سبب ہی چھوٹ گئی۔ باس نے اسے ریپ کر دیا تھا اور جب وہ ریپ ہو ہی گئی تو اس نے سوچا کہ کیوں نا اپنی مرضی سے اور اپنی شرطوں پر ریپ ہوا جائے۔

شامیر کے لیے خشامہ کے موجودہ حالات اہم نہیں تھے۔ اس کے لیے وہ سوال اہم تھا جو کسی میخ کی طرح اس کے دماغ میں گڑا ہوا تھا۔

اس نے خشامہ سے پوچھا۔ ''زویا کہاں ہے؟''

وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔ ''تو آخر تم اسے ڈھونڈتے ہوئے آہی گئے نا۔ زویا کی ماما ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ تم ایشیائی لوگ ہوتے ہی ایسے ہو۔ دل پھینک اور عورت کو ذہن پر سوار رکھنے والے۔ تین چار سال گزر گئے اور تمہاری سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہے؟''

شامیر بولا۔ ''تمہارے سوال کا جواب تمہارے سوال کے اندر ہی موجود ہے۔ چار سال گزر گئے اور میری سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہے۔ کیا دل پھینک اور ہرجائی مرد ایسے ہوتے ہیں؟''

''اسے تم اپنے اندر کا خلل کہہ سکتے ہو۔'' خشامہ نے کہا پھر ذرا رک کر بولی۔ ''ویسے تم کیا سوچ کر یہاں آئے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اب بھی کسی ادھ کھلی کھڑکی میں بیٹھی تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی؟ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی؟''

شامیر نے گہری سانس لی اور ٹھہرے ہوئے لہجے

میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔“
”تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟“
”اس لیے کہ میں بھی اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ پچھلے چند برسوں میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل و دماغ سے اوجھل نہیں ہوئی۔“
”اور اب تم یہاں آگئے ہو، نجات دہندہ بن کر۔ اسے کسی بڑی مصیبت سے چھٹکارا دلانے کے لیے۔ اس کے آنسو پونچھنے کے لیے اور پھر اسے اپنی بانہوں میں چھپا کر کہیں دور بہت دور سپنوں کے ایک سنہری دیس میں لے جانے کے لیے۔“ خشامہ کے لب و لہجے میں طنز کی شدید کاٹ تھی۔
”وہ کہاں ہے خشامہ..... اور اس کی والدہ؟“
”ان دونوں کے بارے میں میری جوتی کو بھی پتا نہیں۔ زویا سے میری آخری ملاقات ہوئے بھی کوئی تین ساڑھے تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان دنوں وہ ایک لوکل ٹی وی چینل پر پارٹ ٹائم جاب کر رہی تھی..... بہرحال مشرق اور مغرب میں بہت فرق ہے مسٹر شامیر! یہاں کی لڑکیاں مہینوں اور برسوں تک ادھ کھلی کھڑکیوں میں بیٹھ کر اپنے روٹھے ہوئے بوائے فرینڈز کا انتظار نہیں کرتیں۔ یہاں کی زندگی حقیقت پسندانہ ہے..... اس کے علاوہ مشینی اور تیز رفتار ہے۔ یہاں بڑی رفتار سے بہت کچھ تبدیل ہو جاتا ہے..... اور جو کچھ تبدیل ہو جاتا ہے، اس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ تمہاری خوش فہمیوں کو دور کرنے کے لیے میرے پاس ایک مصدقہ اطلاع ہے..... زویا کی شادی ہو چکی ہے اور اس کی اپنی مرضی سے ہوئی ہے۔“
خشامہ کا یقینی انداز دیکھ کر شامیر کے سر پر بم سا پھٹ گیا تھا۔ دل سینے میں بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔
”اور وہ کیسے ہو سکتا تھا جو تم سوچتے ہو؟“ خشامہ نے ترت جواب دیا۔ ”تمہارا کیا خیال تھا کہ زویا کی ماما جس کی زندگی ایک ہندوستانی شخص کی وجہ سے تباہ ہوئی، ایک اور ہندوستانی کو اپنی بیٹی کی زندگی تباہ کرنے کی اجازت دے دے گی؟ وہ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ ہوشیار اور چوکس عورت ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ وہی کرے گی جو اس نے کہا تھا۔“
”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے خشامہ کہ اس کی شادی ہوگئی ہے؟“
”مجھے زیادہ کچھ پتا نہیں ان ماں بیٹی کے بارے میں لیکن ایک فرینڈ نے اس کی شادی کی تصویر ضرور بھیجی تھی۔ یہ شادی کوئی تین سال پہلے جرمنی میں ہی کہیں ہوئی تھی۔“ خشامہ نے کہا اور اپنے سیل فون میں کچھ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔
شامیر کا دل جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آنا چاہتا تھا۔ دو تین منٹ بعد خشامہ موبائل کے کسی ”فولڈر“ میں وہ تصویر ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئی۔
شامیر نے سکتہ زدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سفید اور سرخ رنگ کا عروسی جوڑا پہنے اپنے جرمن دلہا کے پہلو میں بیٹھی نظر آرہی تھی۔ یہ ہلکی نیلی آنکھوں والا وہی دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی تصویر شامیر نے ایک دفعہ زویا کے موبائل فون میں دیکھی تھی۔ یہ تصویر زویا کو اس کی ماما نے بھجوائی تھی۔ زویا نے لڑکے کا نام رابرٹ بتایا تھا۔ شامیر سکتہ زدہ سا تصویر کو دیکھتا رہا۔ تصویر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اگر واقعی یہ شادی ہو چکی ہے تو پھر اسلامی طریقے کے مطابق ہوئی ہے۔ تصویر میں زویا کی تراشیدہ بالوں والی والدہ بھی دکھائی دے رہی تھیں مگر وہ وہیل چیئر پر نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف پادری جوناتھن بھی بیٹھے ہوئے تھے۔
”کیا یہ تصویر درست ہے؟“ شامیر نے پوچھا۔
”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے تمہیں ”فیک“ تصویر دکھانے کی؟ بہرحال میں تمہارے تفتیشی سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ یقین کرنا ہے تو کرلو۔ ورنہ بے شک اپنی، احمقوں کی جنت میں رہو۔“ وہ بے رخی سے بولی۔
شامیر نے خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”اس تصویر میں زویا کی والدہ وہیل چیئر پر نظر آرہی ہیں، کچھ کمزور بھی دکھائی دیتی ہیں۔“
وہ اپنے مصنوعی ناخن اتارتے ہوئے بولی۔ ”میں نے کہا ہے ناکہ میں اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ بس اڑتی اڑتی ہوئی سی اتنی بات سنی تھی کہ ان کے گھر میں ڈکیتی وغیرہ کی واردات ہوئی تھی جس میں وہ بڑھیا زخمی ہوگئی تھی۔“
شامیر کے کسی سوال کا انتظار کیے بغیر وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی..... اور اپنی گردن اور کندھے کے تازہ نشانوں کو ہلکے میک اپ میں اوجھل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ نشان تھوڑی دیر پہلے کی اسی ”مصروفیت“ کا نتیجہ تھے جسے خشامہ بڑی ڈھٹائی سے ”سیکس ورک“ کا نام دے رہی تھی۔ بیروت کی رہنے والی یہ عیسائی لڑکی اب نمک کی کان میں نمک بن چکی تھی یعنی پوری طرح مغرب زدہ

ہو چکی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ تو کیا زویا بھی یہاں کی تیز رفتار تبدیلیوں کی زد میں آ چکی تھی؟ یوں تو چار سال پہلے بھی خشامہ نے شامیر کو رجھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی مگر اب تو وہ سراپا دعوت تھی۔ بے شک وہ تھکی ماندی لوٹی تھی مگر شامیر کی ذرا سی آمادگی پر وہ اس رات کو رنگین بنانے کے لیے کمربستہ ہو سکتی تھی۔ شامیر اس کے اس لگژری اپارٹمنٹ سے چلے جانا چاہتا تھا مگر اس وجہ سے رکنے پر آمادہ ہو گیا کہ شاید خشامہ سے زویا کے بارے میں کچھ مزید معلوم ہو سکے۔ دوسرے وہ اس اپارٹمنٹ میں رات گزار کر اور خشامہ کی حشر سامانیوں کو یکسر نظر انداز کر کے اسے اس بات کا عملی جواب دینا چاہتا تھا کہ پاکستان وغیرہ سے آنے والے مردوں کے ذہن پر ہر وقت عورت سوار رہتی ہے اور وہ یورپی ممالک کے گلی کوچوں میں اپنا دل پلیٹ میں لیے پھرتے ہیں۔ تاہم اس نے شدید دانت درد کا بہانہ بنایا تھا اور خشامہ کے گھر سے کچھ بھی نہ کھانے کا معقول جواز پیدا کر لیا تھا۔

خشامہ کے اپارٹمنٹ میں رات گزار کر شامیر کو بس ایک چھوٹا سا کلیو ہی حاصل ہو سکا اور وہ یہ کہ شادی کے بعد زویا اپنے خاوند کے ساتھ پیڈر بورن نامی شہر میں چلی گئی تھی۔ زویا کا خاوند رابرٹ وہاں ایک یونیورسٹی میں ملازم تھا۔ شاید لیکچرار وغیرہ تھا۔ جو دوسری خبر شامیر کو خشامہ کے ذریعے ملی، وہ زویا کے والد مسٹر راشد کے بارے میں تھی۔ وہ انتقال کر چکے تھے۔ قریباً تین سال پہلے انہیں برین ہیمبرج ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ شامیر نے اس شخص کو کبھی دیکھا نہیں تھا اس کے باوجود اس خبر نے اسے صدمہ پہنچایا۔

شامیر نے خشامہ سے زویا کی دوسری سہیلی طویل قامت جین کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ جین نے دو سال پہلے باسکٹ بال کے اٹالین کھلاڑی سے شادی کی تھی۔ وہ کچھ عرصہ اٹلی میں رہی تھی، اب پھر شاید جرمنی میں ہی کہیں ہے۔ خشامہ کا اس سے بھی کوئی رابطہ نہیں تھا۔ یا شاید جین نے ہی اس سے کوئی رابطہ نہ رکھا ہو۔ وہ جس طرح کے کاموں میں پڑ گئی تھی، بھلے مانس لڑکیوں کا اس سے دور رہنا ہی مناسب تھا۔

☆☆☆

تقریباً 36 گھنٹے بعد انٹرسٹی ٹرین اور بس کا لمبا سفر طے کر کے شامیر اس پیڈر بورن نامی شہر میں پہنچ چکا تھا۔ اس کو شہر کے بجائے ایک بڑا قصبہ کہنا زیادہ مناسب تھا۔ یورپ کے پُرسکون قصبوں والی ساری کشادگی اور اداسی یہاں موجود تھی۔ آبادی کم اور شہری سہولتیں زیادہ دکھائی دیتی تھیں۔ یہاں بھی شامیر نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کیا...... اور ہوٹل پہنچنے کے فوراً بعد ہی اپنے کام میں لگ گیا۔ اس قصبہ نما شہر میں چار یونیورسٹیاں ایسی تھیں جنہیں زیادہ اہم کہا جا سکتا تھا۔ ان یونیورسٹیوں کے ملازمین یا لیکچرارز میں سے کسی رابرٹ لوئیس نامی بندے کا سراغ لگانا زیادہ آسان نہیں تو بہت مشکل بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے شامیر اپنی صحافتی حیثیت کو بھی استعمال کر سکتا تھا۔ وہ یہ جواز پیش کر سکتا تھا کہ جرمنی کے ان تعلیمی اداروں کے بارے میں ایک تجزیاتی رپورٹ تیار کر رہا ہے جو بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پسماندہ ممالک کے طلبا کو تعلیمی سہولتیں دے رہے ہیں۔

شامیر کے اندر جوار بھاٹے کی سی کیفیت تھی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے آنکھوں میں نمی آ جاتی تھی اور کبھی کسی موہوم امید کے سہارے دل بے پناہ شدت سے دھڑکنے لگتا تھا۔ پتا نہیں کیوں، اس کے دل میں رہ رہ کر یہ آس پیدا ہوتی تھی کہ زویا کی شادی والی اطلاع بالآخر غلط ثابت ہو گی...... یہ سب کچھ کسی ڈرامے کا حصہ نکلے گا...... اگر وہ اسے نہیں بھولا تھا تو وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ ان دونوں کی محبت انا کا زہر پی کر کچھ عرصے کے لیے ادھ موئی تو ضرور ہوئی تھی مگر مری نہیں تھی۔

ادھر وہ رابرٹ نامی نوجوان کی تلاش میں تھا اور ادھر امو خالہ کال پر کال کر رہی تھیں۔ وہ شامیر کے حوالے سے کچھ زیادہ ہی پریشان لگتی تھیں۔ شامیر کو کافی حد تک علم تھا کہ ان کی اضافی پریشانی کی وجہ کیا ہے؟ امو خالہ کو معلوم تھا کہ چار سال پہلے جس جرمن نژاد لڑکی زویا سے شامیر کو رسم و راہ پیدا ہوئی تھی، وہ فرینکفرٹ کی ہی رہنے والی تھی۔ اب وہ اس اندیشے کے لیے حق بجانب تھیں کہ کہیں پھر سے وہ تکلیف دہ سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔ بہرطور جب شامیر نے امو خالہ کو بتایا کہ وہ اب فرینکفرٹ میں نہیں بلکہ نارتھ رائن اسٹیٹ کے شہر پیڈر بورن میں ہے تو انہیں کچھ تسلی ہوئی۔

جستجو اور تحقیق کا مادہ شامیر کی طبع میں شامل تھا۔ اگلے روز سہ پہر تک وہ نہ صرف رابرٹ کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گیا بلکہ اس نے اسے دیکھ بھی لیا...... وہ آئی ٹی کی اس مقامی یونیورسٹی میں بطور لیکچرار تعینات تھا۔ سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ رابرٹ اپنے کام سے فارغ ہو کر پیدل ہی یونیورسٹی کے کیمپس سے نکلا اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔

وہ سفید شرٹ اور نیلی پتلون میں تھا۔ ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کے دبلے پتلے جسم پر یہ لباس خوب جچ رہا تھا۔ کھوئے کھوئے انداز میں دھیمے قدموں سے چلتا ہوا یہ جرمن نوجوان اسے بظاہر شریف النفس اور کسی حد تک شرمیلا لگا۔ راستے میں جو اسٹوڈنٹس ملے انہوں نے بھی اسے احترام ہی دیا۔ کچھ آگے جا کر شامیر چونکا۔ رابرٹ ایک مسجد میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ عصر کی نماز کا وقت تھا۔ شامیر بھی اس کے پیچھے مسجد میں چلا گیا۔ باجماعت نماز تو ہو چکی تھی، بہر حال دونوں نے انفرادی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد رابرٹ دیر تک سر جھکائے دعا مانگتا رہا۔

اس ترک مسجد سے نکلنے کے بعد رابرٹ پھر پیدل چل پڑا۔ شامیر اس سے بات شروع کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سیاہ فام اسٹوڈنٹ اس کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ رابرٹ اور سیاہ فام اسٹوڈنٹ باتیں کرتے کرتے کوئی نصف کلومیٹر تک گئے، پھر سیاہ فام تو ادب سے جھک کر آگے بڑھ گیا اور رابرٹ ایک گرجے میں داخل ہو گیا۔ پہلے مسجد اور پھر گرجا؟ شامیر کے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔

اس دفعہ شامیر باہر ہی ٹہلتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد رابرٹ افسردگی کی حالت میں باہر نکلا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس پر رقت طاری ہے اور وہ روتا رہا ہے۔ شامیر نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ سیدھا رابرٹ کے پاس چلا گیا۔ ''ہیلو مسٹر! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی کہیں۔'' شائستگی سے پوچھا گیا۔

''میرا نام احمد ہے۔ میرا تعلق ایک پاکستانی ٹی وی چینل سے ہے۔ میں یہاں کے ان تعلیمی اداروں کے بارے میں ایک اسٹوری تیار کر رہا ہوں جو غیر ملکی طلبا کو آسان شرائط پر تعلیمی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔''

رابرٹ نے دھیان سے شامیر کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''آپ سے مل کر خوشی ہوئی لیکن میں اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

سامنے ہی ایک کیفے نما جگہ نظر آ رہی تھی۔ شامیر نے کہا۔ ''کیا ہم چند منٹ وہاں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟''

ذرا سے تذبذب کے بعد رابرٹ نے شامیر کی بات مان لی اور وہ دونوں اوپن ائر کیفے کی ایک میز پر آن بیٹھے۔ رابرٹ مسلسل گہری نظروں سے شامیر کو دیکھ رہا تھا۔

شامیر نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سے عمومی نوعیت کے چند سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں گے۔''

''میں ضرور کروں گا لیکن اس کے لیے آپ کو جھوٹ نہیں سچ بولنا ہوگا۔''

''م...... میں سمجھا نہیں؟'' شامیر گڑبڑا گیا۔

''اگر میں غلط اندازہ نہیں لگا رہا تو آپ کا نام احمد نہیں شامیر ہے اور آپ جس پاکستانی چینل کی بات کر رہے ہیں اس کا نام شاید ڈبل اے ہے اور آپ یہاں کے تعلیمی اداروں کے بارے میں کوئی رپورٹ وغیرہ تیار کرنے نہیں آئے بلکہ...... غالباً کسی کو کھوجتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔''

شامیر ہکا بکا رہ گیا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ یہ رابرٹ نامی نوجوان اتنی جلدی بات کی تہ تک پہنچ جائے گا...... اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ شامیر کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔

شدید حیرت کے چند لمحے گزر گئے تو شامیر نے خود کو تیزی سے سنبھالا۔ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سب کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ فقط اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میں یہاں پہنچا ہوں تو کسی بری نیت سے نہیں پہنچا۔ میں چینل کے ایک کام سے ہی یہاں آیا تھا۔ یہاں آ کر سارے پرانے مناظر ذہن میں تازہ ہو گئے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ چار سال پہلے میں جن لوگوں سے یہاں مل چکا ہوں، وہ کہاں اور کس حال میں ہیں؟ خاص طور سے مس زویا کے حوالے سے ایک تجسس سا تھا، ایک بار پھر اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے اس ''نوس ٹیلجیا'' (ماضی پرستی) کو معاف کر دیں گے۔''

رابرٹ سر جھکا کر کچھ دیر تک خاموشی سے چائے کے کپ کو دیکھتا رہا پھر بغیر کسی تمہید کے بولا۔ ''شاید تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ زویا اسی طرح ہے جس طرح تم اسے چھوڑ کر گئے تھے، یا اس کی شادی ہو چکی ہے؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہو۔ میرے ''نوس ٹیلجیا'' میں یہ تجسس بھی شامل ہے۔''

رابرٹ نے ایک بار گہری سانس لی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم ٹھیک جگہ پر ہی پہنچے ہو۔ میں ہی زویا کا شوہر ہوں۔ ہماری شادی تین سال پہلے تقریباً انہی دنوں میں ہوئی تھی۔''

شامیر کے دل پر ایک زبردست گھونسا سا لگا۔ اس کی خوش فہمی کا بہت بڑا فانوس، پتھریلے فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ حقیقتیں ایسی ہی زہریلی اور بے رحم ہوا کرتی ہیں۔ اس نے دل کڑا کر کے خود کو بولنے پر آمادہ کیا اور ہونٹوں پر

ایک پھیکی سی مسکراہٹ سجا کر بولا۔ ''آپ کو یہ شادی شدہ زندگی مبارک ہو مسٹر رابرٹ۔''

رابرٹ نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ بدستور چائے کی پیالی کو گھور رہا تھا۔ خاموشی بوجھل ہونے لگی تو وہ بولا۔ ''زویا کے بارے میں کچھ اور جاننا نہیں چاہو گے؟''

''میرے خیال میں یہ کافی ہے مسٹر رابرٹ۔''

''شاید تم تکلف سے کام لے رہے ہو۔'' رابرٹ نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟''

شامیر نے اپنے ہوٹل کا نام بتایا۔

رابرٹ بولا۔ ''یہ میرے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ تم کل ڈنر پر آجاؤ...... آرام سے بات کریں گے۔''

''نہیں رابرٹ! میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے......''

''شاید تم زویا کے سامنے جانے سے کنی کترا رہے ہو۔'' رابرٹ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ آج کل گھر میں نہیں ہے۔ ہم تسلی سے گپ شپ کر سکیں گے۔''

شامیر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کو بڑا گہرا زخم لگا تھا اور وہ اندر ہی اندر کراہ رہا تھا۔ وہ شادی شدہ زویا کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا، دوسری طرف اس کے بارے میں جاننے کی منہ زور خواہش بھی سر اٹھا رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ دھیمی طبع والا یہ نوجوان لیکچرار اپنی ازدواجی زندگی اور دیگر حالات سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہے۔

ڈنر کے حوالے سے رابرٹ اور شامیر کے درمیان دو چار منٹ مزید بات ہوئی پھر شامیر نے آمادگی ظاہر کر دی۔

☆☆☆

اسٹریٹ پولیٹن میں اموخالہ اور فارہ سخت بے قرار تھیں۔ ماں بیٹی بند کمرے میں مصروفِ گفتگو تھیں۔ فارہ نے کہا۔ ''آخر وہی ہوا ناں جس کا ڈر تھا۔ مجھے پکا یقین ہے کہ آپ کا یہ لاڈلا اسی پرانی گرل فرینڈ کے چکر میں بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ ہمیں گولی دی جا رہی ہے کہ رپورٹ پر کام کر رہا ہوں۔''

''بھئی فارہ! بغیر ثبوت کے الزام نہیں لگانا چاہیے۔'' امو نے کہا۔

''اور ثبوت آپ کو کبھی ملنا ہی نہیں۔ آپ نے اسی طرح آنکھیں بند رکھی ہیں اور مجھ سے دس سال بڑے اس بندے کے ساتھ میری زندگی برباد کر دینی ہے۔ کسی وقت تو مجھے زہر لگنے لگتا ہے یہ شخص۔''

''زبان سنبھال کر بات کرو۔'' امو نے دانت پیس کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''تیری ایسی ہی باتوں سے مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں بنا بنایا کام بگڑ نہ جائے۔'' انہوں نے اپنی درمیانی شکل وصورت والی بیٹی کو سرتاپا دیکھا پھر سمجھانے والے انداز میں بولیں۔ ''میری ایک بات لکھ لے کہیں پر...... اس سے بہتر رشتہ تجھے کہیں ملے گا نہیں۔''

''مگر امو! میں ایک بات آپ کو صاف صاف بتا دوں۔ آپ کے لاڈلے کے نخرے دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں اور اب تو طور اطوار بھی ٹھیک نہیں ہیں، مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوگا۔''

امو نے ہولے سے کہا۔ ''ایک بار شادی ہو جائے۔ ایک آدھ بچہ ہو جائے پھر سارے کس بل نکل جائیں گے۔''

''اور شادی ہوگی کیسے؟ وہ تو مارا مارا پھر رہا ہے اس پرانے افیئر کے پیچھے۔ آج چار روز ہو گئے ہیں۔ کسی نے مڑ کر ہماری خبر تک نہیں لی۔''

اموخالہ کی آنکھوں میں گہری سوچ ابھر آئی۔ کچھ دیر بعد وہ رازداری کے انداز میں بولیں۔ ''اچھا ایک کام کر تو۔ شامیر کو فون کر۔ اسے بتا کہ امو کی طبیعت ایک دم خراب ہو گئی ہے۔ بلڈ پریشر شوٹ کر گیا ہے۔ چل ابھی کر فون۔''

☆☆☆

شامیر نے اگلے روز دوپہر تک کا وقت بڑی بے چینی میں گزارا تھا۔ زویا کے حوالے سے جو ایک تاریک پردہ اس کے سامنے تنا ہوا تھا، وہ اب ہٹنے والا تھا۔ رابرٹ کے ساتھ اس کا ٹائم شام آٹھ بجے کا تھا۔ یہ چند گھنٹے گزارے نہیں گزر رہے تھے۔ دو بجے کے قریب اس نے ایک ترک ریسٹورنٹ میں ڈونر اور کوک کا لنچ کیا...... اور سگریٹ پھونکنے لگا لیکن غم اتنا بڑا تھا کہ دھوئیں میں غلط ہونے سے انکار کر رہا تھا۔ زویا کی شادی ایک ٹھوس حقیقت بن کر اس کے سامنے آئی تھی اور ہر آس، امید کی بیخ کنی کر گئی تھی۔

اس نے ایک بار پھر بے تابی سے رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی اور یہی وقت تھا جب اس کے سیل فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف فارہ تھی۔ ''آپ کہاں ہیں؟'' وہ بغیر کسی تمہید کے بولی۔

''فارہ! میں نے بتایا تو تھا یہاں پیڈربورن آیا ہوا ہوں...... کیوں خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے۔'' فارہ کی روہانسی آواز ابھری۔

"امو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اوہ گاڈ! کیا ہوا انہیں؟" شامیر جیسے پوری جان سے تڑپ گیا۔

"بلڈ پریشر بہت شوٹ کر گیا ہے۔ دوا بھی زیادہ اثر نہیں کر رہی۔ نیم بے ہوش سی پڑی ہوئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو یہاں ہونا چاہیے۔"

شامیر نے تیزی سے چند سوالات پوچھے اور پھر فارہ کو تسلی دی کہ وہ ابھی یہاں سے روانہ ہو رہا ہے۔ اس نے افراتفری میں رابرٹ کو اطلاع دے دی کہ وہ آج نہیں آسکے گا...... دو ٹرینیں بدل کر وہ آسٹریا کی حدود میں داخل ہوا اور پھر تیسری "یوریل" ٹرین پر ایک گھنٹے کا مزید سفر کر کے اسٹریٹ پولیٹن پہنچ گیا۔ اس کے پہنچنے تک امو خالہ کی "طبیعت" کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ تاہم وہ کافی گم صم نظر آرہی تھیں۔ شامیر رات گئے تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ ان سے دلجوئی کی باتیں کرتا رہا، ان کی ٹانگیں دباتا رہا۔ اسے بہت برا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی امو خالہ سے اصل بات چھپا رہا ہے۔ رات کو اس نے مناسب لفظوں میں رک رک کر تقریباً سب کچھ ہی امو خالہ کے گوش گزار کر دیا۔ اس نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ زویا کی شادی ہو چکی ہے...... بلکہ یہ بھی کہ شاید اس کی ازدواجی زندگی کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے...... تین روز بعد امو خالہ کی "طبیعت" بالکل ٹھیک ہو چکی تھی۔ شامیر نے ایک مرتبہ پھر جرمنی کے اس شہر نما قصبے "پیڈر بورن" کا رخ کیا جہاں اس کی ملاقات زویا کے شوہر سے ہوئی تھی، تاہم اس مرتبہ امو خالہ، فارہ اور فارہ کی مقامی کزن افشاں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ امو خالہ اور فارہ جرمنی کی چند قابلِ دید جگہیں دیکھنے کی خواہش رکھتی تھیں۔

پیڈر بورن پہنچتے ہی شامیر نے دوبارہ رابرٹ سے رابطہ کیا۔ اس سے معذرت کی کہ اسے اپنی آنٹی کی خرابی صحت کی بنا پر اچانک واپس جانا پڑ گیا تھا۔ رابرٹ نے اپنی ڈنر والی دعوت کا اعادہ کیا اور اسی روز رات کو شامیر "ہوٹل" سے روانہ ہو کر رابرٹ اور زویا کے گھر پہنچ گیا۔ یورپ کے عام گھروں کی طرح یہ ڈھائی تین مرلے پر مشتمل ایک چھوٹا مگر خوشنما گھر تھا۔ شامیر کو یہاں کچھ ایسی تصویریں نظر آئیں جن سے اس پر انکشاف ہوا کہ زویا ایک نہایت خوبصورت پیاری بچی کی ماں بن چکی ہے۔ گھر میں کئی جگہ ریکس اور شوکیس وغیرہ میں رنگ برنگے کھلونے بھی جھلک دکھا رہے تھے۔ ایک بڑی تصویر کامن روم میں لگی تھی جس میں چند ماہ کی گڑیا سی بچی کو زویا ہوا میں اچھال رہی تھی۔ اس تصویر میں زویا کی صرف پشت ہی دکھائی دیتی تھی۔ زویا اسی طرح سبک جسم اور دلکش نظر آتی تھی۔ ایک تصویر میں اس نے بالکل ماڈرن انداز میں چست جینز اور بغیر آستینوں کی شرٹ بھی پہن رکھی تھی۔ ایک اور تصویر میں بھی وہ بولڈ لباس میں دکھائی دیتی تھی۔

رابرٹ نے کوئی ملازم نہیں رکھا ہوا تھا۔ ڈنر بھی اس نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ یہ ڈنر سوپ، مچھلی اور جرمنی کی اسپیشل سلاد پر مشتمل تھا۔ مقامی طرز پر تیار کی گئی مچھلی شامیر کو زیادہ تو نہیں بھائی لیکن اس میں چونکہ بنانے والے کا خلوص شامل تھا لہٰذا وہ شامیر کو بری بھی نہیں لگی۔

شامیر کے اندر بے شمار سوالات کلبلا رہے تھے۔ مزیدار قہوہ پیتے ہوئے رابرٹ نے اچانک کہا۔ "شامیر! شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ زویا مجھے بھی چھوڑ کر جا چکی ہے...... جاتے جاتے وہ میری بچی بھی ساتھ لے گئی ہے۔" آخری الفاظ کہتے ہوئے رابرٹ کی آواز بھرا گئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو رابرٹ؟" شامیر کو جیسے یقین نہیں آیا۔

وہ کھوئے کھوئے افسردہ لہجے میں بولا۔ "اس کے اندر اور باہر میں بہت فرق تھا مسٹر شامیر اور شاید وقت گزرنے کے ساتھ یہ فرق زیادہ ہوتا رہا ہے، یوں لگتا ہے کہ عیش و آرام اور دنیاوی لذتوں کی طلب اس کے اندر بتدریج بڑھتی چلی گئی ہے۔"

"اب...... وہ کہاں ہے؟" شامیر نے پوچھا۔

"یہ تو معلوم نہیں۔ وہ اپنا کوئی نشان چھوڑ کر نہیں گئی اور سچی بات یہ ہے شامیر کہ مجھے اب اس کی کوئی خاص فکر بھی نہیں ہے۔ لیکن جو ظلم اس نے میرے ساتھ کیا ہے، وہ بہت بڑا ہے۔ وہ میری پیاری بچی کو میری عینی کو اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ وہ میری جان تھی شامیر! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گا......" رابرٹ کا گلا ایک بار پھر رندھ گیا۔

زویا کے بارے میں جو انکشافات ہو رہے تھے، وہ شامیر کے لیے بے حد تکلیف دہ تھے۔ اس نے رابرٹ سے پوچھا۔ "تم دونوں میں کوئی جھگڑا وغیرہ بھی تھا؟"

"چھوٹے موٹے جھگڑے تو ازدواجی زندگی میں چلتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن میں پوری سچائی سے بتا رہا ہوں شامیر کہ میری طرف سے کبھی کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ پتا نہیں اس نے مجھے کس جرم کی سزا دی ہے...... آج اسے گئے ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکا ہے۔ اس نے کوئی رابطہ کیا ہے، نہ اپنے بارے میں کوئی اطلاع دی ہے۔"

''رابرٹ! کیا تم پورے یقین سے کہہ سکتے ہو کہ وہ اپنی مرضی سے ہی کہیں گئی ہے؟''

''اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا ایک بوائے فرینڈ اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی گئی ہے۔'' آخری الفاظ رابرٹ نے عجیب شرمندگی کے عالم میں ادا کیے۔

یہ زویا کے بارے میں تیسرا انکشاف تھا جس نے شامیر کو سرتاپا ہلا دیا۔ وہ حیرت سے رابرٹ کی جانب دیکھتا رہا۔

وہ تاسف سے سر ہلا کر بولا۔ ''میں نے کہا ہے نا، مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے لیکن...... وہ میری عینی کو تو مجھ سے جدا نہ کرتی۔''

کچھ دیر تک کمرے میں بوجھل خاموشی طاری رہی۔ قہوے کی پیالیاں ان کے سامنے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ شامیر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''میں تم سے ذاتی نوعیت کے سوالات پوچھ رہا ہوں۔ آئی ایم سوری...... تمہیں برا تو نہیں لگ رہا؟''

''مجھے...... اب...... کچھ بھی برا نہیں لگتا۔ کیونکہ جو کچھ میں جھیل رہا ہوں وہ بہت...... بہت زیادہ برا ہے۔'' اس کی نگاہیں اپنی نو دس ماہ کی گڑیا سی بچی کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔

''رابرٹ! تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ہی گئی ہے؟''

وہ کچھ دیر تک الجھن میں نظر آیا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ ان معاملات کو شامیر کے ساتھ شیئر کرے یا نہیں۔ پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر اس نے کہا۔ ''اس لڑکے نے خود مجھے بتایا تھا کہ زویا اس کے ساتھ جا رہی ہے۔ میں ان دونوں کو ڈھونڈنے کی یا ان کے پیچھے آنے کی کوشش نہ کروں۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔''

پھر اس نے اپنی جیب میں سے اپنا سیل فون نکالا۔ اس میں سے ایک ویڈیو کلپ نکال کر اور پلے کر کے شامیر کے سامنے رکھ دیا۔ شامیر کو ایک اور دھچکا لگا۔ اس ویڈیو کلپ میں چوڑے شانوں والا جو جرمن نوجوان نظر آ رہا تھا، وہ شامیر کے لیے اجنبی نہیں تھا...... یہ وہی گٹارسٹ تھا جس سے زویا ایک دفعہ فرینکفرٹ کے مرکزی اسٹیشن پر ملی تھی۔ اس نے زویا کو بانہوں میں بھر کر چاروں طرف گھمایا تھا اور زویا نے بڑی بے تکلفی سے اس کے دونوں گالوں پر زوردار چٹکیاں لے کر شکوہ کیا تھا کہ وہ آج کل کہاں اوجھل ہے۔ وہ اور خشامہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی ہیں۔ زویا نے اس لڑکے کا نام ٹام بتایا تھا۔ اب یہی ٹام اس ویڈیو کلپ میں رابرٹ سے مخاطب تھا اور انگلی اٹھا اٹھا کر وارننگ کے انداز میں اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ جرمن بول رہا تھا لہٰذا شامیر کی سمجھ میں الفاظ نہیں آئے...... بہرحال انداز اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس ویڈیو کلپ کے بیک گراؤنڈ میں زویا بھی اپنی ایک سالہ بچی کے ساتھ کھڑی نظر آتی تھی اور جیسے بہ زبانِ خاموشی ٹام کی پوری تائید کر رہی تھی۔

شامیر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ لڑکا شاید زویا سے کافی عرصہ پہلے بھی ملتا رہا ہے۔ پہلی بار میں چار سال پہلے یہاں آیا تھا۔ تب بھی اس لڑکے کو دیکھا تھا۔''

رابرٹ نے شامیر کو تیز نظروں سے دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولا۔ ''پتا نہیں وہ کس کس سے ملتی رہی ہے اور شاید اب بھی ملتی ہو یا رابطہ رکھتی ہو۔''

شامیر نے صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''سچ یہ ہے رابرٹ کہ جب میں یہاں سے واپس پاکستان گیا تھا تو زویا سے میری دوستی بھی وہیں پر ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہم دونوں میں کبھی کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ میں نے بھی کبھی یہ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔''

''میں کوئی خاص تمہاری بات نہیں کر رہا ہوں شامیر! اس بات کا پتا مجھے شادی کے بعد چلا تھا کہ اس کا حلقۂ احباب کافی وسیع رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں صرف زویا کی والدہ کی وجہ سے پھنسا ہوں۔ آنٹی سارہ کی شدید خواہش تھی کہ میں ان کی بیٹی کا رشتہ قبول کر لوں۔ تب تک زویا بھی اپنے اصل روپ میں نہیں آئی تھی۔ میری عقل پر پردہ پڑ گیا اور میں اس سے ناتا جوڑ بیٹھا۔''

''آنٹی سارہ اب کہاں ہیں؟'' شامیر نے پوچھا۔

''تین ساڑھے تین سال پہلے ان کے گھر ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی، جس میں وہ زخمی ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد وہ اپنا آبائی شہر میونخ چھوڑ کر ''ایسن'' چلی گئیں اور اب بھی وہیں رہائش پذیر ہیں۔ ان کو بھی کچھ خبر نہیں کہ ان کی لاڈلی کہاں ہے۔ وہ خود بھی پریشان ہیں اور اسے کوستی رہتی ہیں۔''

''تم نے زویا کو ڈھونڈنے کی کوششیں کس طرح کی ہیں رابرٹ؟''

''تم یہ پوچھو کہ میں نے کس طرح کوششیں نہیں کی ہیں؟'' اس نے مختصر جواب دیا اور اس کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ شامیر نے موضوع بدل دیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ زویا کے ساتھ شادی سے پہلے وہ مسلمان ہوا تھا یا نہیں؟

رابرٹ نے اس کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ وہ مسلمان تو ہوا تھا مگر ساتھ ساتھ اس نے زویا کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ اسلام کو پوری طرح سمجھ کر اسے دل و جان سے قبول کرنا چاہتا ہے۔ وہ آج کل بھی انگلش زبان میں اسلامی کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔

رابرٹ کے گھر سے شامیر دل پر ایک بہت بھاری بوجھ لے کر لوٹا تھا۔ ایک نہایت تکلیف دہ حیرت تھی جس نے اس کے حواس کو مختل کر رکھا تھا۔ چہرے کس طرح دھوکا دیتے ہیں۔ شخصیات کس طرح پردوں کے پیچھے اوجھل رہتی ہیں، یہ آج اس پر کھل رہا تھا۔ وہ کیا سوچ کر اپنے بچھڑے ہوئے فرینکفرٹ سے ملنے آیا تھا اور فرینکفرٹ نے اس پر کیا انکشافات کیے تھے۔ ساری کی ساری رومانیت کہیں دھندلی فضاؤں میں اوجھل ہوگئی تھی۔ اب ایک طرح کا رنج اور غصہ شامیر کے اندر پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ کم از کم ایک بار تو زویا سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

.....کھوج لگانا شامیر کا پروفیشن تھا۔ وہ دوسروں کی اسٹوریز کے پیچھے تو بھاگتا ہی رہتا تھا، اب اپنی اسٹوری کو بھی ایک انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس نے ہوٹل واپس آکر ساری صورتِ حال امو خالہ کو بتا دی اور اس دکھ آمیز ہمدردی کا اظہار بھی کیا جو اس نے ایک بچی سے بچھڑے ہوئے باپ کے ساتھ محسوس کی تھی۔

امو خالہ نے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا اور اس بات پر شکر کیا تھا کہ چار سال پہلے وہ زویا کے سلسلے میں ایک نہایت سنگین غلطی کرنے سے بچ گئے ہیں۔ امو خالہ نے شامیر کا کندھا سہلاتے ہوئے دلار سے کہا۔ ''شامی! تجھے اسی لیے کہتی تھی نا کہ پرائے لوگوں میں رشتہ ایک اندھے کنوئیں کی طرح ہوتا ہے۔ ایسے کاموں میں جتنی بھی چھان بین کرلی جائے اتنا ہی کم ہوتا ہے۔''

شام کو چائے کی چسکی لیتے ہوئے امو خالہ نے کہا۔ ''چلو، میں تمہاری بات مان بھی لیتی ہوں مگر اس کو ڈھونڈو گے کیسے؟ جو کام اس کا شوہر اور اس کے دیگر رشتے دار پچھلے سال سوا سال میں نہیں کرسکے وہ تم دو چار ہفتوں میں کیسے کرلو گے..... پھر یہ بھی ذہن میں رکھو کہ ہم یہاں اجنبی ہیں شامیر۔''

''مگر کچھ بھی ہے۔ میں کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کام کر جائے۔''

فارہ بھی وہاں موجود تھی۔ لطف لینے والے انداز میں بولی۔ ''اچھا، وہ مل جائے آپ کو..... تو آپ کیا کریں گے اس کے ساتھ؟''

''کرنا کیا ہے؟ کم از کم یہ تسلی تو ہو جائے گی کہ اس کو اچھی طرح آئینہ دکھا دیا ہے...... پھر ایک پریشان حال باپ کو اس کی بچی مل جائے گی اور اگر اس پر کوئی جرم ثابت ہوگیا تو وہ سلاخوں کے پیچھے بھی جاسکتی ہے۔''

''کہیں ایسے چکروں میں پڑ کر آپ خود ہی سلاخوں کے پیچھے نہ پہنچ جائیں۔'' فارہ نے فقرہ چسپاں کیا۔

امو خالہ نے فارہ کو جھڑکا۔ ''شام کا وقت ہے، ایسی بری باتیں منہ سے کیوں نکال رہی ہو۔''

پھر وہ شامیر کی طرف متوجہ ہوکر بولیں۔ ''کچھ بھی ہے شامیر! تم کہیں اکیلے نکلتے ہو تو میرا دل ہولتا ہے۔ میں تمہیں اکیلے کہیں نہیں جانے دوں گی۔''

شامیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کسی معاملے کی تحقیق کرنے کا اور سوچنے کا شامیر کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ رات کو دیر تک ہوٹل کی بالکونی میں چہل قدمی کرتا رہا اور غور و خوض میں مصروف رہا۔ رابرٹ کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ بچی کے ساتھ غائب ہونے کے بعد زویا کہیں بہت دور نہیں گئی۔ وہ مغربی جرمنی کے اس شمالی علاقے کے کسی چھوٹے شہر یا قصبے میں موجود ہے۔ اگر وہ واقعی اس گٹارسٹ لڑکے ٹام کے ساتھ نکلی تھی تو پھر اسے ڈھونڈنے کے لیے ایک طریقہ اپنایا جاسکتا تھا۔ چار سال پہلے ''گٹارسٹ ٹام'' سے ملنے کے بعد شامیر کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ میوزک کے حوالے سے تقریباً جنونی ہے۔ شہرت کی بھوک بھی اس کے اندر کافی نمایاں محسوس ہوتی تھی۔ شامیر کا تجربہ تھا کہ ایسے لوگ جس طرح کے حالات میں بھی ہوں، اپنے ''پیشن'' سے زیادہ دیر تک دور نہیں رہ سکتے۔ اگر ایسا تھا تو پھر اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ وہ اب بھی کسی نہ کسی طور میوزک سے اور علاقے میں ہونے والے ''کنسرٹس'' وغیرہ سے جڑا ہوا ہوگا۔ اسے ایسی جگہوں پر تلاش کیا جاسکتا تھا جہاں میوزک کی تقریبات کا انعقاد ہو۔

شامیر نے فارہ کے ساتھ مل کر نیٹ کے ذریعے ایسی تقریبات کا کھوج لگایا جو اس ایریا میں اگلے دو تین ہفتوں میں ہونے والی تھیں۔ اس سلسلے میں فارہ کی مقامی کزن افشاں نے بھی کردار ادا کیا۔ انہوں نے ان تقریبات کی ایک لسٹ بھی تیار کرلی۔ افشاں کے پاس ڈرائیونگ لائسنس

موجود تھا۔ اس نے کرائے کی ایک چھوٹی کار کا انتظام بھی کرلیا۔ اگلے تین روز میں انہوں نے قرب وجوار کے ایسے چار پانچ فنکشنز اٹینڈ کیے۔ یہ ایک طرح سے تفریح بھی تھی اور کام بھی تھا۔ وہ تینوں گاڑی پر نکل جاتے تھے، اموخالہ ہوٹل میں ہی موجود رہتی تھیں اور گاہے بگاہے انہیں فون کرتی رہتی تھیں۔ میوزک کے ان فنکشنز میں وہ مختلف سنگرز اور موسیقاروں سے بھی مل رہے تھے اور گٹارسٹ ٹام کے بارے میں سن گن لینے کی کوشش کر رہے تھے......

زویا کے پریشان حال شوہر رابرٹ کا اداس چہرہ اکثر شامیر کی نگاہوں میں گھومتا رہتا تھا۔ اپنی بچی کے لیے اس کی تڑپ واقعی سمجھ میں آنے والی تھی۔ ایک روز وہ پھر اکیلا ہی رابرٹ سے ملنے نکل گیا۔ چند منٹ میں وہ ہوٹل سے پیدل ہی اس کے گھر تک پہنچ گیا۔ اسے ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی کہ رابرٹ اسے اس حال میں ملے گا۔ یہ شام تقریباً آٹھ بجے کا وقت تھا۔ رہائشی کالونی کی اس اندرونی سڑک پر روشنی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ اس نے کئی بار ڈور بیل کے بٹن پر انگلی رکھی مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر اس نے رابرٹ کے سیل فون کا نمبر ملایا مگر وہاں بھی بس بیل ہی جاتی رہی۔ دفعتاً شامیر کو اندازہ ہوا کہ گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ اسے ہولے سے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ گیرج میں رابرٹ کی سفید گاڑی موجود تھی۔ اچانک اسے لگا کہ کسی کے کراہنے کی آواز آئی ہے۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوگیا۔ لیونگ روم میں اس نے رابرٹ کو دیکھا۔ وہ فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کے سر کے عقبی حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ لکڑی کی ایک الماری اس طرح الٹی تھی کہ رابرٹ کا نچلا دھڑ اس کے نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ الماری میں رکھے ہوئے رنگ برنگے کھلونے رابرٹ کے اردگرد بکھر گئے تھے۔ اس نے اپنا زخمی سر دونوں ہاتھوں میں تھامے تھامے شامیر کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا رابرٹ؟'' شامیر نے چلانے والے انداز میں کہا۔

''وہ ...... ابھی ...... ادھر ہی ہے۔'' رابرٹ نے آنکھوں سے دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بمشکل کہا۔

شامیر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پہلے الماری کو رابرٹ کے اوپر سے ہٹائے یا پہلے اس جانب دیکھے جدھر رابرٹ نے اشارہ کیا تھا۔ جونہی وہ اس کے اشارے کی جانب بڑھا، ایک پرچھائیں سی کسی گوشے سے نکل کر اس پر جھپٹی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ شامیر اپنا دفاع کرسکتا۔ دھکا لگنے سے وہ صوفے پر جاگرا۔ تاہم اس نے حملہ آور کو دوسرا موقع نہیں دیا۔ یہ کوئی نوجوان ہی لگتا تھا۔ قد کافی لمبا تھا۔ مقامی غنڈوں اور اٹھائی گیروں کی طرح اس نے اپنا چہرہ دودھیا رنگ کے ایک اسکائی ماسک میں چھپا رکھا تھا۔ وہ دوبارہ شامیر پر جھپٹا تو شامیر نے دائیں ٹانگ سیدھی اس کے چہرے پر رسید کی۔

''یو باسٹرڈ......'' حملہ آور نے شامیر پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور اس سے لپٹ گیا۔

پندرہ بیس سیکنڈ تک دونوں گتھم گتھا رہے۔ شامیر کوئی کمزور حریف نہیں تھا، حملہ آور کو جواب میں دو چار کراری ضربیں سہنا پڑیں۔ پھر اچانک شامیر پشت کے بل ایک دیوار سے ٹکرایا، کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور تاریکی چھاگئی۔ حملہ آور نے اس تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے باہر کو دوڑ لگا دی...... شامیر اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اس کے پیچھے لپکا مگر شامیر کے سڑک پر پہنچنے تک وہ کہیں اوجھل ہوچکا تھا۔ شامیر واپس رابرٹ کی طرف لپکا۔ موبائل فون کی ٹارچ کی روشنی میں اس نے دیکھا، رابرٹ الماری کے نیچے سے نکلنے میں تقریباً کامیاب ہوچکا تھا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ شامیر کی مدد سے پوری ہوگئی۔ شامیر کو یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا کہ رابرٹ خود ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا ہے۔ اس کے جسم پر اور بھی چوٹیں تھیں مگر سر کی چوٹ شدید تھی۔

لائٹ آف ہونے کی وجہ یہ تھی کہ شامیر کے ٹکرانے سے بجلی کے مین سوئچ کو نقصان پہنچا تھا۔ رابرٹ نے بیٹری سے چلنے والا ایک بڑا لیمپ روشن کردیا۔ شامیر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتا تھا مگر اس نے انکار کردیا۔ شامیر نے وہیں پر اسے فرسٹ ایڈ دی۔ اس کے سر کا خون بند کیا۔ شامیر کی اپنی کمر پر بھی کافی چوٹ آئی تھی اور اینٹھن محسوس ہو رہی تھی مگر وہ فی الحال اسے نظر انداز کیے ہوئے تھا۔

''کیا تم پولیس کو اطلاع دینا چاہتے ہو؟'' شامیر نے پوچھا۔

''نہیں ...... کوئی فائدہ نہیں۔ مزید پریشانی ہوگی۔ خدا کا شکر ہے جان بچ گئی ہے۔''

''لیکن یہ کون تھا؟ کیا چاہتا تھا؟''

''کون ہے...... کا تو ٹھیک سے پتا نہیں۔ مگر چاہتا یقیناً یہی تھا کہ مجھے مارا پیٹا جائے، ہراساں کیا جائے۔ شاید یہ زویا کا شوہر ہونے کی سزائیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟ کیا پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟''

''ایک دو دفعہ چھوٹے موٹے واقعات ہوئے

ہیں۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔
''یہ لمبے قد کا شخص...... ٹام تو یقیناً نہیں تھا۔''
''ٹام نہیں تھا مگر اس کا کوئی ساتھی تو ہو سکتا ہے......
ویسے بھی...... صرف ٹام ہی کے ساتھ تو اس کا ''افیئر'' نہیں تھا۔'' اس نے کراہتے ہوئے عجب دل گرفتہ لہجے میں کہا...... اور بچی کے کھلونوں کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

شامیر نے اسے منع کیا اور خود کھلونے سمیٹ کر ایک الماری میں رکھے۔ رابرٹ کی ہلکی نیلی آنکھوں میں چمکتی ہوئی نمی نے اسے تڑپا دیا۔ رابرٹ نے اسے بتایا۔ ''غلطی میری ہی تھی۔ میں اندرونی دروازہ لاک کرنا بھول گیا تھا۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''میں آج کل ایک مسلمان عالم کی لکھی ہوئی دینی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ سات بجے کے قریب اسٹڈی روم میں چلا گیا۔ اسی دوران میں وہ دیوار پھاند کر اندر آیا اور جونہی موقع ملا، مجھ پر پل پڑا۔ شاید وہ زیادہ نقصان پہنچاتا مگر اسی دوران میں تم نے ڈور بیل بجادی۔''

شامیر نے تھوڑی سی کوشش سے گھر کی بجلی بحال کردی۔ رابرٹ کی ٹانگوں پر بھی گہرے نیل آئے تھے اور کئی چھوٹی بڑی خراشیں تھیں۔ اس نے لنگڑاتے ہوئے پورے گھر کا چکر لگایا۔ شامیر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ بظاہر گھر سے کوئی چیز اٹھائی نہیں گئی تھی۔ ہاں توڑ پھوڑ ضرور ہوئی تھی۔

شامیر نے رابرٹ کی ایک دو مزید چوٹوں پر بینڈیج کی۔ بینڈیج کے لیے کاٹن لینے کے لیے وہ بالائی منزل پر گیا تو وہاں ایک کمرے میں اس کی نظر زویا کی ایک کافی بڑی فریم شدہ تصویر پر پڑی۔ یہاں بھی وہ پینٹ شرٹ میں تھی۔ اس کے گھنے اور غیر معمولی طور پر لمبے بال جو اس کی شخصیت کو بہت نکھارتے تھے، نئے فیشن کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں بدل چکے تھے۔ شامیر کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ دھیان سے اس تصویر کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کی شادابی وہی تھی۔ وہ مشرقی اور مغربی حسن کا دلنواز امتزاج تھی۔ سرخ و سپید رنگت میں ایک خوبصورت سا گندمی پن بھی شامل ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں شامیر کی سماعت میں زویا کا ایک بھولا بسرا فقرہ گونج گیا...... فرینکفرٹ کی سیر کے دوران میں یہ فقرہ اس نے اپنی گلابی اردو میں کہا تھا۔ ''شومیر! کبھی کبھی مجھ کو لگتا کہ میں ڈور کے بجائے نزدیک کی تصویر میں زیادہ آچھا ناہیں لگتا۔''
شامیر نے فوراً اس کے خیال کو رد کیا تھا۔ اس نے ایک دراز

سے کاٹن لی اور ایک آہ سی بھر کر پلٹ آیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کی نگاہ ایک سی سی ٹی وی کیمرے پر پڑی۔ بالکل چھوٹے سائز کا ایک ایسا کیمرا اسے گھر کے بیک یارڈ میں بھی نظر آیا تھا۔ مقامی طور پر گھروں اور شاپس میں ایسے کیمرے عام نظر آتے تھے۔

رابرٹ کی بینڈیج کرتے ہوئے شامیر نے ایک بار پھر اسے مشورہ دیا کہ وہ اگر مناسب سمجھتا ہے تو پولیس کو انفارم کردے۔ اس کے کیمروں میں فوٹیج وغیرہ بھی موجود ہوگی، بہرحال رابرٹ نہیں مانا۔ لگتا تھا کہ اسے حوصلہ نہیں ہو رہا۔

اس کی بینڈیج کے بعد شامیر نے اسے پین کلرز کھلائیں اور اس کے پاس بیٹھ کر اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ اس نے رابرٹ کو بتایا کہ وہ اپنے طور پر کس طرح زویا کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ شامیر کی باتوں اور اس کے طریقہ کار کے بارے میں سن کر رابرٹ متاثر ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ایک موہوم سی امید نظر آنے لگی۔ یوں لگا کہ وہ وقتی طور پر...... کچھ دیر پہلے پیش آنے والے سنگین واقعے کو بھی بھول گیا ہے۔

☆☆☆

شامیر ہوٹل میں آکر چپکے سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حملہ آور کے ساتھ دھینگا مشتی میں اس کی کمر پر چوٹ آئی تھی۔ بنیان کی چپچپاہٹ سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ تھوڑا بہت خون بھی رسا ہے۔ وہ اموخالہ کو اس بارے میں بتا کر پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں فارہ کو اس صورت حال سے آگاہ کیا جاسکتا تھا۔ اس کا فائدہ یہ بھی تھا کہ اگر چوٹ پر مرہم پٹی کی ضرورت ہوتی تو وہ کر سکتی تھی۔

فارہ ساتھ والے کمرے میں امو اور افشاں کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ تین بیڈز کا کشادہ کمرا تھا۔ اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ امو دوا کھا کر سو چکی تھیں۔ افشاں اور فارہ جاگ رہی تھیں۔ شامیر نے فارہ کو ضروری بات کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں بلالیا۔ شامیر کی قمیص کا پھٹا ہوا گریبان دیکھ کر فارہ کچھ چونکی۔ شامیر نے اسے سارے واقعے سے آگاہ کردیا۔ نامعلوم حملہ آور سے دھینگا مشتی کا سن کر وہ کچھ خوفزدہ بھی ہوئی۔ اس نے اوپر تلے کئی سوال جڑ دیے۔

پھر وہ اپنی چھوٹی سی ناک چڑھا کر بولی۔ ''دیکھیں اب ہمیں پتا تو چل گیا ہے کہ وہ کس قماش کی لڑکی تھی۔ اب آپ دفع کیوں نہیں کردیتے اس سارے معاملے کو؟''

شامیر نے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تو ہے فارہ! اب مجھے زویا سے زیادہ تجسس اس بچی کے سلسلے میں ہے جسے اس کے باپ سے جدا کردیا گیا ہے۔ اس بے چارے کی حالت قابلِ رحم ہے۔''

شامیر نے اب اپنی قمیص اور بنیان اتار دی تھی۔ فارہ نے اس کی پشت کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چوٹ آئی ہے اور کٹ بھی لگا ہے محترم جیمز بانڈ صاحب۔''

اس نے پائیوڈین سے اس کا زخم صاف کیا اور بینڈیج میں مصروف ہوگئی...... ساتھ ساتھ وہ گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، گھر میں گھسنے والا کون ہوسکتا ہے؟''

''ابھی کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ایک بالکل ہی علیحدہ معاملہ ہو۔''

فارہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو بڑی نرمی اور ملائمت سے شامیر کی کمر پر حرکت دے رہی تھی۔ اس کی چوڑیوں کی مدھم کھنکھناہٹ شامیر کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ یہاں جرمنی پہنچ کر جب سے زویا کے بارے میں اوپر تلے منفی انکشافات ہونا شروع ہوئے تھے، شامیر کے دل کا موسم بھی کچھ بدل سا گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اب اپنے آس پاس فارہ کی موجودگی اسے اتنی بری نہیں لگتی تھی جتنی پہلے۔ وہ اب واضح طور پر جان چکا تھا کہ اس کے حوالے سے فارہ اپنے اندر رومانی جذبات رکھتی ہے...... اور یہ بھی اچھی طرح جان گیا تھا کہ اموخالہ اس معاملے سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ وہ زندگی میں کبھی اموخالہ کی دل شکنی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن اپنی اور فارہ کی عمروں کا فرق بھی اس کے سامنے تھا...... پھر دوسری بات زویا کی یاد کا کانٹا تھا جو اس کے دل میں اتر کر ٹوٹ چکا تھا۔ وہ کم از کم ایک بار تو اس کا سامنا ضرور کرنا چاہتا تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے؟'' فارہ اس کی پشت پر کھڑے کھڑے بولی۔

''فارہ! کسی وقت سوچتا ہوں، کہیں ہمارے سامنے کوئی اسموک اسکرین ہی نہ ہو۔ کیا پتا زویا کے سلسلے میں جو کچھ ہمارے سامنے آرہا ہے، وہ اس طرح نہ ہو جس طرح ہمیں لگ رہا ہے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ اس کی چوٹ پر میڈیکل ٹیپ چپکاتے ہوئے بولی۔

''کئی دفعہ چیزیں اس طرح نہیں ہوتیں جس طرح نظر آرہی ہوتی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''اور کئی دفعہ اس سے کہیں زیادہ بری ہوتی

ہیں جس طرح نظر آرہی ہوتی ہیں۔'' فارہ نے بظاہر نرم شائستہ لہجے میں کہا تھا لیکن وہ چونکہ شامیر کی پشت پر کھڑی تھی لہٰذا وہ اس کے نہایت کڑوے غصیلے تاثرات نہیں دیکھ سکا۔ یہ غصہ یقیناً زویا کے لیے ہی تھا جو اس بری طرح آشکار ہونے کے بعد بھی شامیر کے ذہن سے نکل نہیں پا رہی تھی۔

''فارہ! ویسے کسی وقت میرے ذہن میں آتا ہے کہ اگر زویا......''

''ارے، یہ دیکھیں۔'' فارہ نے موضوع بدلنے کے لیے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

''کیا ہے؟'' شامیر نے پوچھا۔

''آپ کے دائیں کندھے کے نیچے بالکل ساتھ ساتھ دو تل ہیں۔ بالکل...... بالکل اسی طرح جس طرح میرے ہیں۔'' اس نے ذرا رک کر کہا۔

''عجیب بات ہے۔'' شامیر نے کہا۔

''آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ ٹھہریں، میں آپ کو دکھاتی ہوں۔'' اس نے ہاتھ پیچھے موڑ کر تیزی سے اپنی ''بکنی'' کی زپ کھولی اور آگے آکر کمر شامیر کے سامنے کر دی۔

اس کی کمر اور اس کا ایک پہلو آگے تک نظر آرہا تھا۔ زیریں لباس جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ بے باکی سے مڑ کر شامیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شامیر اس کے کیمیں بدن سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ''ہاں تل...... تو ہیں۔''

''تل ہیں اور بالکل آپ ہی کی طرح کے ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں جذبات کو بھڑکانے والی شوخی دکھائی دے رہی تھی۔

شامیر نے جلدی سے منہ پھیرا اور الماری سے اپنے لیے دوسری قمیص نکالنے لگا۔

☆☆☆

شامیر ایک بار پھر فارہ کے ساتھ زویا کے ''تلاش مشن'' پر تھا۔ افشاں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی لہٰذا آج وہ شامیر اور فارہ کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ اس قسم کی صورتِ حال فارہ کو زیادہ بھاتی تھی کہ جب وہ اور شامیر کہیں اکیلے ہوتے تھے۔ حسبِ پروگرام انہوں نے ایک قریبی قصبے ''گوڈال مین'' میں منعقد ہونے والا ایک ورائٹی شو دیکھا جس میں میوزک کا رنگ کا بھی تھا اور کئی علاقائی بینڈز پرفارم کر رہے تھے۔ یہ سنڈے کا دن تھا۔ ورائٹی شو دوپہر چار بجے کے قریب ختم ہوگیا۔ فارہ اصرار کر کے شامیر کو ایک سنیما میں لے گئی۔ یہاں ایک سنسنی خیز ہارر فلم تھری ڈی میں دکھائی جا رہی تھی۔ ہال کی نیم تاریکی میں جب بھی کوئی خوفناک سین آتا وہ اپنی انگلیاں شامیر کے بازو کے گوشت میں پیوست کر دیتی۔ کسی وقت اپنا سر اس کے کندھے پر ڈال دیتی۔ انٹرول کے وقت اس نے یونہی پیچھے مڑ کر دیکھا اور چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گئی۔ نشستوں کی پانچ چھ قطاریں چھوڑ کر اسے جو چہرہ نظر آیا، وہ اس کے لیے ہرگز اجنبی نہیں تھا۔ وہ زویا کا چہرہ تھا، وہ نیچے جھک کر ایک چھوٹی بچی کے بوٹوں کے تسمے باندھ رہی تھی۔ شاید وہ فلم شروع ہونے کے بعد ہال میں داخل ہوئی تھی ورنہ عین ممکن تھا کہ اس سے پہلے ہی اس کی یا شامیر کی نظر اس پر پڑ جاتی۔

فارہ نے جلدی سے اپنا رخ اسکرین کی طرف کر لیا۔ چند سیکنڈ میں اس کے جسم کے ہر مسام نے پسینا اگل دیا تھا۔ وہ کئی روز سے شامیر اور افشاں کے ساتھ مل کر زویا اور ٹام کو تلاش تو کر رہی تھی مگر ہر لحظہ خوفزدہ بھی تھی کہ کہیں ان میں سے کوئی مل ہی نہ جائے اور...... آج یہ ہو گیا تھا۔ شامیر پچھلے تین چار منٹ سے فون پر اموسے بات کرنے میں مصروف تھا...... اور یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ اسی دوران میں ایک اور اچھا کام ہوا۔ ہال کی روشنیاں ایک بار پھر آف ہو گئیں۔ فلم شروع ہو رہی تھی مگر جو فلم فارہ کے اندر شروع ہوئی تھی اس نے سب کچھ تہ و بالا کر دیا تھا...... جس کی تلاش میں شامیر مارا مارا پھر رہا تھا، وہ اس کے عقب میں صرف چند میٹر کے فاصلے پر موجود تھی...... ہاں یہ وہی تھی۔

تین چار منٹ بعد فارہ، شامیر سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''میں ذرا واش روم تک جانا چاہ رہی ہوں۔''

''میں ساتھ آؤں؟'' شامیر نے کہا۔

''نہیں، آپ بیٹھیں۔ بس ایک منٹ میں آئی۔''

وہ تیزی سے واش رومز تک پہنچی۔ اپنے عقب میں دیکھ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور بڑے ہراساں لہجے میں امو پر انکشاف کیا کہ اس نے ابھی چند منٹ پہلے کیا دیکھا ہے۔

امو کے لب و لہجے میں بھی شدید تشویش ابھر آئی۔ وہ کانپتی ہوئی سی آواز میں بولیں۔ ''تمہیں یقین ہے کہ وہ وہی ہے؟''

''ون ہنڈرڈ اینڈ ون پرسینٹ امو! اس کی بچی بھی ساتھ ہے۔ کسی اور کے بارے میں تو مجھے پتا نہیں چلا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ شو ختم ہونے پر بہت زیادہ امکان ہوگا کہ شامیر اسے دیکھ لے۔''

''ہاں امو! یہ زیادہ بڑا ہال نہیں ہے......''

''اچھا ایک کام کرو۔'' امو نے تیزی سے اس کی

بات کاٹی۔ ”ابھی وہاں سے نکل آؤ۔ کوئی بھی بہانہ کردو...... کہہ دو کہ طبیعت خراب ہے۔“

”بس یہی بات سمجھ میں آرہی ہے۔“ فارہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

دو منٹ بعد فارہ واپس شامیر کے پاس موجود تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر پچھلی نشستوں پر کچھ دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر کچھ بھی واضح نظر نہیں آیا تھا۔

شامیر نے اسکرین سے توجہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ”طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ متلی سی محسوس ہورہی ہے۔“

”تو پھر؟“

”میرا خیال ہے کہ...... چلتے ہیں۔“

شامیر کے لیے یہ جواب غیر متوقع تھا مگر فارہ کافی اکھڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس حالت میں فلم کیا دیکھی جاسکتی تھی۔ تھوڑے سے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”اوکے تو چلتے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بائیں جانب والے دروازے کی طرف سے نکلنا چاہتا تھا لیکن فارہ دائیں جانب کے اگلے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ شامیر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں کیا کھیل کھیلا گیا ہے۔

☆☆☆

کہتے ہیں کہ ایک دروازہ بند ہو تو ایک دروازہ کھل بھی جاتا ہے۔ فارہ اور امو نے شامیر کے لیے ایک دروازہ بند کیا تھا، تین چار روز بعد ایک اور راستہ شامیر کے لیے کھل گیا۔ وہ فیس بک پر زویا کی فرینڈ دراز قد جین کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ پیڈر بورن سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ کیسل نام کے اس شہر کا فاصلہ پیڈر بورن سے 80 کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ یہ آدھا فاصلہ شامیر نے طے کیا اور آدھا جین نے...... اسی روز سہ پہر چار بجے کے لگ بھگ وہ دونوں ایک خوبصورت جھیل کے کنارے ایک چھوٹے سے جرمن گاؤں میں موجود تھے اور ایک ریستوران میں بیٹھے تھے۔ ریستوران کی بالکونی سے دور تک پون چکیوں کی قطاریں نظر آرہی تھیں۔ جین کے لمبے گھنگرالے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ ہوگئی تھی اور جسمانی لحاظ سے متوازن لگنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی نظر آرہی تھی۔ پچھلے دس پندرہ منٹ میں وہ دونوں بہت سی تمہیدی اور رسمی باتیں کرچکے تھے اور اب اصل موضوع پر آچکے تھے۔

جین نے دکھی لہجے میں کہا۔ ”وہ تم سے محبت کرتی تھی شامیر...... بہت زیادہ لیکن جب تم دونوں میں اختلاف ہوا اور تم اسے چھوڑ کر چلے گئے تو...... وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ تم اس سے رابطہ کرو گے اور کچھ نہیں تو تمہارا کوئی میسج ہی آجائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اسے بہت دکھ تھا کہ تم نے اس کی والدہ پر ہاتھ اٹھایا، انہیں زخمی کیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس کا غصہ کم ہوگیا تھا اور وہ تمہیں اس پر بھی معاف کرنے کو تیار تھی لیکن تم دونوں میں کبھی رابطہ ہی نہیں ہوسکا۔ میرے پاس بھی تمہارا کوئی کونٹیکٹ نہیں تھا ورنہ میں ہی تم سے بات کرنے کی کوشش کرتی۔“ پھر اس نے ذرا رک کر دھیان سے شامیر کو دیکھا اور بولی۔ ”ویسے تمہارے پاس تو میرا رابطہ نمبر موجود تھا۔ تم نے بھی کبھی رابطے کی کوشش نہیں کی۔“

”نہیں جین! میرے پاس تمہارا رابطہ نمبر نہیں تھا، ہوتا تو شاید......“

وہ اسے غور سے دیکھ کر بولی۔ ”کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ نہیں تھا۔“

نفی میں سر ہلاتے ہوئے شامیر نے قدرے بیزاری سے کہا۔ ”جین ڈیئر! گزری باتوں کا ماتم کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، ہمیں موجودہ حالات پر بات کرنی چاہیے...... میں...... یہاں آکر بے حد مایوس ہوا ہوں۔ جین! شاید میں یہاں نہ ہی آتا تو بہتر ہوتا، وہ جو ایک خوبصورت تصور تھا اس کے بارے میں وہ تو برقرار رہتا۔ وہ ساری دلگداز یادیں تو تہس نہس نہ ہوتیں۔“

جین نے ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولی۔ ”شامیر! میں اس کے موجودہ حالات کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ تم سے بریک اپ ہونے کے بعد وہ کچھ الگ تھلگ سی ہوگئی تھی۔ رہی سہی کسر اس دوسرے واقعے نے پوری کردی جس میں ان کے گھر ڈکیتی کی واردات ہوئی اور اس کی والدہ سارہ سخت زخمی ہوئیں۔ اس واقعے کے بعد تو وہ اپنے فرینڈز اور دیگر ملنے جلنے والوں سے بالکل کٹ سی گئی تھی...... پھر وہ لوگ ویسے ہی میونخ سے نکل کر ایسن چلے گئے۔ پھر ایک دفعہ خشامہ کی زبانی مجھے اس کی شادی کی خبر ملی تھی...... اور مجھے صدمہ ہوا تھا۔ میں پھر کہوں گی اس نے پہلی بار جس شخص کو چاہا وہ تم تھے شامیر!“

”یہ کیسی چاہت تھی جین! جو ایک چھوٹی سی غلط فہمی دور نہ کرسکی، ایک چھوٹی سی قربانی نہ دے سکی اور ایک چھوٹا سا

رابطہ نہ کرسکی ہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے کبھی اس کی محترم والدہ پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا...... نہ ہی کبھی میں نے اپنے اندر یہ ضد پالی تھی کہ میں نے شادی کے بعد اسے پاکستان میں ہی رکھنا ہے۔ ایک بار ہم دونوں ایک ہوجاتے پھر سو راستے نکل سکتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ کچھ عرصہ پاکستان میں رہ کر میں امو خالہ اور فارہ سمیت یہاں آکر ''سیٹل'' ہوجاتا...... لیکن خیر...... اب تو یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ اب یہاں کے حالات دیکھ کر تو یوں لگتا ہے کہ جو ہوا شاید ٹھیک ہی ہوا۔''

شامیر نے جین کو زویا کے بارے میں ساری بات تو نہیں بتائی تھی تاہم اتنا بتا دیا تھا کہ اپنے شوہر، اعلیٰ خاندان کے رابرٹ لوئیس کے ساتھ بھی اس کی نہیں بنی...... اور وہ اس کی بچی کو لے کر غائب ہوچکی ہے۔

جین کتنی ہی دیر گم صم رہی۔ اس کی آنکھوں میں جھیل جیسی گہرائی تھی اور ذہانت و معاملہ فہمی کی غیر معمولی چمک تھی، وہ بولی۔ ''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ہم واقعات کو بھول جاتے ہیں لیکن واقعات ہم کو نہیں بھولتے...... جو ہم کہتے ہیں، سنتے ہیں اور کرتے ہیں، وہ بہت دیر تک ہمارے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔'' اس نے ذرا توقف کیا اور شامیر کی طرف دیکھ کر ڈرامائی لہجے میں کہنے لگی۔ ''برادر شامیر! تمہیں یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے کسی پاکستانی سیاستدان کی خفیہ پراپرٹی والا معاملہ پیش آیا تھا۔ اس معاملے کی تحقیق زویا کی طرف سے ہی شروع ہوئی تھی اور تمہاری جرمنی آمد بھی اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔''

شامیر نے چونک کر جین کی طرف دیکھا۔ ''جین! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

وہ اسی کھوئے کھوئے موڈ میں بیٹھی رہی اور کولڈ کافی کے مگ کے کنارے کو انگلی سے سہلاتی رہی۔ گمشدہ آواز میں بولی۔ ''پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس کہتی ہے کہ زویا اور اس کے گھر والوں نے بہت کچھ چھپایا ہے...... بہت زیادہ چھپایا ہے۔ یہ سب کچھ ویسے نہیں ہے جیسے نظر آتا ہے۔''

''کیا ویسے نہیں ہے؟''

''شاید بہت کچھ...... کم از کم ایک واقعہ تو ایسا ہے جس کے بارے میں، میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اس طرح نہیں تھا جس طرح نظر آیا۔''

''کون سا واقعہ؟''

''بظاہر چھوٹا سا واقعہ ہے۔ یقیناً تمہیں یاد ہی ہوگا۔ چار سال پہلے جب تم یہاں تھے تو زویا کی کار کا کسی دوسری گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ گاڑی سے نکلنے والی عورتوں نے زویا کو بے دردی سے زدوکوب کیا تھا۔ اس کا ہاتھ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ زویا کو مارنے والی سیاہ فام عورتوں میں سے ایک کو میں جانتی ہوں اور اسی بنا پر یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ وہ ایکسیڈنٹ جان بوجھ کر کیا گیا تھا اور زویا کو سزا دی گئی تھی۔''

شامیر سناٹے کے عالم میں جین کی بات سن رہا تھا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی کو کھجاتے ہوئے بولا۔ ''تم کہنا چاہ رہی ہو کہ اس واقعے کا تعلق پاکستانی سیاستدان کی پراپرٹی والے واقعے سے ہے؟''

''اس ''ایکسیڈنٹ'' کی حد تک تو میں یہ بات یقین سے کہہ سکتی ہوں۔''

ایک عجیب سا سناٹا ان دونوں کے درمیان سنسناتا رہا۔ ہوا بہتی رہی اور تراشی ہوئی سرسبز پہاڑی ڈھلوانوں پر طویل قطار میں لگی ہوئی پون چکیاں حرکت کرتی رہیں۔

کئی سیکنڈ بعد شامیر نے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔ ''اور باقی واقعات کے بارے میں تم کیا کہتی ہو؟''

''ان کے بارے میں...... بس...... اتنا کہہ سکتی ہوں کہ...... زویا، اس کی والدہ اور دیگر گھر والے پورا سچ نہیں بتا رہے...... میں یہ نہیں کہتی کہ باقی واقعات بھی سیاستدان والے واقعے سے منسلک ہوں گے...... مگر ان میں بھی کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔''

شامیر کے دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اونچی ناک اور گھنگرالے بالوں والی جین کو دیکھتا چلا جارہا تھا۔ پھر وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ ''میری معلومات کے مطابق زویا کی والدہ آج کل سرحدی شہر ایسن میں کہیں رہتی ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ...... مجھے ان سے ملنا پڑے گا۔''

''پتا نہیں کہ تمہارا ان سے ملنا ٹھیک رہے گا یا نہیں۔'' جین کے لہجے میں اندیشہ تھا۔

کچھ اندیشے تو شامیر کے ذہن میں بھی تھے مگر وہ اس حوالے سے عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کرچکا تھا اور جب وہ فیصلہ کرلیتا تھا تو پھر اندیشوں اور مصلحتوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

☆☆☆

شامیر بذریعہ انٹرسٹی ٹرین، پیڈربورن سے ''ایسن'' کے لیے روانہ ہوچکا تھا۔ نہایت آرام دہ، برق رفتار ٹرین جیسے ہوا میں تیرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

کھڑکیوں سے باہر سرسبز دیہات اور چھوٹے بڑے قصبوں کے مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے مگر شامیر اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ جین کی اس بات نے اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچادی تھی کہ جس روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں کچھ عورتوں نے زویا سے مار پیٹ کی تھی اور اس کا بازو ٹوٹا تھا، وہ اتفاقیہ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے وہ تکلیف تھی جو تفتیشی رپورٹ کے نتیجے میں پاکستانی سیاست دان سہراب درانی کو پہنچی تھی۔ جیسا کہ شامیر اچھی طرح جانتا تھا کہ اس تفتیشی رپورٹ کے منظرِ عام پر آنے کے دوران میں ہی سہراب درانی کے خلاف بہت سے مزید مقدمات کی بھرمار ہوگئی تھی اور پھر پاکستان میں اسے جیل جانا پڑ گیا تھا...... وہ اب تک جیل ہی بھگت رہا تھا۔ تو کیا اس نے وہاں پاکستانی جیل میں ہوتے ہوئے بھی ایک صحافی خاتون کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا تھا اور اگر اس نے واقعی بنایا تھا تو پھر شامیر کو کیوں چھوڑ دیا تھا جو وہیں پاکستان میں موجود تھا اور سہراب درانی کو آسانی سے دستیاب بھی تھا؟ دوسرا سوال شامیر کے ذہن میں یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر زویا یا اس کی فیملی کسی قسم کی انتقامی کارروائی کا نشانہ بنی تھی تو پھر انہوں نے کوئی قانونی کارروائی کیوں نہیں کی؟ زویا نے اس چینل سے مدد کیوں نہیں مانگی جس کے لیے وہ کام کر رہی تھی؟ بے شک بعد میں زویا نے چینل بدل لیا تھا لیکن یہ سہراب درانی والا معاملہ تو ڈبل اے چینل سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ ایسے ہی کئی سوالات اس کے ذہن میں مسلسل کلبلاتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ طویل سفر کرکے جرمنی کے اس سرحدی شہر ایسن میں پہنچ گیا۔

یہ دھواں دھار بارش والی ایک تاریک شام تھی۔ رہ رہ کر بجلی کڑکتی تھی اور آسمان سے چھاجوں پانی برسنے لگتا تھا۔ شامیر جانتا تھا کہ پیڈربورن میں اموخالہ اور فارہ بہت پریشان ہیں۔ اس نے فون پر ہی انہیں تسلی دی تھی اور بتایا تھا کہ اسے ضروری کام سے فوری طور پر ''ایسن'' جانا پڑ گیا ہے......کل تک لوٹ آئے گا۔

زویا کی والدہ سارہ جیم کا مکمل ایڈریس اسے ان کے داماد رابرٹ لوئیس سے ہی معلوم ہوا تھا۔ رابرٹ سے ہی اسے یہ بھی پتا چلا تھا کہ زویا کی والدہ اور اس کے دوسرے شوہر میں باہمی رضامندی سے علیحدگی ہو چکی ہے اور اب وہ اپنی منجھلی بیٹی کے ساتھ اکیلی ہی رہ رہی ہے۔

چھتری شامیر کے پاس موجود تھی مگر بارش ایسی تند و تیز تھی کہ وہ ٹیکسی سے اتر کر سارہ جیم کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے بری طرح بھیگ گیا۔ یہ ایک ڈھلوان پر بڑی سرسبز لیکن خاموش سی آبادی تھی۔ سارہ جیم کا مخروطی چھتوں والا گھر باقی آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ بالکونیوں میں ٹیولپ اور گلاب کے پھول بارش کی بوچھاڑوں میں بکھرتے محسوس ہوتے تھے۔ شامیر نے سوچا، یہی وہ گھر ہے جہاں سے ایک روز زویا دلہن بن کر رابرٹ کے ساتھ پیڈربورن روانہ ہوئی ہوگی۔

دروازے تک پہنچتے پہنچتے اس کی دھڑکن بڑھ چکی تھی۔ اس نے کال بیل دی۔ کچھ دیر بعد ایک کھڑکی میں روشنی ہوئی اور ایک سرو قد لڑکی نے دروازہ کھولا۔ وہ دبلی پتلی اور کافی کمزور نظر آ رہی تھی، اس کے باوجود اس میں زویا کی خاصی مشابہت موجود تھی۔ شامیر کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہی زویا کی منجھلی بہن حولیہ ہے۔ پہلے لڑکی نے جرمن میں کچھ کہا لیکن جب یہ دیکھا کہ شامیر سمجھ نہیں پا رہا تو انگلش میں بولی۔ ''فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

شامیر نے کہا۔ ''معاف کیجیے، ایسے موسم میں آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ میں مسز سارہ جیم سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس ان کے لیے ایک ضروری پیغام ہے۔''

اس سے پہلے کہ لڑکی کچھ کہتی یا مزید سوال پوچھتی، ایک وہیل چیئر دکھائی دی...... یہ چیئر کسی اندرونی کمرے سے نکل کر برآمدہ نما جگہ پر آئی تھی۔ اس پر فربہ اندام سارہ جیم موجود تھی۔ پچھلے چار سال میں وہ پہلے سے زیادہ فربہ اور شاید سخت گیر بھی ہوگئی تھیں۔

کڑے تیوروں کے ساتھ انہوں نے شامیر کی طرف دیکھا اور وہیں سے بولیں۔ ''کون ہو؟ کس سے ملنا ہے؟''

لڑکی نے اسے راستہ دیا تھا اور اب وہ گھر کے مختصر سے صحن میں آن کھڑا ہوا تھا۔ اس نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''آنٹی جان! شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں پاکستان سے شامیر ہوں۔ چینل کے ایک کام سے یہاں آیا ہوا ہوں۔ سوچا آپ سے ملتا جاؤں۔''

سارہ جیم جیسے دم بخود سی ہوگئیں۔ کئی سیکنڈ کے توقف کے بعد وہ بولیں۔ ''اب تم یہاں کیا لینے آئے ہو۔ کیا کوئی کسر رہ گئی تھی جسے پورا کرنا چاہتے ہو؟''

وہ ذرا آگے بڑھ کر بولا۔ ''میں آپ سے ایک گزارش کرنے آیا ہوں آنٹی جان! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج کل آپ اپنی بیٹی مسز زویا لوئیس کے لیے کچھ پریشان ہیں......اگر آپ......''

(جاری ہے)

شامیر نے زویا کی مما کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ زویا کی تلاش میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں تو اس کی بات سنتے ہی گویا انہیں کرنٹ سا لگ گیا۔
"لوشٹ اپ" وہ چنگھاڑیں۔ "مجھے حیرانی ہو رہی ہے۔ تمہیں اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ یہاں میرے دروازے پر چلے آؤ، تم ہماری مصیبتوں کی جڑ ہو۔ میں تمہاری منحوس شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ چلے جاؤ یہاں سے......"
شامیر نے تحمل سے کہا۔ "آنٹی! میں یہاں رکنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ بس آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔"
وہ پھر دہاڑیں۔ "اپنا منہ بند رکھو...... اور خبردار اگر اب تم اپنی گندی صورت کے ساتھ زویا کے اردگرد نظر آئے تو...... اب میں پولیس کو بلانے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں کروں گی۔"
وہ آگ بگولا ہو رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے نیچے بڑے بڑے ابھار تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ وہ پریشان کن حالات سے دوچار ہو کر کثرت سے مے نوشی کر رہی ہیں۔
شامیر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر وہ جنونی انداز میں دہاڑیں۔ "گیٹ آؤٹ...... میں کہتی ہوں گیٹ آؤٹ۔ ورنہ میں شوٹ کر دوں گی۔"
عالمِ جذبات میں سارہ جیم نے جیسے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ کرسی بری طرح ڈگمگا گئی۔ لڑکی نے شامیر کو باہر کی طرف دھکیلا اور ہیجی لہجے میں بولی۔ "پلیز، تم چلے جاؤ یہاں سے...... یہ کچھ بھی کر سکتی ہیں......"
شامیر نے بھی الٹے قدموں باہر نکلنا ہی مناسب سمجھا۔ سارہ جیم کی دہاڑیں پورے گھر میں گونج رہی تھیں۔ لڑکی حولیہ نے شامیر کو باہر نکال کر دروازہ بند کر دیا اور گرجتی برستی ماں کو لے کر کسی اندرونی کمرے میں چلی گئی۔
برستے موسم میں شامیر وہیں دروازے کے سامنے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر کھڑا رہا۔ اردگرد تاریکی اور ویرانی تھی۔ گھروں کی کھڑکیاں دروازے بند تھے، دور دور تک کسی ٹیکسی وغیرہ کے آثار بھی نہیں تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ بارش کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ قریباً دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ اچانک گھر کی ایک بالائی کھڑکی کھلی اور پھر فوراً بند ہو گئی۔ تین چار منٹ بعد بیرونی دروازہ کھلا اور زویا کی منجھلی بہن حولیہ کا سراپا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے سائز کی چھتری تھی اور وہ شامیر کو اشارے سے اندر بلا رہی تھی۔
اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ شامیر فوراً اندر چلا گیا۔ لڑکی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے ساتھ لے کر گھر کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ یہاں آتش دان روشن تھا اور کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ وہ شامیر کو دیکھ کر بولی۔
"یہاں اب کوئی سواری ملنے والی نہیں ہے۔ تم بری طرح بھیگ بھی چکے ہو۔ یہاں کافی سردی ہو گئی ہے۔ آگ کے سامنے بیٹھ جاؤ، کپڑے سوکھ جائیں گے۔ اگر پسند کرو تو میں تمہارے لیے کوئی گرم مشروب لے آتی ہوں۔"
"بہت شکریہ۔" شامیر نے بھی اسی کی طرح سرگوشی کے لہجے میں کہا۔
کوئی ایک گھنٹے بعد جب اس کی والدہ سو گئی تو وہ شامیر کے پاس آن بیٹھی۔ وہ کمزور اور بیمار دکھائی دیتی تھی۔ اس نے اس طوفانی رات میں شامیر کو پناہ تو ضرور دی تھی مگر اس کے رویے میں کوئی ایسی خاص ہمدردی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کی کچھ باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی اسی خیال کی حامی ہے کہ یہ ایشیائی مرد جو کم ترقی یافتہ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں، صرف دولت اور عورتوں کے شکار کے لیے یہاں آتے ہیں۔ ان میں سے کم ہی ہوتے ہیں جو بھروسے کے قابل ہوں۔
وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ چار برسوں بعد شامیر دوبارہ یہاں کیوں آیا ہے اور وہ اس کی والدہ سے کس پیغام کی بات کر رہا تھا؟
شامیر نے خلوص دل سے کہا۔ "حولیہ! میں جانتا ہوں کہ زویا اس وقت گمشدہ ہے اور تم لوگ اسے ڈھونڈ رہے ہو۔ میرا کام بھی ڈھونڈنا اور کھوج لگانا ہے۔ درحقیقت یہ میرا "پروفیشن" ہے...... یہاں میرے کچھ لنکس بھی ہیں، میں اس سلسلے میں مدد کر سکتا ہوں...... لیکن یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے جب تم مجھے یہاں کی سچویشن سے آگاہ کرو۔"
"ہمیں تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ

بے رخی سے بولی اور اس کا رنگ ہجرہ سرخی مائل ہوگیا۔
کچھ دیر بعد شامیر کی شائستہ گفتگو سے اس کا موڈ کچھ بحال ہوا۔ تاہم لہجے کی بیزاری برقرار تھی۔ وہ بولی۔ ''یہاں کے حالات میں تمہیں کیا بتاؤں۔ یہ ویسے ہی ہیں جیسے تم نے زویا کی فرینڈ جین سے سن لیے ہوں گے..... کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ پہلے تم زویا کو اجاڑ پچھاڑ کر چلے گئے۔ پھر میونخ میں ماما کے ہاں ڈکیتی کی واردات ہوگئی۔ اس میں ماما کی دونوں ٹانگوں میں چھ گولیاں لگیں۔ مالی نقصان کے علاوہ یہ جانی نقصان بھی بہت پریشان کن تھا۔ علاج پر پانی کی طرح یورو خرچ ہوئے۔ ایک وقت میں تو ہمارے لیے اپنے ''بریڈ مکھن'' کا انتظام بھی مشکل ہوگیا تھا۔ ایسے وقت میں زویا کے شوہر رابرٹ نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا۔ اس کا احسان ہم بھول نہیں سکتے۔''
شامیر نے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں لیکن جو کچھ مجھے پتا چلا ہے اس کے مطابق تو زویا اپنے شوہر کے ساتھ بھی خوش نہیں ہے۔''
''میاں بیوی میں ایسے تنازعات ہوتے ہی رہتے ہیں اور اس میں بھی زیادہ قصور شاید زویا کا ہی ہے۔ بہرحال یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں۔ مجھے ان پر ڈسکس کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔''
شامیر نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''اتنی بڑی واردات ہوگئی، آنٹی سارہ کی زندگی خطرے میں پڑ گئی مگر آپ لوگوں نے کوئی قانونی کارروائی نہیں کی بلکہ خاموشی سے میونخ چھوڑ کر یہاں اس دور دراز جگہ چلے آئے؟''
''کارروائی چل رہی ہے..... یہاں دیر تو ہوسکتی ہے اندھیر نہیں ہوگی۔ جلد ہی انصاف ملے گا۔'' زویا کی بہن نے مختصر جواب دیا۔
''ابھی تک کوئی مجرم پکڑا بھی گیا یا نہیں؟''
''ایک دو بندے پکڑے گئے ہیں۔ بڑا مجرم ملک سے باہر ہے مگر وہ بھی گرفتار ہوگا۔'' حولیہ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ اس کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑکی تک پہنچ کر اس نے باہر جھانکا۔ بجلی چمکی اور ٹیلوں پر بارش کی بوچھاڑیں دور تک نظر آئیں۔
وہ شامیر کی طرف گھوم کر بولی۔ ''ریفریجریٹر میں کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں مگر کسی طرح کی آواز پیدا نہ کرنا اور لائٹ آف رکھنا۔ ماما ساتھ والے کمرے میں سو رہی ہیں۔ وہ جاگ گئیں اور انہیں پتا چل گیا کہ تم یہاں ہو تو ایک قیامت کھڑی کر دیں گی۔''
''بہت شکریہ..... لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ.....''
''پلیز خاموش رہو۔'' حولیہ نے بیزاری سے شامیر کی بات کاٹی۔ ''اور میری بہت عاجزانہ التجا ہے کہ اب دوبارہ ادھر کا رخ کر کے ہماری مشکلوں میں اضافہ نہ کرنا۔ یہ ہمارے لیے اچھا ہوگا اور نہ تمہارے لیے۔ ماما آٹھ بجے اٹھتی ہیں۔ سات بجے تک تم ہر صورت یہاں سے نکل جانا۔''
وہ بے رخی سے باہر نکل گئی اور دروازہ بند کر دیا۔
اس کی ہدایت کے مطابق شامیر نے کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ اب بس آتش دان کی مدھم روشنی تھی۔ وہ اس کے سامنے ایک سنگل صوفے پر بیٹھ گیا اور موجودہ سچویشن کے بارے میں سوچنے لگا۔ زویا کی والدہ سارہ جیم سے مل کر شامیر کو پہلا تاثر یہی ملا تھا کہ وہ پہلے سے زیادہ غصیلی اور جنونی ہو چکی ہیں۔ غالباً وہ الکحل بھی بہت زیادہ لے رہی تھیں۔ اس کی ایک وجہ خاوند سے علیحدگی بھی ہوگی لیکن زیادہ اہم وجہ وہی زویا والے معاملات لگتے تھے۔ اب بھی بوتل اور گلاس وغیرہ کے ٹکرانے کی مدھم آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ یہ آوازیں اسی کمرے کی طرف سے آ رہی تھیں جس میں بقول حولیہ، آنٹی سارہ جیم موجود تھیں۔
کچھ دیر بعد یہ آوازیں تھم گئیں اور بارش کے شور کے علاوہ خاموشی چھا گئی۔ اندازہ ہوا کہ اپنے آپ میں کھولتی اور چیختی ہوئی وہ عورت دوبارہ سو گئی ہے۔
یورپ کے اکثر گھروں کی طرح یہ قدرے قدیم گھر بھی زیادہ تر لکڑی کا ہی بنا ہوا تھا۔ شامیر کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ کسی طرح سے کچھ مزید معلومات حاصل کر سکتا ہے۔
نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ آتش دان کے سامنے بیٹھے بیٹھے شامیر کو اونگھ آئی اور پھر وہ سو گیا۔
وہ کندھے پر لگنے والی ایک شدید ضرب کی وجہ سے جاگا تھا۔ اس کے کانوں میں قیامت کا شور تھا۔

ایک طوفان گھر سے باہر بپا تھا اور ایک گھر کے اندر۔ اس نے اپنے سامنے سارہ جیم کو دیکھا۔ وہ وھیل چیئر پر تھیں اور ان کے ہاتھوں میں بیس بال کا ایک مضبوط بیٹ تھا۔ وہ جنونی انداز میں چلا رہی تھیں اور شامیر کو ضربات لگا رہی تھیں۔ حولیہ ان کو روکنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی۔ چار پانچ چوٹیں کھانے کے بعد شامیر نے بیٹ پکڑ لیا اور اسے سارہ جیم کے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کی۔ ایسا کرتے ہوئے وھیل چیئر بری طرح ڈگمگا گئی اور شامیر کو لگا کہ سارہ جیم اوندھے منہ گریں گی۔ اس نے بیٹ کو کھینچنا بند کر دیا مگر اسے چھوڑا نہیں۔

سارہ جیم چلا رہی تھیں۔ ''تم گندے، منحوس ہندوستانی! تم نے ہمیں برباد کر دیا۔ تم سب ایک جیسے رذیل ہو۔ تم میرے خاوند سے بڑھ کر کمینے اور وہ کتا سہراب تم سے بڑھ کر کمینہ۔ تمہاری رگوں میں گندا گھٹیا خون ہے......'' وہ گالیاں دینے لگی۔

شامیر جواباً گرجا۔ ''آنٹی! ہوش کرو، کیا کیا ہے میں نے؟''

شامیر کے تند سوال نے جیسے جلتی پر تیل ڈال دیا۔ آنٹی سارہ کے منہ سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ جنونی آواز میں دہاڑی۔ ''تم پوچھتے ہو، تم نے کیا کیا ہے؟ یہ تم پوچھتے ہو......؟'' اس سے آگے گالیوں کی ایک بوچھاڑ تھی۔ وہ دیوانہ وار چلائی۔ ''تمہاری وجہ سے...... صرف تمہاری وجہ سے ہم پر یہ قیامتیں گزریں...... صرف تمہاری وجہ سے اس سور کی اولاد سہراب درانی نے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کی...... صرف تمہاری وجہ سے میری حاملہ حولیہ کو رات بھر اس کے شرابی غنڈوں نے روندا...... اسے پامال کیا۔ صرف تمہاری وجہ سے ہم اپنا منہ چھپا کر اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے...... اور تم پوچھتے ہو تم نے کیا کیا۔ تم سب پھانسی کے لائق ہو۔ تمہیں قطاروں میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون دینا چاہیے۔''

اس نے ایکدم کھینچ کر بیس بال کا بیٹ شامیر کے ہاتھوں سے چھڑا لیا اور پھر ایک طوفانی ضرب اس کے سر پر لگانا چاہی۔ اس مرتبہ شامیر نے یہ وار ہاتھوں پر روکا اور بیٹ کا نچلا سرا پھر پکڑ لیا۔ ''فار گاڈ سیک ماما...... چپ ہو جائیں۔ فار گاڈ سیک۔''

سارہ جیم نے اپنی داہنی ٹانگ سے حولیہ کو وحشیانہ انداز میں دھکیلا۔ وہ دبلی پتلی بیمار لڑکی لڑکھڑا کر آتش دان کے قریب جا گری۔ سارہ جیم گرجی۔ ''میری رائفل لے کر آ...... میں زندہ نہیں چھوڑوں گی اس کو...... اسی جگہ مار کر گاڑ دوں گی۔''

وہ بیٹ شامیر کے ہاتھوں سے چھڑانے کے لیے بار بار زور مارنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ خوفناک واویلا کر رہی تھی۔ اس کی نشے میں ڈوبی ہوئی ہیجانی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ جسے ڈکیتی کہہ کر چھپایا جاتا رہا ہے، وہ شاید ڈکیتی نہیں تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی آبروریزی کا ذکر بھی جنونی انداز میں کر رہی تھی اور کسی وقت دائیں ہاتھ سے اپنا سینہ کوٹنا شروع کر دیتی تھی۔ اچانک اس نے اپنے ہی زور سے وھیل چیئر الٹا دی اور پہلو کے بل فرش پر جا گری۔ حولیہ چلاتی ہوئی اس کی طرف لپکی۔ شامیر بھی آگے بڑھا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی......

☆☆☆

بارش جاری تھی لیکن پہلے سے کچھ ہلکی ہو چکی تھی۔ شامیر اور حولیہ نے اپنی کرسیاں آتش دان کے قریب گھسیٹ رکھی تھیں۔ آنٹی سارہ جیم کی بے ہوشی اب نیم بے ہوشی میں بدل گئی تھی...... وہ غنودگی کے عالم میں بھی بہت کرخت باتیں کر رہی تھی۔ ''میری زندگی برباد کر دی۔ میری حولیہ کی زندگی برباد کر دی...... اس کے بچے کو دنیا میں آنے سے پہلے مار دیا ظالموں نے......''
پھر وہ پتا نہیں کیا کیا اول فول بولنے لگ جاتی تھی۔ حولیہ نے ماں کی حالت دیکھتے ہوئے اسے کچھ ٹرنکولائزر دے دیے تھے لہٰذا اب وہ خاموشی سے سو رہی تھی۔

حولیہ کا مدقوق چہرہ دکھ اور خوف کی آماجگاہ تھا۔ وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔ ''مسٹر شامیر! ماما تمہیں دیکھ کر خود کو سنبھال نہ سکی۔ اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جواب تک کسی کو نہیں بتا پایا تھا۔ شش...... شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی ہو کہ ابھی یہ باتیں...... میرے شوہر کو بھی معلوم نہیں۔''
اس نے سسکی لی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اپنا زرد چہرہ اس نے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔

شامیر نے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہونے دیا۔ دو تین منٹ اسی طرح گزرے پھر حولیہ نے اچانک شامیر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”پلیز شامیر! ہم پر رحم کرنا۔ اب ہماری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ہم تینوں بہنوں اور ماما کے سوا کسی کو اس سانحے کی خبر نہیں ہے......“

”حولیہ! تم بے فکر رہو۔ کوئی بھی بات میرے سینے سے باہر نہیں نکلے گی۔“

حولیہ نے آنسو بہاتے بہاتے شامیر کی جانب دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو...... ہو تو تم وہی ایشیائی جس کی بات پر اعتبار کرنا دنیا کی سب سے بڑی بے وقوفی ہے مگر مجبوری ہے۔ یہ رسک تو اب لینا پڑے گا۔ خدا تمہارے دل میں ہمارے لیے مہربانی پیدا کردے۔

حولیہ نے خود کو کچھ سنبھال لیا تو شامیر نے اس سے پوچھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔

وہ بولی۔ ”پتا نہیں کہ تمہیں معلوم ہے یا نہیں مگر چار سال پہلے ایک جھگڑے میں زویا کا بازو ٹوٹنے کا جو واقعہ ہوا تھا، وہ بھی اسی انتقامی کارروائی کی کڑی تھا...... لیکن...... سمجھو کہ وہ تو بس ایک نمونہ تھا۔ جو اصل قیامت تھی، وہ ہم پر کوئی تین ماہ بعد ٹوٹی...... مم...... میں آج بھی اس رات کا تصور کرتی ہوں تو لگتا ہے کہ بے ہوش ہو جاؤں گی۔“ حولیہ کا رنگ مزید زرد ہو گیا اور آنکھوں میں پھر آنسو امڈ آئے۔

کچھ دیر بعد خود کو سنبھال کر بولی۔ ”میں پہلی بار ایک لمبے انتظار کے بعد بچے کی ماں بننے والی تھی۔ میں میونخ میں ماما کے پاس چند ہفتوں کے لیے رہنے آئی ہوئی تھی۔ زویا بھی فرینکفرٹ سے آئی ہوئی تھی۔ تمہارے چھوڑ جانے کی وجہ سے وہ بہت ”اپ سیٹ“ تھی۔ میں اس کی دلجوئی میں لگی رہتی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ بہت جلد خود مجھ پر غم کا ایک ایسا پہاڑ ٹوٹنے والا ہے جس کے لیے کوئی دلجوئی بھی کارگر نہیں ہوگی۔ اس شام آفس کے کام کے سلسلے میں زویا کو اچانک ایک قریبی قصبے میں جانا پڑ گیا تھا۔ رات کو میں اور ماما گھر میں اکیلی تھیں۔ آدھی رات کے وقت پانچ مسلح نقاب پوش تالے توڑ کر اور سیکیورٹی سسٹم ناکام بنا کر گھر میں گھس آئے۔ وہ بہت غیظ و غضب کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان کے تیور دیکھ کر ماما نے اپنی لائسنسی رائفل نکال لی مگر انہوں نے رائفل استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ماما کو دو گولیاں ماریں اور وہ گر گئیں۔ اس کے بعد......“

حولیہ کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔ اپنے آنسو روکنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

رک رک کر اور بار بار اپنی سانس بحال کر کے اس نے جو کچھ بتایا، وہ مختصراً یوں تھا...... وہ لوگ آئے تو زویا کے لیے تھے، اس کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے حولیہ ان کے ہتھے چڑھ گئی۔ انہوں نے زویا کے حصے کا ستم بھی حولیہ پر توڑا۔ بڑی بے رحمی سے اسے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس دوران میں اس کی ماں نے ایک بار پھر بیٹی کا دفاع کرنے کی کوشش کی تو اس پر مزید گولیاں چلائی گئیں۔ اس کی دونوں ٹانگیں شدید زخمی ہو گئیں اور وہ نیم بے ہوش ہو کر گر گئی۔ خوش قسمتی سے تو نہیں کہا جا سکتا، بدقسمتی سے حولیہ اس وقت تین ماہ کی حاملہ تھی۔ اس ستم کے بعد وہ اپنا بچہ ”کیری“ نہ کر سکی۔ اب ایک ستم بالائے ستم اور تھا...... اور وہ یہ کہ ڈاکٹروں کے مطابق حولیہ کا آئندہ ماں بننا ممکن نہیں رہا تھا۔ حولیہ اپنی روداد کا زیادہ تر حصہ بیان کر چکی تھی اور نڈھال سی نظر آ رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر اب بھی کسی وقت بجلی چمکتی تھی اور مخروطی چھتوں پر بارش کی صدا سنائی دیتی تھی۔ شامیر نے کہا۔ ”معاف کرنا، تم پر گزرنے والی قیامت کا سن کر دل خون کے آنسو رونے لگا ہے، لیکن ذہن میں بار بار ایک سوال بھی اٹھ رہا ہے۔ تم لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ یہ سب کچھ اس سہراب درانی نام کے بندے کی وجہ سے ہوا ہے؟“

”اس میں شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے مسٹر شامیر۔ وہ لوگ اتنے نڈر تھے کہ انہوں نے اپنی شناخت چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ تقریباً سات گھنٹے تک ہمارے گھر میں رہے تھے۔ انہوں نے جو کچھ بتایا اور آپس میں جو گفتگو کی، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سہراب اور نمرسی کے بندے ہی تھے۔“

”نمرسی...... یہ کون ہے؟“

”تم تحقیق کرنے والے صحافی ہو مسٹر شامیر! مگر

شاید تمہیں اس حوالے سے معلومات نہیں مل سکی ہیں۔ وہاں فرینکفرٹ میں تمہارا ہم وطن سہراب اور نمرسی ایک دوسرے کے پارٹنر تھے۔ نمرسی ایک خطرناک شخص کا نام ہے۔ بظاہر تو اسے کاروباری سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں وہ کسی ڈان سے کم نہیں ہے۔ اب تو خیر وہ اپنے گروپ سمیت جرمنی سے دفع ہو چکا ہے، تاہم تین چار سال پہلے تک اس نے یہاں قانون سے پوری پوری ٹکر لے رکھی تھی۔ اب سنا ہے کہ وہ کہیں میکسیکو وغیرہ میں روپوش ہے۔''

شامیر نے کہا۔ ''جب چار سال پہلے ہم سہراب کے بارے میں تحقیقات کر رہے تھے، میں نے اس کے کسی رونالڈو نامی پارٹنر کا نام تو سنا تھا، مگر یہ نمرسی؟''

حولیہ جلدی سے بولی۔ ''یہی تو وہ بد بخت ہے، تم نمرسی کو اس کا نک نیم کہہ سکتے ہو۔ نمرسی بھی دراصل ''نومرسی'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے، یعنی رحم نہ کرنے والا شخص اور واقعی تمہارے ہم وطن سہراب کے کہنے پر اس نے ہم پر کوئی رحم نہیں کیا۔''

شامیر سناٹے کی سی کیفیت میں حولیہ کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''سہراب اور نمرسی کے ہرکارے زویا کو بھی معاف کرنا نہیں چاہتے تھے۔ میری اور ماما کی بے پناہ منت سماجت پر وہ اس شرط پر ٹلے تھے کہ اس رات جو کچھ بھی ہوا، وہ ہم صرف اپنے تک محدود رکھیں گی، قانون کا دروازہ نہیں کھٹکھٹائیں گی...... اور خاموشی کے ساتھ یہ علاقہ چھوڑ کر مشرقی جرمنی یا کسی دوسرے دور دراز علاقے میں چلی جائیں گی۔ اگر ہم ایسا کریں گی تو یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے یہیں پر ختم ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں بات بہت آگے تک جائے گی...... مسٹر شامیر...... ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دوسری صورت کے بارے میں سوچتیں...... ہم نے یہ شرط مان لی۔''

شامیر نے کہا۔ ''حولیہ! تم نے بتایا ہے کہ واردات کے وقت تمہاری ماما زخمی ہو گئی تھیں اور اسی گھر میں موجود تھیں۔ کیا وہ چھ سات گھنٹے تک وہیں زخمی پڑی رہی۔''

''نہیں، ان کو ابتدائی طبی امداد وہیں گھر کے اندر دی گئی...... اور یہ میں نے خود ہی دی۔ شاید تمہیں معلوم نہیں، میں کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہوں۔''

شامیر چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اسے تھوڑا تھوڑا یاد آیا کہ زویا نے ایک مرتبہ اس طرح کی کوئی بات کی تھی۔ حولیہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''بعد میں ہم نے اس سارے واقعے کو ڈکیتی کا رنگ دے دیا...... اور...... جو کچھ مجھ پر بیتا اسے بھی چھپا لیا۔ میں نے اپنی ابارشن کو بھی سیڑھیوں سے گرنے کا نتیجہ قرار دیا۔ ان ایک دو مہینوں میں ہم نے بہت زیادہ سختی جھیلی۔ اسی دوران میں ماما اور زویا خاموشی کے ساتھ یہاں ایسن کے اس علاقے میں چلے آئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھی۔ بچہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے شوہر کے ساتھ میرے تعلقات میں پہلے والی گرمجوشی نہیں رہی تھی۔ مگر ابارشن کے بعد اور یہ طے ہونے کے بعد کہ اب میں کبھی ماں نہیں بن سکتی، میرے اور شوہر کے درمیان دوری پیدا ہو گئی جو اب تک برقرار ہے۔ ابھی تک میرے شوہر کو بھی علم نہیں کہ اصل میں میرے ساتھ کیا ہوا ہے، ورنہ شاید وہ طلاق جو کچھ عرصے بعد ہونی ہے، ابھی ہو جائے۔'' وہ چپ ہو گئی، زرد چہرے پر دکھ کے تاریک سائے منڈلانے لگے۔

شامیر نے پہلو بدلا۔ ''ہم نے تو یہی سن رکھا ہے کہ جرمنی جیسے ممالک میں قانون کا بول بالا ہے۔ مظلوم کی دادرسی ہوتی ہے پھر آپ لوگوں کا خاموش رہنا ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آتا۔''

''تم درست کہتے ہو مسٹر شامیر! ہم قانون کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے تھے، پھر تمہارے جس ٹی وی چینل کی وجہ سے یہ بلا ہمارے گلے پڑی تھی اسے بھی ''انوالو'' کیا جا سکتا تھا...... اور ایک موقعے پر ہم نے بے حد سنجیدگی سے یہ باتیں سوچی بھی تھیں لیکن پھر حتمی فیصلہ پسپائی کے حق میں ہی ہوا۔''

کچھ دیر تک کمرے میں بوجھل خاموشی طاری رہی۔ حولیہ اور شامیر اپنی اپنی سوچوں میں کھوئے رہے۔ حولیہ کی والدہ مسلسل سو رہی تھیں۔ آتش دان میں آگ اب ادھ جلے کوئلوں کی شکل میں تھی۔ شامیر نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''زویا اور رابرٹ کا

کیا معاملہ ہے حولیہ؟‘‘

’’رابرٹ بہت اچھی نوبل جرمن فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہلڈ براند فیملی کے لوگ بہت تعلیم یافتہ اور شائستہ ہوتے ہیں۔ وہ یونیورسٹی میں لیکچرار ہے۔ وراثت میں اسے ایک فارم بھی ملا ہوا ہے جس سے آمدن ہوتی ہے۔ یہاں ماما اور زویا کے ’’ایسن‘‘ چلے آنے کے بعد ماما کی ٹانگوں کے علاج پر یورو پانی کی طرح خرچ ہوئے۔ چند ماہ میں ان کی ٹانگوں کے کوئی آٹھ آپریشن ہوئے۔ ماما کے ساتھ ساتھ ہم سب ہی سخت ترین مالی دشواریوں کا شکار ہو گئے۔ میرے شوہر کی نوکری چھوٹ چکی تھی۔ میرا اپنا گھر بھی میری کمائی سے بمشکل چل رہا تھا۔ ان حالات میں رابرٹ نے ماما اور زویا کے ساتھ بے حد تعاون کیا۔ یہاں تک کہ ان برے حالات میں بھی زویا کو اپنانے کی حامی بھر لی۔ ہمارا خیال تھا کہ ان دونوں کی ازدواجی زندگی بہت اچھی گزرے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ حالانکہ زویا میری بہن ہے مگر میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ زویا کے موجودہ گھریلو حالات میں زیادہ قصور اس کا ہی ہے۔ ماما کا خیال بھی یہی ہے۔ زویا نے کئی غلطیاں کی ہیں اور اب بھی کر رہی ہے۔ اب پچھلے تقریباً ایک سال سے...... وہ بغیر کسی کو کچھ بتائے کہیں جا چکی ہے۔ ڈیڑھ دو سال کی بچی بھی اس کے ساتھ ہے۔ رابرٹ کے علاوہ ہم بھی اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو چکے ہیں۔ اس ایک برس میں اس نے بس دو تین بار ہی کسی نامعلوم جگہ سے بات کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ خیریت سے ہے۔‘‘

حولیہ اصل بات پر اب بھی پردہ ڈال رہی تھی اور زویا کی گمشدگی کے حوالے سے ’’گٹارسٹ ٹام‘‘ کا نام نہیں لے رہی تھی۔

شامیر نے حولیہ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ’’حولیہ! پتا نہیں مجھے کیوں لگتا ہے کہ میں زویا کو ڈھونڈ سکتا ہوں۔ کسی وقت تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہوں۔ میں چند روز پہلے پیڈر بورن میں زویا کے شوہر رابرٹ سے بھی مل چکا ہوں۔ وہ مجھے اچھا بندہ لگا ہے اور اگر سچ پوچھو تو بچی کے حوالے سے مجھے اس پر ترس بھی آیا ہے۔‘‘

شامیر کا مطمحِ نظر سمجھتے ہوئے حولیہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔ ماتھے پر شکن ڈال کر بولی۔ ’’مسٹر شامیر! ہاتھ باندھ کر تم سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔ اب تم اس معاملے سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔ یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے، ہم اسے کسی نہ کسی طور سدھار ہی لیں گے۔ ماما تمہیں اپنے آس پاس دیکھنا کبھی پسند نہیں کریں گی۔ وہ بہت ’’ہائپر‘‘ ہو جائیں گی بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گی کہ......‘‘

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی، پھر چند سیکنڈ بعد خود کو کمپوز کرتے ہوئے بولی۔ ’’میرا مشورہ تو تمہارے لیے بھی یہی ہے کہ تم زیادہ دیر یہاں جرمنی میں نہ رکو۔ ہمیں جتنی سزا ملنا تھی وہ مل چکی ہے۔ اب یہ سہراب اور نمرسی والا معاملہ بالکل ختم ہے...... یہ نہ ہو کہ تمہاری یہاں موجودگی سے یہ پھر تازہ ہو جائے اور کوئی نئی مشکل کھڑی ہو جائے۔‘‘

’’تم پریشان نہ ہو حولیہ! میرا یہاں زیادہ دن رکنے کا ارادہ نہیں ہے۔ مجھے تو صرف رابرٹ اور اس کی حالت پر ترس آ رہا ہے اور زویا کے موجودہ کردار پر افسوس ہو رہا ہے جس کی وجہ سے تم سب پریشانی میں ہو۔‘‘

اب بارش تھم چکی تھی، حولیہ چاہتی تھی کہ اس کی ماما کے دوبارہ جاگنے سے پہلے پہلے شامیر یہاں سے نکل جائے۔ واش روم میں جانے کے لیے شامیر کو دوسرے کمرے میں جانا پڑا۔ اس نے کمرے اور واش روم کا جائزہ لیا۔ ہر چیز سے تنگدستی ٹپکتی ہوئی نظر آ رہی تھی...... اور عین ممکن تھا کہ کچھ عرصہ پہلے تک یہ تنگدستی اس سے بھی زیادہ ہو۔ ایسے حالات میں رابرٹ نے اس فیملی کو بہت سہارا دیا تھا...... اور شاید...... یہی وجہ تھی کہ بعدازاں زویا، رابرٹ سے شادی پر بھی رضامند ہو گئی تھی۔

ایسن سے واپسی کا سفر پھر ٹرین میں طے ہوا۔ دورانِ سفر شامیر، زویا کے خیالوں میں ہی الجھا رہا۔ وہ زویا کے اس گھر سے ہو کر آ رہا تھا جہاں وہ شادی سے پہلے ایک عرصے تک قیام پذیر رہی تھی۔ وہ زویا کی اس

بہن سے مل کر آ رہا تھا جو شکل میں کافی حد تک زویا سے مشابہ تھی اور ایک خوفناک واقعے کا شکار بھی ہوئی تھی۔ اس واقعے کو پاکستانی سہراب درانی سے نتھی کیا جا رہا تھا۔
زویا کے حوالے سے شامیر کی بہت سی یادیں پھر تازہ ہو گئی تھیں، اس نے خود ہی اپنے آپ پر غور کرنا شروع کیا۔ کہنے کو تو وہ یہ بات کہہ رہا تھا کہ اب اس کا دل زویا کی طرف سے اٹھ چکا ہے، اور اگر وہ زویا کے سلسلے میں کچھ جستجو کر رہا ہے تو اس کی وجہ رابرٹ کی حالتِ زار ہے، جو اپنی بچی کی یاد میں تڑپ رہا ہے...... لیکن شاید دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ابھی کچھ اور بھی چل رہا تھا۔ ایک سوال تھا جو کسی آہنی میخ کی طرح اس کے اندر کہیں گڑا ہوا تھا۔ کیا وہ واقعی بے وفا تھی؟ کیا وہ واقعی کسی اور سانچے میں ڈھل چکی تھی؟ کیا کسی انسان میں اتنی بے حسی بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے جیسے ہی کسی انسان کو جانکاہ انتظار کی تپتی ہوئی سنگلاخ زمین پر ننگے پاؤں کھڑا کر دے...... اور پھر اس سزا کو برخاست کرنا بھول جائے؟

پتا نہیں کیوں جولیہ سے ملنے کے بعد شامیر کے دل میں زویا کے لیے غم و غصے کی شدید کیفیت میں تھوڑی سی کمی واقع ہوئی تھی...... اسے یوں لگا تھا کہ زویا نے رابرٹ کے ساتھ شادی کا جو فیصلہ کیا، اس کے پیچھے اس کی معاشی مجبوریاں بھی رہی ہیں۔ اس کی والدہ سارہ جیم کے علاج پر پیسا پانی کی طرح لگ رہا تھا۔ قرض خواہ بینک دھمکیوں پر اتر آیا تھا۔ ایسے میں رابرٹ جس طرح اس زبوں حال فیملی کا ساتھ دے رہا تھا، یہ بہت بڑا احسان تھا۔ شاید اسی احسان کے زیر بار ہو کر زویا شادی کے لیے تیار ہوئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ بعد میں اپنی ازدواجی زندگی اسے ایک مجبوری کا ''تحفہ'' لگی ہو اور یوں اس کے اندر تلخیاں پیدا ہونا شروع ہو گئی ہوں۔ اسے بہرصورت یہ سارا اسرار معلوم کرنا تھا۔ وہ چاہتا بھی تو اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

☆☆☆

شامیر بن بتائے کہیں چلا گیا تھا۔ امو خالہ بے قرار تھیں لیکن فارہ کی بے قراری اس سے بھی کچھ بڑھ کر تھی۔ وہ بولی۔ ''امو! کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ آپ نے اپنی ضد کی وجہ سے میری زندگی خراب کر چھوڑی ہے۔ آپ کا وہ لاڈلا ایک سرکش گھوڑے کی طرح ہے اور آپ اس کو لگام ڈالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہ اب بھی اسی باسی کڑی کو ابالے دینے میں لگا ہوا ہے۔ کیا پتا اس نے کہیں ڈھونڈ ہی لیا ہو اسے۔''

فارہ کا یہ لب و لہجہ اس لب و لہجے سے بہت مختلف تھا جو وہ شامیر کے سامنے اختیار کیے رکھتی تھی۔ وہ نزاکت، وہ شیرینی، وہ دبی دبی سی شرماہٹ، کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ چوکڑی مارے بیٹھی تھی اور بڑی بے باکی سے اپنی ماں کو لتاڑ رہی تھی۔

کزن افشاں دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ امو خالہ نے کھڑکی بند کرتے ہوئے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''تمہاری یہی گز بھر کی زبان ہے جسے چلا کر تم نے شامیر کو خود سے بدظن کرنا ہے۔ کچھ ہوش کر، عقل کو ہاتھ مار...... میں تو سمجھتی ہوں یہاں آنا ہمارے لیے اچھا ہی ثابت ہوا ہے۔ اس مال زادی کی شادی ہو چکی ہے...... اور پھر اس کا جس طرح کا کردار شامیر کے سامنے آیا ہے، وہ دل ہی دل میں اس پر لعنتیں ارسال کر رہا ہوگا۔ اب اگر وہ اس کی کچھ جستجو کر رہا ہے تو اس کی وجہ بس وہ ہمدردی ہے جو اسے اس کے بدنصیب شوہر اور اس کی گمشدہ بچی سے پیدا ہو گئی ہے۔''

''آپ جو بھی کہتی رہیں ماما! مجھے آثار کچھ اچھے نہیں لگ رہے۔ کیا پتا اس کے ساتھ مل کر اس کا رویہ کیا ہو جائے...... آپ نے دیکھ ہی لیا ہے...... وہ چڑیل اسی ایریا میں موجود ہے۔ اس بات کا ٹھیک ٹھاک چانس موجود ہے کہ وہ اس کے بارے میں جان جائے گا۔ میں تو کہتی ہوں ہمیں جلد از جلد پیڈربورن سے نکل جانا چاہیے اور ہو سکے تو پاکستان واپسی کا پروگرام فائنل کرنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، وہ آتا ہے تو میں اس سے بات کرتی ہوں لیکن میں پھر کہتی ہوں، تُو جب بھی مات کھائے گی اپنی زبان کی وجہ سے کھائے گی۔ اپنے غصے پر قابو پانا سیکھ۔ میں سمجھتی ہوں تیرے حوالے سے شامیر کا رویہ بڑی حد تک بدل چکا ہے۔ ہم تھوڑی سی کوشش اور کریں گے تو وہ سو فیصد ٹھیک ہو جائے گا......

فارہ! وہ دل کا بہت اچھا ہے۔ دیکھنا اتنا پیار دے گا تجھے کہ تو دنگ رہ جائے گی......"

امو ایک بار پھر اسے سمجھانے بجھانے میں لگ گئیں۔ پھر شامیر کو ساتویں آٹھویں بار فون کرنے کے لیے وہ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ فارہ دھڑام سے آڑھی ترچھی، بستر پر گرگئی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک خشونت کے آثار تھے۔ سینے کا زیر و بم اندر کے تلاطم کی چغلی کھا رہا تھا۔ اسے بھی اب ایک طرح کی ضد سی ہوگئی تھی...... وہ شامیر کو زیر کرنا چاہتی تھی۔ شامیر کے سامنے وہ اپنا ایک بالکل جدا روپ لے کر آئی تھی اور ابھی تک یہ روپ کامیاب ہی تھا۔ بس اسے یہ خدشہ رہتا تھا کہ کہیں کسی وقت وہ غصے میں شامیر سے کچھ کہہ نہ بیٹھے۔ بے شک وہ نوعمر تھی لیکن ایک عورت تو تھی اور جانتی تھی کہ شامیر کے جسم اور دل میں اس کے لیے ایک کھڑکی کھل رہی ہے۔ اسے چند دن پہلے کا وہ منظر بھی اچھی طرح یاد تھا جب اس نے اپنی کمر کے تل دکھانے کے لیے اچانک خود کو شامیر کے سامنے کردیا تھا اور اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے تھے۔

اس نے ایک دو گہری سانسیں لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی ناکام کوشش کی پھر اٹھ کر آئینے کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اس نے وارڈ روب کھولی اور اس میں سے ایک بولڈ قسم کا لباس نکال کر اور اپنے ساتھ لگا کر آئینے میں دیکھنے لگی۔ وہ اب زیادہ دیر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ شامیر اس کے جلتے شباب کے سامنے جلد ہتھیار پھینک کر اپنی شکست کا اعتراف کرلے۔ وہ اس پر اپنی مہر ثبت کرنا چاہتی تھی...... شامیر رات کو دیر سے گھر آیا اور امو کے اصرار پر چند لقمے لینے کے فوراً بعد سوگیا۔ وہ کافی تھکا ہوا تھا۔ امو نے بھی اسے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور یہ کام کل صبح پر چھوڑ دیا۔ اب رات کے بارہ بجے تھے۔ ہوٹل کے تمام کمروں میں تقریباً خاموشی چھا چکی تھی۔ امو اور افشاں بھی سوچکی تھیں۔ فارہ جاگ رہی تھی۔ نہ صرف جاگ رہی تھی بلکہ خاموشی سے شامیر والے کمرے میں بھی چلی آئی تھی۔ اتفاقاً اسے دروازہ کھلا ہوا ہی مل گیا تھا۔ اب نائٹ بلب کی روشنی میں وہ شامیر کے سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ سویا پڑا تھا۔ وہ اپنی ہیئر پن کبھی اس کی ناک میں گھماتی، کبھی اس سے کان کو چھیڑتی۔ آخر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ غنودگی کی حالت میں وہ فارہ کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہوگیا۔ وہ بغیر آستینوں والی نائٹی میں تھی۔ گلابی نائٹی کے کشادہ گریبان پر سلور رنگ کی کناری جگمگا رہی تھی۔

"کیوں تنگ کررہی ہو؟" شامیر نے کسمسا کر پوچھا۔

"تنگ نہیں کررہی۔ ہمدردی کررہی ہوں آپ سے۔ آپ نے کمر کی چوٹ پر بس ایک دفعہ بینڈیج کروائی اور بھول گئے۔ جناب! بینڈیج کو کم از کم 48 گھنٹے بعد تو بدلنا چاہیے ورنہ جناب کی چوٹ "سیپٹک" ہوجائے گی۔"

"لیکن ابھی نہیں یار! میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ صبح دیکھ لیں گے۔"

"یعنی دس بارہ گھنٹے مزید..... ٹھیک ہے...... میں امو کو جا کر بتا دیتی ہوں سب کچھ۔ آئی ہوپ کہ جب انہیں پتا چلے گا کہ آپ نہ صرف آوارہ گردی فرما رہے ہیں بلکہ دھینگا مشتیاں بھی کررہے ہیں تو انہیں بے حد خوشی ہوگی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ شامیر کی نیند کافور ہوگئی۔ اس نے جلدی سے فارہ کی کلائی تھام کر اسے روکا۔ پہلے اسے ٹالنے کی کوشش کی، جب وہ نہیں مانی تو وہ ہارے ہوئے انداز میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پہلے اپنی شرٹ اتاری۔ پھر بنیان بھی اتار دی اور فارہ کی طرف پشت کرکے بیٹھ گیا۔

"بہت ضدی ہو تم۔" اس نے کہا۔

"آپ سے کچھ کم۔" وہ بولی پھر ذرا توقف سے کہا۔ "سچ بتائیں، کہاں گئے تھے آپ؟"

شامیر نے وہی مختصر بیان دہرا دیا جو اس سے پہلے فارہ، افشاں اور امو خالہ کے سامنے دیا تھا یعنی دفتری کام۔ اس کا ارادہ تھا کہ کل صبح امو خالہ کو مناسب الفاظ میں اصل حقیقت بھی بتا دے گا۔ وہ ان سے کچھ بھی چھپاتا تو لگتا تھا کوئی گناہ کررہا ہو۔ والدین کو پیش آنے والے حادثے کے بعد وہی اس کا سب کچھ رہی تھیں۔ اسے تو آج تک اس بات کا بھی افسوس تھا کہ امو

کی خواہش کے مطابق فارہ کی بڑی بہن شمائلہ سے اس کی شادی کیوں نہ ہو پائی۔ بے شک شامیر نے خود بھی کبھی شمائلہ کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا اور وہ اس سے بڑی بھی تھی لیکن اپنے ابو کے دوٹوک انکار پر امو خالہ کو پہنچنے والے صدمے کا سوچ کر وہ آج بھی ملول ہو جاتا تھا۔
فارہ نے بڑی احتیاط سے اس کی کمر کی پرانی بینڈ ایج اتاری اور زخم صاف کر کے نئی بینڈ ایج چپکا دی۔ فارہ کا لمس اپنے اندر ایک عجیب سی ملائمت اور سنسناہٹ لیے ہوئے تھا۔ وہ اس کے نوخیز جسم کی خوشبو اور حرارت اپنے بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔ یکا یک فارہ نے چونک کر کہا۔ ''ارے، یہ کیا ہے؟''
فارہ کی نگاہ سامنے کی طرف شامیر کے سینے پر پڑی تھی۔ اس کی چھاتی پر ہنسلی کی ہڈی سے نیچے ایک گہرا نیلگوں ابھار نظر آ رہا تھا۔ اس کی چھاتی کے گھنے بالوں کی وجہ سے شاید فارہ کی نظر پہلے اس ابھار پر نہیں پڑ سکی تھی۔ ایسا ہی ایک چھوٹا اور کم شدت کا ابھار اس کے بائیں بازو کی طرف بھی تھا۔
''اب یہ چوٹیں کہاں سے لگوائیں آپ نے؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔
اب شامیر اسے کیا بتاتا کہ کل رات ''ایسن'' میں اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ سیارہ جیم نشے میں چور بالکل جنونی انداز میں اس پر جھپٹی تھی۔ اپنی ٹانگوں اور بالائی جسم پر شامیر کو بیس بال کے بیٹ کی کئی ضربیں سہنا پڑی تھیں۔ یہ دو نشان بھی اسی ''حملے'' کی نشانی تھے۔ اپنی گوناگوں پریشانیوں میں شامیر ان چوٹوں کو تقریباً بھول ہی چکا تھا۔ اب یہ فارہ کے سامنے آ گئی تھیں۔
وہ بہت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے سوال پر سوال پوچھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ شامیر کل پھر زویا کے شوہر رابرٹ کی طرف گیا ہے اور وہاں پھر اسکائی ماسک والے غنڈے کے ساتھ اس کی لڑائی ہوئی ہے۔
شامیر نے اسے بمشکل اس بات سے نیم قائل کیا کہ ''ایسن'' میں انٹرسٹی ٹرین سے اترتے ہوئے اس کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ گر گیا تھا۔
اسے یقین آیا یا نہیں لیکن یہ ضرور ہوا کہ وہ شامیر پر مزید چڑھ بیٹھی۔ وہ بولی۔ ''آپ کی یہ چوٹ ہنسلی کی ہڈی کے بالکل پاس ہے۔ ہنسلی کی ہڈی بڑی نازک ہوتی ہے۔ آپ کو ایکسرے کرانا چاہیے تھا...... دیکھیں کتنا زیادہ ابھار ہے...... میں آپ کو ٹکور کرتی ہوں۔ آپ لیٹ جائیں۔''
''کچھ نہیں یار! میری ہڈی ٹھیک ہے ورنہ میں بلبلا رہا ہوتا۔ بس ذرا سی چوٹ آئی ہے۔''
''یہ ذرا سی چوٹ نہیں ہے۔ آپ لیٹیں...... فوراً لیٹیں...... اگر نہیں تو پھر میں بلاتی ہوں آپ کی امو خالہ کو۔''
چاروناچار شامیر کو سیدھا لیٹنا پڑا۔ اس نے الیکٹرک استری گرم کی اور ایک کپڑے کی گدی بنا کر شامیر کی چھاتی پر ٹکور کرنے لگی۔ وہ گھٹنوں کے بل بستر پر اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اس کی حرکات وسکنات سے اس کا نیم عریاں لباس مزید ہیجان خیز دکھائی دینے لگا تھا۔
شامیر نے اس کی طرف سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اس طرح کی نائٹی کیوں پہن رکھی ہے؟''
وہ بے باکی سے بولی۔ ''آپ جمع خاطر رکھیں۔ یہ میں نے کوئی آپ کو دکھانے کے لیے نہیں پہن رکھی۔ تقریباً روز ہی پہنتی ہوں۔ آپ کو پریشانی ہو رہی ہے تو اپنی آنکھیں بند فرما لیں۔'' پھر اس نے خود ہی اپنا ایک ہاتھ شامیر کی آنکھوں پر رکھ دیا...... اور دوسرے ہاتھ سے ٹکور کا عمل جاری رکھا۔
''یہ اچھی زبردستی ہے بھئی! میرا خیال ہے اب مجھے معاف کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔'' اس نے فارہ کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹانے کی کوشش کی۔
''چپ چاپ لیٹے رہیں ورنہ یہیں سے امو کو آواز دوں گی۔'' وہ شوخی سے بولی۔
شامیر سٹپٹا کر رہ گیا۔ چند سیکنڈ بعد اچانک اسے اپنے ہونٹوں پر کسی نیم گرم نرم لمس کا احساس ہوا۔ اس کے جسم میں برق سی دوڑ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ لمس فارہ کے ہونٹوں کا تھا...... وہ بڑی تیزی سے دروازے کی طرف لپکی تھی اور اسے کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ وہ دم بخود سا اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ اس کے اردگرد ابھی تک فارہ کے نوخیز جسم کی خوشبو موجود تھی...... اور اس کے ہونٹ جیسے سنسنا رہے تھے۔

جو کچھ ہو رہا تھا اور بتدریج آگے بڑھ رہا تھا، وہ تو شامیر کافی عرصے سے محسوس کر رہا تھا لیکن آج فارہ کی طرف سے ایک بہت واشگاف اور راست قدم اٹھایا گیا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ بتدریج تبدیل ہوئی ہے۔ اس کے طور اطوار سے لے کر اس کی چال ڈھال اور بول چال تک میں شامیر ایک طرح کی شائستگی اور لگاوٹ محسوس کرتا تھا۔ کسی وقت اس کے دل کے کسی حصے میں فارہ کے لیے ایک نرم گوشہ بھی پیدا ہونے لگتا تھا۔ اس گوشے میں اسے فارہ کے ساتھ ساتھ مہربان چہرے والی اپنی اموخالہ کی شبیہہ بھی نظر آتی تھی۔ دل کے اسی حصے میں ایک اور گوشہ بھی تھا۔ اس گوشے کی نیم تاریکی میں ایک لڑکی کی دھندلی سی تصویر نظر آتی تھی۔ وہ لڑکی فرینکفرٹ کے کامرس بینک ٹاور کی چھت پر کھڑی تھی۔ اس نے اپنا ہیئر کلپ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے سرکش بال سمیٹ رہی تھی۔ اس تصویر کے رنگ بہت پھیکے پڑ چکے تھے مگر یہ پھر بھی ایک امر تصویر تھی۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر فارہ یوں تو شامیر کے سامنے نظریں جھکائے بیٹھی رہی تاہم اس کے چہرے پر ایک شوخ تاثر موجود رہا۔ چکن آلو اور پنیر والے لذیذ سینڈوچ تقریباً نائنٹی پرسینٹ اموخالہ نے خود ہی تیار کیے تھے مگر ان کو منسوب فارہ سے ہی کر دیا تھا۔ سینڈوچ کی پلیٹ شامیر کے سامنے کھسکاتے ہوئے بولیں۔ ”صبح سے لگی ہوئی تھی بنانے میں۔ تمہاری پسند بڑی جلدی سے اس کی پسند بن جاتی ہے یا شاید ویسے ہی تم دونوں کی پسند ایک ہے۔“

”آپ کی دوسری بات ٹھیک لگتی ہے۔“ قریب بیٹھی افشاں نے معنی خیز انداز میں لقمہ دیا۔

”کیا بات ہے۔ آج تم کچھ چپ چپ لگ رہی ہو؟“ اموخالہ نے فارہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیوں، چپ رہنے پر کوئی پابندی ہے۔“ فارہ نے چائے کے کپ پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں کمرے کے اندر فارہ کے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور فون اٹینڈ کرنے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ افشاں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اموخالہ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”شامیر! میرا خیال ہے کہ اب زویا اور اس کے شوہر کو ان کے حال پر چھوڑ ہی دو تو بہتر ہے۔ بچی سے بچھڑے ہوئے شریف النفس باپ کی حالت پر دکھ تو ہوتا ہے لیکن...... وقت کے ساتھ ہو سکتا ہے کہ اس بے چارے کے مسئلے کا کوئی حل نکل آئے۔“

جواب میں شامیر نے کچھ نہیں کہا تو اموخالہ کے لہجے میں مزید مضبوطی آگئی۔ بولیں۔ ”یہاں موسم کافی ٹھنڈا ہے۔ پرسوں سے میری طبیعت پھر کچھ بوجھل سی ہو رہی ہے۔“

اموخالہ کی بوجھل طبیعت کا سن کر شامیر ایک دم پریشان سا ہو گیا۔ وہ ان کا حال احوال پوچھنے میں لگ گیا۔ چار پانچ منٹ بعد اس کے فون پر کال کے سگنل آئے۔ وہ اسکرین کی طرف دیکھ کر چونکا۔ یہ زویا کی سابقہ سہیلی جین کی کال تھی۔ شامیر نے لان میں آکر اس کی کال سنی۔ وہ کسی لمبی تمہید کے بغیر بولی۔ ”شامیر! تم کہاں ہو؟“

”پیڈر بورن میں اور تم؟“

”میں بھی پیڈر بورن سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ میں آدھ گھنٹے میں یہاں پہنچ رہی ہوں۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ کہاں مل سکتے ہو؟“

”خیریت تو ہے جین؟“ شامیر نے چونک کر پوچھا۔

”ہے تو خیریت ہی، تم مجھے جگہ بتاؤ۔“ جین نے کہا۔

مین اسٹیشن سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک اطالوی ریسٹورنٹ کا تعین ہوا۔

اموخالہ نے پھر باز پرس شروع کر دی۔ شامیر نے انہیں ابھی تک پرسوں والے واقعے کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ ان سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا تھا، تاہم تفصیل سے بات کرنے کے لیے مناسب موقعے کا انتظار کر رہا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد گھنگرالے بالوں والی دراز قد جین اور شامیر اس اطالوی ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے سوفٹ ڈرنکس رکھے تھے۔ شامیر

نے جین کو اپنی ''ایسن'' یاترا کے بارے میں کافی کچھ بتا دیا تھا...... اور وہ زویا کی والدہ سارہ جیم کے حالات جان کر کافی حیران ہوئی تھی۔ بہر حال شامیر نے حولیہ سے کیے گئے وعدے کے مطابق اس سارے واقعے کو ڈکیتی تک ہی محدود رکھا تھا اور حولیہ پر ٹوٹنے والے ستم کا تذکرہ بھی حذف کر دیا تھا۔

جین آج کچھ عجیب سے موڈ میں نظر آتی تھی۔ اورنج جوس کا سپ لے کر کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''میں اس ساری کہانی کو فراموش کر دینا چاہتی تھی اور تقریباً کر ہی چکی تھی مگر تم نے مجھے فیس بک پر ڈھونڈ کر پھر سے ساری یادوں اور زخموں کو تازہ کر دیا ہے......''

''یہاں پہنچ کر کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ میں اسی لیے چار سال تک یہاں آنے سے پہلو تہی کرتا رہا۔''

جین نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ ''برادر شامیر! پچھلی ملاقات میں، میں نے تم سے ایک سوال پوچھا تھا۔ وہ اہم سوال تھا مگر تم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، میں نے کہا تھا کہ تمہارے پاس میرا رابطہ نمبر موجود تھا پھر بھی تم نے کبھی رابطہ نہیں کیا۔''

''میں سچ کہتا ہوں جین، میرے پاس تمہارا کوئی کونٹیکٹ نہیں تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میں نے اپنا جو کونٹیکٹ تمہیں دیا، وہ تم تک پہنچا ہی نہیں۔''

''تم نے کب دیا؟''

''میں نے پاکستان آ کر دیا۔''

شامیر حیرت زدہ سا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

جین نے آخری کش لے کر سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا اور بولی۔ ''شامیر! میں اعتراف کرتی ہوں کہ تم سے دو روز پہلے ہونے والی ملاقات میں، میں نے تم سے ایک اہم بات چھپائی...... شاید...... شاید لاشعوری طور پر میں نہیں چاہتی تھی کہ تم دوبارہ سے اس لاحاصل بکھیڑے میں پڑو۔''

''میں...... کچھ سمجھ نہیں پا رہا جین؟''

''شامیر! مجھے نہیں پتا کہ تم سے یہ بات کیوں چھپائی گئی لیکن حقیقت یہی ہے کہ زویا سے روٹھ کر جب تم پاکستان چلے گئے...... تو تقریباً پانچ ماہ بعد میں تمہارے پیچھے پاکستان آئی تھی۔ میں تمہارے گھر تک بھی پہنچی تھی۔ تم اس وقت چینل کے کسی کام سے پاکستان سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میری ملاقات تمہاری آنٹی سے بھی ہوئی تھی جن کو تم اموخالہ کہتے ہو۔''

شامیر سناٹے میں رہ گیا۔ تین چار سال گزر چکے تھے مگر اس کے علم میں ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی۔

وہ لرزتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''جین پلیز! مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ وضاحت سے بتاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

جین پہلو بدل کر بولی۔ ''شامیر! تم سے دو دن پہلے والی ملاقات کے بعد سے میرے دل پر ایک دم بوجھ سا پڑ گیا ہے۔ تمہاری اور زویا کی جدائی کا غم پھر سے تازہ ہو گیا ہے۔ مجھے یوں لگا ہے جیسے تم دونوں کے بچھڑنے میں کچھ اور لوگوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے...... اور شاید ان میں تمہارے گھر کا کوئی فرد بھی شامل ہے۔''

''یہ...... بات...... تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' شامیر بمشکل بول پایا۔

جین نے نیا سگریٹ سلگا کر یوں اس کا کش لیا جس طرح سرد آہ بھری جاتی ہے...... پھر جیسے ماضی کی کھڑکی میں جھانکتے ہوئے وہ بولی۔ ''شامیر! میں نے پچھلی ملاقات میں بھی تم سے یہی کہا تھا نا کہ تم زویا کی پہلی محبت تھے۔ اس نے تم سے بہت پیار کیا ہے شامیر...... شاید تمہاری توقع سے بھی زیادہ۔ اب میں تمہیں کیا کچھ بتاؤں۔ جب تم دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو گئے اور تم پاکستان واپس چلے گئے تو وہ جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اسے جیسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ تم اس طرح اسے چھوڑ کر جا سکتے ہو۔ وہ بیمار پڑ گئی۔ پھر اس نے ڈبل اے چینل کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ بعد میں ان کے میونخ والے گھر میں ڈکیتی والا واقعہ ہوا۔ اس کے بعد وہ مزید ٹوٹ پھوٹ گئی۔ وہ تمہیں یوں کھونا نہیں چاہتی تھی مگر میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ارادے کی بہت پکی ہے۔ اس نے کوئی بہت بڑی قسم کھالی تھی کہ از خود

تم سے کوئی رابطہ نہیں کرے گی، چاہے ساری زندگی ایسے ہی گزر جائے۔ میں نے کئی بار اس سے تمہارا فون نمبر اور ای میل ایڈریس مانگا مگر اس نے نہیں دیا۔ عین ممکن تھا کہ اس نے فرسٹریشن کے عالم میں یہ کونٹیکٹس ویسے ہی ڈیلیٹ کر چھوڑے ہوں۔ انہی دنوں اتفاقاً میرا انڈیا اور پاکستان جانے کا پروگرام بنا۔ تمہیں پتا ہی ہوگا شامیر! میرے شوہر باسکٹ بال کے جانے پہچانے کھلاڑی ہیں۔ میں ان ہی کے ساتھ تین چار ایشیائی ملکوں کے ٹور پر گئی تھی۔ جب میں پاکستان کے شہر لاہور پہنچی تو میں خود کو تم سے رابطہ کرنے سے روک نہ سکی۔ میں نے اس چینل سے رابطہ کیا جس میں تم کام کرتے تھے مگر وہاں سے کسی نے بھی مجھے مثبت جواب نہیں دیا۔ تمہاری کہی ہوئی ایک بات میرے ذہن میں کہیں اٹکی رہ گئی تھی کہ تمہاری رہائش لاہور کے سب سے پہلے میکڈونلڈ ریسٹورنٹ کی عقبی سڑک پر واقع ہے۔ اسی موہوم اشارے کے سہارے میں تمہارے گھر تک جا پہنچی تھی۔''

''تمہیں کون ملا وہاں؟'' شامیر نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

''تمہاری آنٹی، جنہیں تم والدہ کہتے ہو۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تم آفس کے کام سے پاکستان سے باہر گئے ہوئے ہو...... تین چار ہفتوں سے پہلے نہیں آؤ گے۔ شاید انہوں نے ملائیشیا کا نام لیا تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے تمہارا رابطہ نمبر دے دیں مگر انہوں نے اس معاملے میں بڑی احتیاط دکھائی اور کہا کہ تمہاری اجازت کے بغیر وہ کسی کو تمہارا نمبر نہیں دے سکتیں۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنا نمبر انہیں دے دوں۔ وہ تم تک پہنچا دیں گی۔ ان کا بے لچک رویہ دیکھ کر میں نے انہیں اپنا فون نمبر اور ای میل ایڈریس وغیرہ دے دیا اور تاکید کی کہ وہ رابطے کے لیے میری درخواست تم تک پہنچا دیں۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ میرا تعلق کسی نہ کسی طور زویا سے ہے اور میں تم سے اسی سلسلے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ شاید...... شاید اسی لیے انہوں نے باقی باتوں میں مجھے یہ اشارہ بھی دے دیا تھا کہ یہاں پاکستان میں تمہاری شادی کی بات فائنل اسٹیج پر ہے اور ڈیڑھ دو ماہ میں شادی متوقع ہے۔ میں نے پھر بھی ان سے درخواست کی تھی کہ شامیر ایک بار مجھ سے رابطہ ضرور کرے۔ میں لاہور میں مزید ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ اگلے ہی روز میں اور میرا شوہر دہلی کے لیے پرواز کر گئے تھے۔''

☆☆☆

شامیر حیرت کے شدید ترین ریلے میں تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ جب سے وہ جین سے مل کر آیا تھا، ہوٹل کے اپنے کمرے میں بند تھا۔ جین کے الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونجتے تھے۔ اس نے انکشاف کیا تھا کہ تقریباً ساڑھے تین برس پہلے وہ نہ صرف پاکستان گئی تھی بلکہ اس کے گھر تک بھی پہنچی تھی۔ شامیر کو یاد تھا کہ ان دنوں وہ ایک ساتھی رپورٹر کے ساتھ ملائیشیا میں تھا۔ وہاں وہ لوگ پندرہ بیس دن سے زیادہ نہیں رکے تھے۔ انہی دنوں میں وہ پاکستان پہنچی تھی۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ امو خالہ نے اس سے یہ سب کچھ چھپایا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تھا تو کیوں؟ انہوں نے بعد میں بھی کبھی اس واقعے کا تذکرہ تک نہیں کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا تو شاید فارہ کو بھی معلوم تھا۔ اس نے بھی اس سلسلے میں زبان بند ہی رکھی تھی۔

وہ کمرے میں ٹہلتا رہا پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے یاد تھا، قریباً ساڑھے تین سال پہلے وہی وہ دن تھے جب وہ کسی بھی معجزے کا نہایت شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ اس کی بس ایک ہی خواہش تھی۔ کسی بھی طرح یہ جمود ختم ہو...... کسی بھی طور یہ کفر ٹوٹے جس نے اسے اور زویا کو ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہے...... اور جین کی بات پر یقین کیا جاتا تو پھر...... یہ کفر ٹوٹا تھا، یہ جمود ختم ہوا تھا۔ بقول جین، وہ زویا کی حالتِ زار بیان کرنے کے لیے شامیر کے پاس لاہور تک پہنچی تھی۔ وہ ان دونوں کی دوری ختم کرنے کے لیے کسی درمیانی راستے کی تلاش میں آئی تھی اور اگر وہ آئی تھی تو یہ راستہ نکل سکتا تھا۔ اسے نکل آنا تھا...... مگر امو خالہ......

اس کا دل چاہا کہ وہ امو خالہ کے پاس جائے، ان سے پوچھے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ اس کا نمبر یا ای میل جین کو کیوں نہ دیا؟ اور اگر جین نے اپنا نمبر

دیا تھا تو وہ انہوں نے اسے کیوں نہ بتایا...... کیوں اسے اب تک راز رکھا؟ اس کے قدم بے ساختہ امو خالہ اور فارہ والے کمرے کی طرف اٹھ گئے...... تاہم دروازے تک پہنچنے سے پہلے اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے آج تک امو خالہ کے سامنے نگاہ اٹھا کر بات نہیں کی تھی۔ ایک عجیب سا احترام تھا اور ایک بے نام سی انسیت تھی جس نے شامیر کو بھی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ امو خالہ کی کسی بات سے اختلاف کرے۔ وہ سینے میں ایک بے پناہ گھٹن لے کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد اس کے فون پر میسج کی بیپ ٹون آئی۔ اس نے دیکھا، یہ ساتھ والے کمرے میں موجود فارہ کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''اگر آپ کو برا لگا ہے تو سوری......'' اس کا اشارہ یقیناً رات والے واقعے کی طرف تھا، جب اس نے شامیر کی آنکھیں بند کی تھیں۔

چند سیکنڈ بعد پھر میسج آیا۔ ''اور اگر اچھا لگا ہے تو بھی سوری...... میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کو اچھا لگا ہے اور آپ اس کو ''ری پیٹ'' کرنا چاہتے ہیں تو بھی سوری۔ بس ایک دفعہ جو ہو گیا سو ہو گیا اور پتا نہیں کیسے ہو گیا......''

شامیر کو فارہ کی بے باکی کبھی بھی اچھی نہیں لگی تھی اور آج تو بالکل بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے جواب میں کوئی میسج نہیں کیا۔

دس پندرہ منٹ بعد دوبارہ اس کا میسج آیا۔ ''کیا ہوا جی...... کہاں کھو گئے ہیں؟ ویسے بھی ہم لڑکیوں کے مسائل عجیب ہوتے ہیں۔ کہنا کچھ چاہتی ہیں، کہہ کچھ دیتی ہیں...... چلیں چھوڑیں...... ایک چھوٹا سا ''جوک'' سنیں۔ لڑکے نے پہلی بار لڑکی سے پوچھا...... کیا میں تمہیں kiss کر سکتا ہوں؟'' لڑکی اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ تھوڑا سا اور قریب آئی اور مسکرا کر بولی۔ ''اگر تم مجھ سے پوچھو گے تو میں کہوں گی نہیں۔''

شامیر کا موڈ کچھ اور ہو رہا تھا۔ اس نے بیزاری سے موبائل ایک طرف پھینک دیا مگر پھر فوراً ہی اسے موبائل دوبارہ اٹھانا پڑ گیا۔ کال آ رہی تھی اور یہ کال زویا کے شوہر رابرٹ کی طرف سے تھی۔ ''ہیلو رابی! کیا حال ہے؟'' شامیر نے اپنی اندرونی ہلچل کو چھپاتے ہوئے نارمل لہجے میں کہا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں شامیر! پرسوں سے تمہارا فون نہیں آیا۔ سوچا خود کال کر لوں۔''

''بہت شکریہ۔ بس دو دن ذرا مصروف رہا...... اور بتاؤ تمہاری طرف سب خیریت ہے؟''

''ویسے تو خیریت ہی ہے، لیکن آج ایک انکشاف ہوا ہے۔ سوچا تمہیں بھی آگاہ کر دوں۔'' رابرٹ کے لہجے میں تشویش آمیز پژمردگی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''زویا کا آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ گھر میں نہیں ہے۔ عینی کے دو شناختی کاغذ بھی غائب ہیں۔ پکی بات ہے کہ یہ کام اسی لڑکے کا ہے جو اس روز گھر میں گھسا تھا۔''

شامیر نے پریشانی کے انداز میں ہونٹ سکوڑے۔ رابرٹ کہہ رہا تھا۔ ''وہ گھر میں گھسنے کے بعد جتنی تیزی سے ان کاغذات تک پہنچا، اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسے ان کے ٹھکانے کے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتایا گیا تھا۔ میری اور اس کی مڈبھیڑ تب ہوئی جب وہ کاغذ نکال چکا تھا۔''

شامیر نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو کیا...... اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ملک سے باہر نکلنا چاہتی ہے؟''

''ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔'' رابرٹ کی آواز ٹوٹی ہوئی سی تھی۔

''کاش اس گھس بیٹھیے لڑکے کا ہی کوئی کھوج مل سکتا۔'' شامیر نے کہا۔

''میں پولیس کو انوالو کرنا نہیں چاہتا لیکن اپنے طور پر کافی کوشش کی ہے۔ ایک پرائیویٹ سراغ رساں کو بھی بلایا تھا کہ شاید کچھ فنگر پرنٹس وغیرہ مل سکیں لیکن اس میں بھی کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔''

''بہرحال تمہیں اس حوالے سے کوشش جاری رکھنی چاہیے رابی۔''

رابرٹ پژمردہ آواز میں بولا۔ ''ہمت ٹوٹ گئی ہے دوست! کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا...... عینی کی

جدائی نے مجھے تقریباً مار ڈالا ہے۔''
شامیر نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور اس کا دکھ کچھ ہلکا کیا۔
رابرٹ سے گفتگو کے بعد شامیر کے اندر کی اتھل پتھل میں مزید اضافہ ہوگیا۔ زویا کے کردار کے سلسلے میں وہ کوئی بھی رائے قائم نہیں کر پا رہا تھا۔ زویا کے حوالے سے چند دن پہلے جو کچھ اس کی بہن حولیہ نے کہا تھا، وہ بھی شامیر کے دماغ میں مسلسل گونج رہا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ زویا اگر شامیر کی محبت کو بھول کر رابرٹ کی بیوی بننے پر آمادہ ہوئی تو اس کے پیچھے اس کی معاشی مجبوریاں بھی ہوں۔ اس کی ماں زخمی ہونے کے بعد شدید بیمار تھی۔ اس کے علاج پر بھی بھاری اخراجات اٹھ رہے تھے، ایسے میں اس نے سوچا ہو کہ وہ رابرٹ کی زندگی میں آ کر اپنے گھر والوں کے لیے آسانیاں پیدا کرے...... لیکن پھر اس کے بعد وہ جس طرح ایک نئے روپ میں ڈھلتی گئی، وہ یقیناً ایک نہ سمجھ میں آنے والی صورتِ حال تھی۔ اب ایک دن پہلے جین کے ذریعے نیا انکشاف یہ ہوا تھا کہ شامیر کے پاکستان جانے کے بعد وہ بے طرح پریشان اور غمزدہ رہی تھی۔ اس کی غیر معمولی تڑپ دیکھ کر ہی جین دکھی ہوئی تھی اور اس کا دل چاہا تھا کہ وہ کسی طرح شامیر سے ملے۔ اگر زویا، شامیر کے لیے اتنی چاہت رکھتی تھی اور اس کے جذبے میں اتنی گہرائی تھی تو پھر کیوں ان دونوں کے لیے کوئی راستہ نہ نکل سکا؟ شامیر کے ذہن میں سوالوں کی کلبلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کسی بھی طرح ایک بار، کم از کم ایک بار زویا کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا سامنا کرنا چاہتا تھا اور اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہ ٹوٹل دو ماہ کا ویزا تھا اور آدھے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔

☆☆☆

فارہ اور اموثمینہ چوتھے فلور پر ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھی تھیں۔ افشاں اندر شاور لے رہی تھی۔ شامیر صبح سے کہیں نکلا ہوا تھا، اس کا موڈ کل سے کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ فارہ نے قریبی گملے میں موجود پیلے گلاب کی پتیوں کو بے خیالی میں نوچتے ہوئے کہا۔ ''امو! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کل اس وقت میں کچن میں تھی جب آپ کے لاڈلے نے ناشتے کے بعد فون پر کسی سے بات کی۔ مجھے یاد آ رہا ہے کچن کی کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے اس گفتگو میں جین کا لفظ صاف سنا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے...... خیریت تو ہے جین......'' وہ ذرا توقف کر کے دوبارہ بولی۔ ''امو! آپ مانیں یا نہ مانیں۔ یہ وہی جین ہے۔''
امو کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرانے لگے تھے۔
فارہ بات جاری رکھتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''کل تک تو مجھے صرف شک تھا لیکن اب آپ کے لاڈلے کا موڈ دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ یہ وہی لڑکی جین ہے اور اس نے آپ کے بھانجے کو بتا دیا ہے کہ تین چار سال پہلے وہ اس سے ملنے ہمارے گھر تک پہنچی تھی۔''
اموثمینہ نے اٹھ کر بالکونی کا ایک چکر لگایا پھر ایک گہری سانس لے کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔
فارہ نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''بتائیں، جب وہ پوچھے گا کہ اتنی اہم بات آپ نے اس سے کیوں چھپائی تو کیا جواب دیں گی؟''
اموثمینہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ وہ نہ ہی پوچھے...... اور اگر پوچھ بھی لے گا تو میں وہی کہوں گی جو مجھے کہنا چاہیے۔''
''اور آپ کو کیا کہنا چاہیے؟''
''فارہ! تم پولیس والیوں کی طرح مجھ سے سوال جواب نہ کرو۔ تم میری ماں نہیں ہو، میں تمہاری ماں ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ کب کیا کرنا ہے۔''
''آپ کو پتا تو ہے لیکن آپ سے ہوتا نہیں ہے۔ اگر آپ سے ہوتا تو آپی شائلہ کی شادی اس خرانٹ ذیشان سے ہونے ہی نہ دیتیں۔ اسی وقت آپ کا لاڈلا آپ کا داماد بن جاتا۔ اب تو کسی وقت مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ بس ایک ضد کے ساتھ جی رہی ہیں۔ ایک ایسی ضد جس کے نتیجے میں آپ کا بھانجا آپ کا داماد تو شاید بن جائے لیکن میری لائف ایک مسلسل مصیبت بن کر رہ جائے گی۔''

''یہی تو تیری غلط فہمی ہے فارہ۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں تیرے لیے شامیر جیسا تابعدار شوہر پورے جگ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ میں یونہی خود کو اس کام میں ہلکان نہیں کر رہی ہوں...... بس اب تو چپ ہو جا۔''

فارہ چند لمحے پیچ و تاب کھاتی رہی پھر واپس موضوع پر آتے ہوئے بولی۔ ''اچھا تھوڑا سا اضافہ میری عقل میں بھی فرمائیں۔ آپ کے بھانجے صاحب جب آپ سے پوچھیں گے کہ جین والی خبر آپ نے آج تک ان سے کیوں چھپائی تو کیا کہیں گی؟''

''اگر ایسا ہوا بھی تو...... بات بالکل سیدھی ہے فارہ! وہ لڑکی زویا شروع میں ہی زبردست تیور دکھا رہی تھی۔ وہ بیاہ کر پاکستان آنا نہیں چاہتی تھی۔ شامیر بمشکل اس کے چنگل سے نکلا تھا اور کسی حد تک نارمل ہوا تھا۔ تب یہ جین آکر ہمارے متھے لگ گئی۔ میں شامیر سے یہی کہوں گی کہ میں اسے پھر سے اس تکلیف دہ چکر میں پھنستے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے جین کو سرد مہری دکھائی اور اس کے آنے کی اطلاع بھی شامیر کو نہیں دی۔''

فارہ نے برہم انداز میں اپنے رنگ شدہ بالوں کو چہرے سے ہٹا کر شانے پر پھینکا اور بولی۔ ''بال کی کھال اتارنے والا ہے وہ...... مجھے نہیں لگتا کہ آپ کی یہ بات اسے آسانی سے ہضم ہوگی۔''

''ہضم ہوتی ہے یا نہیں، تم اس کی فکر نہ کرو۔ تم بس ایک بات ذہن میں رکھو۔ اگر وہ اس معاملے میں بات کرتا ہے تو تم نے خود کو بالکل لاعلم بتانا ہے۔ تم جین کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو، سمجھیں؟''

☆☆☆

شامیر شام کو ہوٹل واپس آیا تو امو خالہ اپنے کمرے میں صوفے پر لیٹی تھیں۔ افشاں ان کا سر دبا رہی تھی۔ وہ بے چین ہو گیا۔ امو خالہ نے اسے بتایا کہ دوپہر سے طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بلڈ پریشر شوٹ کر گیا ہے۔ شامیر نے فارہ کو بی پی آپریٹس لانے کا کہا کہ بلڈ پریشر چیک ہو سکے۔ فارہ بولی۔ ''اب فائدہ نہیں۔ دوا کھائی ہے، کیپسول بھی زبان پر نچوڑ دیا تھا۔''

امو نے کہا۔ ''شامی! میرا خیال ہے کہ اب واپس ہی چلیں۔ یہ نہ ہو طبیعت زیادہ بگڑ جائے بلکہ......'' وہ چند سیکنڈ رکیں پھر کہا۔ ''میں تو کہتی ہوں اب واپس پاکستان ہی چلا جائے۔''

شامیر نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ واپس فرینکفرٹ پہنچ کر وہ ان کا چیک اپ کرائے گا۔ کچھ دیر تک امو کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ کل بھی باس عظمت سلطان صاحب سے رابطے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر رابطہ ہو نہیں سکا تھا۔ آج اسکائپ پر پہلی کوشش ہی کامیاب رہی۔ رسمی کلمات کے بعد شامیر بولا۔ ''سلطان صاحب! ایک ناخوشگوار اطلاع ہے آپ کے لیے۔ زویا راشد یاد ہے نا جو چار پانچ سال پہلے یہاں چینل کے لیے کام کرتی تھی؟''

''ہاں ہاں...... اسے کیسے بھول سکتے ہیں۔''

''اس کے حالات آج کل بہت خراب ہیں اور جو کچھ میں آج تک معلوم کر سکا ہوں، اس کے مطابق حالات کی خرابی کی وجہ ہماری وہی اسٹوری بنی ہے جس پر میں نے اور زویا نے کام کیا تھا۔''

''سہراب درانی والی؟'' سلطان صاحب نے تصدیق چاہی۔

شامیر نے اثبات میں جواب دیا اور بولا۔ ''سلطان صاحب! شہادتیں یہ بتا رہی ہیں کہ اس رپورٹ کی وجہ سے یہاں جرمنی میں زویا کے خلاف انتقامی کارروائی ہوئی۔ پہلے ایک ایکسیڈنٹ کی آڑ میں اسے بری طرح مارا پیٹا گیا...... بعد میں میونخ میں واقع ان کے گھر پر ڈکیتی کی خوفناک واردات ہوئی جس میں زویا تو بچ گئی مگر اس کی والدہ شدید زخمی ہوئی اور زویا کی بہن کو بھی سخت جسمانی نقصان پہنچا۔ پتا چلا ہے کہ وہ سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہوئی اور اس کا حمل ضائع ہو گیا۔'' شامیر نے اجتماعی زیادتی والی بات جان بوجھ کر گول رکھی۔

سلطان صاحب ساری بات سن کر سخت حیران ہوئے۔ ''شامیر! تو تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب سہراب درانی نے کیا؟''

''لگ تو یہی کچھ رہا ہے جی۔''

''لیکن تمہیں تو معلوم ہے شامی! وہ اس رپورٹ

کے منظرِعام پر آنے کے کچھ ہی ہفتے بعد ایک اور مقدمے میں اریسٹ ہوگیا تھا...... اور پھر فوراً ہی دو تین اور مقدمے چل پڑے تھے۔ اسے باقاعدہ سزا ہوگئی تھی۔ وہ تب سے اب تک جیل سے نکلا ہی نہیں۔ اس کے سارے ساتھی تتر بتر ہوچکے ہیں۔ پورا سیٹ اپ تقریباً ختم ہوچکا ہے۔''

''آپ کی بات درست ہے جی...... لیکن کہا یہ جارہا ہے کہ سہراب نے یہ سب کچھ اپنے ساتھی رونالڈو عرف نمرسی نامی مقامی بدمعاش کے ذریعے کروایا ہے۔''

''رونالڈو نمرسی......'' سلطان صاحب نے شامیر کے الفاظ دہرائے...... کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ ''لیکن میری معلومات کے مطابق رونالڈو، سہراب درانی کا ساتھی نہیں بلکہ ففٹی ففٹی کا پارٹنر تھا اور ہماری رپورٹ منظرِعام پر آنے سے پہلے ہی ان دونوں میں شدید اختلافات پیدا ہوچکے تھے۔''

شامیر پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''پھر اس کا مطلب تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ...... زویا کے اہلِ خانہ کے ساتھ ہونے والے ظلم میں سہراب کا ہاتھ نہ ہو...... یہ رونالڈو نمرسی کی ذاتی کارروائی ہو۔''

☆☆☆

رنگوں، خوشبوؤں اور قدرتی نظاروں سے مزین، جرمنی کا یہ خوبصورت قصبہ لیونابرگ، شامیر کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ پچھلی مرتبہ بھی جب وہ جرمنی آیا تھا، اس کی خواہش تھی کہ وہ یہ قصبہ دیکھے مگر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ شاید ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ شامیر کے یہاں آنے کی وجہ جین کی ایک فون کال بنی تھی جو اس نے کل دوپہر کی تھی۔ جین نے بتایا تھا کہ لیونابرگ میں ایک جرمن خاتون ایسی رہتی ہیں جن سے زویا کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ یہ خاتون چند برس پہلے مسلمان ہوچکی تھیں اور ان کا نام حامدہ رضوان تھا۔ جین جانتی تھی کہ حامدہ کی حیثیت زویا کی گہری رازدار کی تھی بلکہ شاید وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپاتی تھیں۔ جین نے کوشش کرکے حامدہ کا پتا دریافت کیا تھا...... بلکہ یہ دو پتے تھے۔ جین کو امید تھی کہ حامدہ ان میں سے ایک پتے پر مل جائے گی اور اگر یہ نہ بھی ہوا تو ان دو پتوں سے اس کا کھوج ضرور مل جائے گا۔

ٹرین سے اترنے کے بعد شامیر پیدل ہی چل دیا۔ ایڈریس والی پرچی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے دو جگہوں پر راہ گیروں سے پوچھ کر اپنی سمت درست کی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ سورج کی الوداعی کرنیں پھولوں سے لدی ہوئی بالکونیوں اور گھروں کی مخروطی چھتوں کو بوسہ دے رہی تھیں۔ قصبے کی زندگی میں دلکشی کے ساتھ ساتھ عجیب سا ٹھہراؤ اور سکون محسوس ہوتا تھا۔

نہ جانے کیوں ایک بار پھر زویا کے کہے ہوئے الفاظ شامیر کے کانوں میں گونجنے لگے۔ فرینکفرٹ میں گھومتے ہوئے وہ دونوں ایک ''پری'' سے ملنے اور اس کے ساتھ تصویریں کھنچوانے گئے تھے۔ شٹل کاک کی شکل والی اس عمارت کی بات چل نکلی تھی، جس کے ذریعے شامیر نے سہراب کی غیرقانونی پراپرٹی کا کھوج لگایا تھا۔ زویا نے کہا تھا۔ ''شومیر! واقعی آپ کی کھوج لگانے کی حس بہت زبردست ہے۔ کیا پتا کسی وقت مجھے بھی آپ کی ضرورت پڑ جائے۔'' جب شامیر نے اس فقرے کا مطلب پوچھا تو وہ بولی تھی۔ ''کسی دوسرے شہر میں گھومتے پھرتے میں اکثر گم ہوجاتی ہوں۔ کیا پتا کہ کسی وقت ایسا ہوجائے اور میرے گھر والے مجھے ڈھونڈنے کے لیے آپ کو بلالیں۔''

زویا کی مذاق میں کہی ہوئی یہ بات آج کئی سال بعد سچ ثابت ہورہی تھی۔ وہ واقعی کہیں گم ہوچکی تھی اور شامیر اسے کھوجنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ کہاں تھی؟ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اور وہ دوسروں کے ساتھ کیا کررہی تھی؟

قصبے کی نہایت شفاف نیم سرد ہوا میں گھنے درختوں کے نیچے خوبصورت سڑک پر چلتے چلتے نہ جانے کیوں اسی گیت کے الفاظ شامیر کو یاد آگئے جو ان دونوں نے کبھی دریائے مائنز کے کنارے سنا تھا۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور وہ ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے
اسے صحرا میں سایہ پسند نہیں

اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے
وہ انہونیوں کی متلاشی، وہ بے نشاں منزلوں کی راہی
وہ محبت ہے...... میرے یار و محبت ہے....

یہ گیت اکثر و بیشتر شامیر کی سماعت میں گونجتا تھا اور جب بھی ایسا ہوتا تھا اس کے اندر ایک عجیب سا گداز پیدا ہوتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک یقین بھی جاگتا تھا...... ہاں، سب ڈوریں ٹوٹ چکیں...... لیکن ایک ڈور اب بھی موجود ہے۔ ایک ناتا اب بھی برقرار ہے۔

قصبے کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ پتھریلی سڑکوں اور گلیوں کی دونوں جانب چھوٹے چھوٹے ٹیکنی کلر گھر تھے۔ جیسے خوبصورت کھلونے ترتیب سے رکھے ہوں۔ حامدہ رضوان نامی اس خاتون کو ڈھونڈنا کتنا آسان یا کتنا دشوار ثابت ہوگا؟ یہ سوال شامیر کے ذہن میں بار بار ابھر رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس سوال کا جواب بہت آسان ثابت ہونے والا ہے۔ اسے خوش قسمتی ہی کہا جائے گا کہ وہ جس پہلے ایڈریس پر پہنچا، وہی حامدہ کا ایڈریس ثابت ہوا۔ ڈور بیل پر جو خاتون باہر نکلیں، وہ حامدہ ہی تھیں۔ ان کی عمر 30 سے کچھ اوپر ہی رہی ہوگی۔ انہوں نے حجاب کیا ہوا تھا۔ نیچے ایک کھلا سا پھول دار لبادہ تھا۔ وہ شامیر کو پہلی نظر میں ہی اچھی اور خوش اخلاق لگیں پھر فوراً ہی شامیر کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ اس نے انہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں؟ یہ ٹھیک سے یاد نہیں آیا۔

"جی فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" خاتون نے شستہ انگلش میں پوچھا۔

شامیر نے دروازے پر کھڑے کھڑے اپنا مختصر تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ اپنے کسی کام سے پاکستان سے یہاں آیا تھا اور اب زویا کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔

خاتون حامدہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔ وہ شامیر کو گہری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ یوں لگا کہ وہ شامیر کے بارے میں پہلے سے کافی کچھ جانتی ہیں۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد انہوں نے شامیر کو اندر بلا لیا۔ مخروطی چھت والا یہ چھوٹا سا دو منزلہ گھر باہر سے جتنا رنگ برنگا تھا، اندر سے بھی اتنا ہی خوبصورت اور سجا ہوا تھا۔ جگہ جگہ پھول مہک رہے تھے۔ ایک کمرے میں لکڑی کی دیوار پر دل کی شکل میں سرخ گلاب اور لالے کی کلیاں بڑی نفاست سے سجائی گئی تھیں۔ کچن کی طرف سے کھانے کی خوشبو بھی اڈر ہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آج اس گھر میں کوئی چھوٹی موٹی تقریب ہے۔ اس گھر میں حامدہ اپنے شوہر رضوان اور ڈھائی تین سالہ بچے عمر کے ساتھ رہتی تھی۔ گول مٹول بچہ بھی اپنی ماں ہی کی طرح خوش اخلاق اور خوبصورت تھا۔ اس نے بڑے نستعلیق لہجے میں شامیر کو السلام علیکم کہا۔ رضوان ملک کی عمر 35 کے لگ بھگ تھی۔ پیشانی پر ہلکا سا محراب کا نشان ان کے مذہبی ہونے کی نشاندہی کرتا تھا۔ وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھے۔

شامیر پر انکشاف ہوا کہ آج یہ خوش و خرم جوڑا اپنی شادی کی چوتھی سالگرہ منا رہا ہے۔ شامیر نے ان سے اجازت چاہی اور معذرت بھی کی کہ وہ ان کی مصروفیت میں مخل ہوا۔ اس نے مسز حامدہ سے کہا کہ وہ کل کسی وقت حاضر ہو جائے گا۔ جب مسز حامدہ اور مسٹر رضوان کو معلوم ہوا کہ وہ یہاں کسی ہوٹل میں ٹھہرے گا تو انہوں نے اسے جانے نہیں دیا اور بالائی منزل کا ایک کمرا اس کے لیے کھول دیا۔

چائے پینے کے دوران میں شامیر نے ایک بار پھر زویا کا تذکرہ چھیڑا۔ ایک بار پھر مسز حامدہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا تاہم انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس بارے میں اطمینان سے بات کریں گے۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ جو کچھ بھی مجھے معلوم ہے، میں ضرور بتاؤں گی۔"

اور یہی وقت تھا جب شامیر کے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور اسے یاد آ گیا کہ اس نے مہربان چہرے والی اس خاتون کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ پچھلی بار جب وہ یہاں آیا تھا، وہ اور زویا فرینکفرٹ کی اسکائی لین دیکھنے گئے تھے۔ وہیں دریا کے کنارے اس خاتون سے زویا کی ملاقات ہوئی تھی، دونوں بے تکلفی سے بغلگیر ہوئی تھیں اور چٹ چٹ ایک دوسرے کے گالوں کے بوسے لیے تھے۔ اس وقت بھی زویا نے

شامیر کو یہی بتایا تھا کہ یہ اس کی ایک بیسٹ فرینڈ ہیں۔

شامیر اپنے خیال سے چونکا۔ مسز حامدہ کہہ رہی تھیں۔ ''تم ہمارے لیے اجنبی نہیں ہو۔ میں نے تمہیں ایک دفعہ زویا کے ساتھ دیکھا تھا۔ بعد میں جب ایک دفعہ زویا سے ملاقات ہوئی تو اس نے تمہارا ذکر کیا تھا۔''

شامیر بولا۔ ''مجھے بھی آپ کی اور زویا کی ملاقات یاد آ گئی ہے۔ آپ دونوں کامرس بینک کی بلڈنگ کے پاس ملی تھیں۔''

وہ ذرا شرما کر بولیں۔ ''ہاں، ان دنوں میری اور رضوان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ہم گھومنے پھرنے نکلے ہوئے تھے......''

نہ جانے کیوں مسز حامدہ کے اندازِ گفتگو سے شامیر کو اندازہ ہو رہا تھا جیسے مسز حامدہ اور زویا اب کافی دنوں سے نہیں ملیں۔

اس سجے سجائے گھر میں شامیر کو وہ ساری نشانیاں نظر آئیں جو اس مختصر گھرانے کے مذہبی رجحان، ان کی خوش اخلاقی اور کامیاب ازدواجی زندگی کی گواہی دیتی تھیں۔ شامیر کو معلوم ہوا کہ اس جرمن خاتون نے پاکستانی مسٹر رضوان سے صرف شادی کرنے کے لیے اسلام قبول نہیں کیا تھا...... بلکہ پہلے اس دینِ کامل کو اچھی طرح سمجھا تھا، اپنے اندر اتارا تھا اور پھر اسے قبول کیا تھا۔ مقاماتِ مقدسہ کی دو تین پینٹنگز بھی شامیر کو گھر کی دیواروں پر نظر آئیں۔ پھر ایک کمرے میں علامہ اقبالؒ کی تصویر نے بھی شامیر کو حیران کیا۔ ایک بڑی سلجھی ہوئی، شفاف اور راست زندگی اس گھر کے در و دیوار پر اپنی چمک دکھا رہی تھی۔ شاید یہی فرق تھا اس جوڑے میں اور ان میاں بیوی میں جو زویا کے ممی پاپا کہلاتے تھے۔ وہاں صرف ضرورت کے تحت اسلام قبول کیا گیا تھا اور ضرورت کے تحت ہی ایک شوہر نے ایک ''نیم مسلم'' بیوی کو قبول بھی کر لیا تھا۔ شامیر نے حامدہ اور رضوان کے ساتھ ہی ان کی سالگرہ کی تقریب میں حصہ لیا اور ایک پُرتکلف کھانا بھی کھایا جو روسٹ کی ہوئی ترکی اور پاکستانی طرز کے سیخ کبابوں پر مشتمل تھا۔ بہرطور اس ساری مصروفیت کے دوران میں شامیر محسوس کرتا رہا کہ مسز حامدہ کچھ الجھی ہوئی ہیں...... اس خوش کن گھریلو تقریب کے علاوہ بھی ان کے دماغ میں بہت کچھ چل رہا ہے۔

شامیر بالائی منزل پر اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ لیونا برگ میں سردی نسبتاً زیادہ تھی۔ جرمن طرز کی کھڑکیوں میں سے قرب و جوار ہی نظر نہیں آتے تھے بلکہ آسمان کا کچھ حصہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ مسز حامدہ نے شاید مناسب نہیں سمجھا کہ شامیر ساری رات بے چینی اور تجسس میں گزارے۔ دس بجے کے لگ بھگ دروازے پر ناک ہوئی اور وہ اجازت لے کر اندر آ گئیں۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ دیکھ کر احترام کا سا جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ سنجیدہ موڈ میں نظر آ رہی تھیں۔

پہلے تو انہوں نے تفصیل سے پوچھا کہ وہ اب اتنے سالوں بعد زویا کو کیوں ڈھونڈ رہا ہے اور اسے یہاں لیونا برگ میں آنے کا مشورہ کس نے دیا تھا۔ شامیر نے جین کا نام لیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے تجسس سے مجبور ہو کر یہ بادہ پیمائی کر رہا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ اس سے ''بریک اپ'' ہونے کے بعد زویا اب کس طرح کی زندگی گزار رہی ہے۔ بہرحال وہ اس کی زندگی میں کسی بھی طرح کی مداخلت کا ارادہ نہیں رکھتا۔

حامدہ نے پوچھا۔ ''تم زویا کے شوہر سے ملے ہو، اس سے مل کر تم نے کیا محسوس کیا؟''

''اس سے مل کر تو یہی محسوس ہوا کہ شاید اس سے کچھ زیادتی ہوئی ہے۔ بچے پر ماں اور باپ دونوں کا حق ہوتا ہے...... اور وہ بچی عینی کو لے کر کہیں اوجھل ہو چکی ہے۔ ایک سال سے زائد وقت گزر گیا ہے۔ رابرٹ کا بچی کے بغیر برا حال ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے شامیر! میاں بیوی کے اس جھگڑے میں زیادتی کس کی طرف سے ہے؟''

''بظاہر تو یہی لگتا ہے جی کہ زویا میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں اور اس کی ازدواجی زندگی کے متاثر ہونے میں شاید اس کی اپنی غلطیاں ہی اہم کردار ادا کر رہی ہیں...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ کسی وقت یہ شبہ بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ شاید حالات کی اصل تصویر وہ نہ ہو جو نظر آ رہی ہے...... زویا کی کچھ مجبوریوں نے

اسے اس راہ پر ڈال دیا ہو۔''
حامدہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر دکھی لہجے میں بولی۔ ''مسٹر شامیر! مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں زویا کے حق میں کچھ نہیں بول سکتی اور اگر بولوں گی تو یہ بد دیانتی کہلائے گا۔ رائے اور مشورہ بھی تو ایک امانت کی طرح ہی ہوتا ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''زویا گو مسلمان تھی مگر اسلامی شعائر کی پابند تو وہ پہلے بھی نہیں تھی...... گھر میں ڈکیتی والی واردات کے بعد جب اس کا گھرانا معاشی مسئلوں کا شکار ہوا تو وہ بھی بدلنا شروع ہوگئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ تمہاری جدائی کا سوگ بھی اس نے بس وقتی طور پر منایا، پھر اپنے خیالات کے بہاؤ میں بہنے لگی۔ رابرٹ سے اس کی شادی بھی بس اپنے لیے معاشی آسانیاں پیدا کرنے کے لیے ہی تھی۔ بے شک اس نے شادی سے پہلے علامتی طور پر رابرٹ کو مسلمان بھی کرلیا تھا مگر شادی کے بعد اس نے خود بھی اسلامی شعائر کی پروا نہیں کی۔ اب کہنے والے تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ وہ جس لڑکے ٹام کے ساتھ اوجھل ہوئی ہے، وہ بھی کچھ زیادہ مضبوط کردار کا لڑکا نہیں ہے، باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ بغیر تصدیق کے کسی پر الزام لگانا بہت بڑا گناہ ہے۔''

''آپ سے زویا کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟''

''میری شادی کے بعد وہ شاید دو دفعہ ہی مجھ سے مل سکی ہے، ایک تو فرینکفرٹ والی وہ ملاقات جس کا تم نے ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد اگلے ماہ شاید ایک یا دو بار مختصر ملاقات ہوئی تھی۔ پھر وہ اپنے حال میں مگن اور میں اپنے میں مگن ہوگئی...... ایک دو جاننے والوں سے اس کے بارے میں خبریں ملتی رہیں۔ اس کی شادی بھی بڑی خاموشی سے ہوئی تھی۔ بس دونوں گھرانوں کے چند افراد ہی مدعو تھے۔''

''لیکن مسز حامدہ! میں نے تو سنا ہے کہ آپ دونوں میں گہری دوستی تھی اور آپ ایک دوسرے کی ہمراز بھی تھیں۔''

''میں نے کہا ہے نا کہ ڈکیتی والی واردات کے بعد وہ بڑی تیزی سے بدلنا شروع ہوگئی تھی اور اب تو جیسے اپنے ماضی سے کٹ آف ہی ہوگئی ہے۔'' مسز حامدہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔

کمرے کے ساتھ ہی چھوٹی سی لابی بھی تھی۔ ایک دیوار پر بہت سی چھوٹی بڑی فریم شدہ تصویریں نظر آرہی تھیں۔ کچھ مسز حامدہ اور ان کی فیملی کی تھیں...... کچھ قریبی عزیزوں کی۔ ایک تصویر دیکھ کر اسے شبہ ہوا کہ اس میں زویا بھی ہے۔ حامدہ سے اجازت لے کر وہ لابی میں تھوڑا سا آگے گیا اور تقریباً نو انچ ضرب بارہ انچ کی اس تصویر کو ذرا دھیان سے دیکھا۔ ہاں، وہ زویا ہی تھی۔ وہی من موہنی صورت، مانگ نکال کر بنائے گئے سلکی بال، گال میں ڈمپل اور پیشانی پر چاند سا چمکتا ہوا۔ وہ ایک ہاف سلیو، کڑھائی دار شوخ لباس میں ملبوس تھی۔ ایک اور جرمن لڑکی کے علاوہ حامدہ اور مسٹر رضوان بھی تصویر میں نظر آرہے تھے۔ شامیر کو لگا کہ یہ تصویر شاید ڈیڑھ دو سال پرانی ہے۔ اس میں زویا کے وزن میں انیس بیس کا فرق نظر آرہا تھا اور اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں بھی کچھ کم دکھائی دیتی تھیں۔

''یہ کب کی تصویر ہے؟'' شامیر نے پوچھا۔

''یہ...... میری...... شادی کے موقع پر اتاری گئی تھی۔'' حامدہ نے جلدی سے کہا۔

''مجھے لگ رہا تھا، شاید یہ زیادہ پرانی نہیں ہے۔'' شامیر بولا۔

''نہیں، چار سال تو ہوگئے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

پتا نہیں کیوں شامیر مطمئن نہیں ہو پایا۔ اسے یہی لگا کہ یہ تصویر اتنی پرانی نہیں جتنی مسز حامدہ بتا رہی ہیں...... یعنی تقریباً ڈیڑھ دو سال پہلے کی۔

پیچھے ہٹنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر تصویر کو دھیان سے دیکھا۔ یہ تصویر اتاری تو واقعی کسی فنکشن میں گئی تھی۔ یکا یک شامیر چونک گیا۔ اسے تصویر میں زویا کے ایک بازو پر کہنی کے پاس ایک نشان نظر آیا۔ یہ وہ دو تین ٹانکے تھے جو تقریباً چار سال پہلے روڈ ایکسیڈنٹ والے جھگڑے کے بعد اس کے زخم پر لگائے گئے تھے۔ شامیر اس نشان کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ یہ

تصویر ہرگز ہرگز مسز حامدہ اور رضوان کی شادی کے موقع کی نہیں تھی۔ ان کی شادی چار سال پہلے جون کی شروع کی تاریخوں میں ہوئی تھی، یعنی آج ہی کا دن 12 جون اور زویا سے مار پیٹ والا واقعہ جولائی کے آخر میں ہوا تھا۔ مسز حامدہ کو غلطی ہو رہی تھی، یہ ان کی شادی پر لی گئی تصویر نہیں تھی...... یا پھر وہ جان بوجھ کر غلط بیانی کر رہی تھیں۔

''یہ دیکھو مسٹر شامیر! یہ میرے فادر ان لاء یعنی رضوان کے والد مرحوم کی تصویر ہے۔ یہ باقاعدہ عالم دین تھے۔ رضوان کو مذہب سے لگاؤ والدین سے ورثے میں ملا ہے......''

شامیر اس باریش بزرگ کی تصویر دیکھنے لگا مگر اس کا ذہن مسلسل زویا والی تصویر میں الجھا ہوا تھا۔ مسز حامدہ نے کہا تھا کہ ان کی شادی کے بعد زویا سے ان کا رابطہ ختم ہو چکا ہے۔ شروع میں بس وہ ایک دو دفعہ زویا سے ملی تھیں اور پھر ختم لیکن یہ تصویر بتا رہی تھی کہ شاید ڈیڑھ دو سال...... یا دو ڈھائی سال پہلے تک بھی دونوں ملتی رہی ہیں اور ان کے گھریلو مراسم رہے ہیں......

اگلے روز دوپہر کے وقت شامیر نے اپنے میزبانوں سے جانے کی اجازت مانگی، یقیناً وہ اس خوش و خرم فیملی کے حوالے سے بڑے اچھے تاثرات لے کر جاتا مگر درمیان میں جو تصویر والا معاملہ آ گیا تھا اس نے شامیر کو سخت الجھن میں ڈال دیا تھا۔ مسز حامدہ جیسی راست گو عورت کو اس طرح کا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اب بھی ان کے زویا سے مکمل رابطے موجود ہوں؟ شامیر نے مسز حامدہ اور ان کی فیملی پر تو یہی ظاہر کیا کہ وہ لیونا برگ سے واپس جا رہا ہے مگر اس کا ارادہ ایسا نہیں تھا۔

راستے میں ایک پارک کے اندر سے ہی اس نے باس عظمت سلطان صاحب سے ویڈیو لنک پر بات کی، اس نے کہا۔ ''مجھے آپ کی ہیلپ کی ضرورت ہے۔''

''جی فرماؤ۔'' انہوں نے بے تکلفی سے کہا۔

''چینل کے مقامی سیٹ اپ میں چوکس بندہ کون ہے؟''

''بندہ تو نہیں بندی ہے۔ مس مارگریٹ...... تم ایک بار اس سے مل بھی چکے ہو۔ سمجھو زویا کی جگہ پر ہی کام کر رہی ہے پچھلے دو ڈھائی سال سے۔''

''تو ٹھیک ہے، وہ فرینکفرٹ سے کتنی دیر میں یہاں لیونا برگ پہنچ سکتی ہے؟''

''میرے خیال میں وہ بائی روڈ آنا پسند کرے گی۔ اس کے پاس اپنی کار ہے۔ اندازاً پانچ چھ گھنٹے میں پہنچ جائے گی۔''

''اوکے۔ میں اب یہاں کسی ہوٹل میں کمرا بک کراؤں گا۔ ایک گھنٹے تک میں آپ کو بتا دوں گا کہ کہاں موجود ہوں۔ آپ مارگریٹ کو میرا نمبر بھی دے دیں۔''

''ٹھیک ہے...... جیسا تم کہتے ہو وہ ہو جائے گا...... لیکن...... ایک مشورہ میں بھی دینا چاہتا ہوں۔''

''جی کہیں۔''

''تم یہاں جرمنی میں زیادہ دیر نہ ہی رکو تو اچھا ہے۔ میرے خیال میں یہ کچھ زیادہ عقلمندی والی بات نہیں ہوگی۔''

''یہ آپ کس لیے کہہ رہے ہیں؟ کہیں آپ کے ذہن میں وہی نمرسی والی بات تو نہیں؟''

''وہ بھی ہے۔ میں نے پچھلے دو تین دن میں رونالڈ نمرسی کے بارے میں کافی کچھ معلوم کرایا ہے۔ میں اب یہ بات تمہیں پورے یقین کے ساتھ بتا سکتا ہوں کہ زویا کے خلاف جس انتقامی کارروائی کا ذکر تم کر رہے ہو، وہ سہراب درانی نے ہرگز نہیں کی۔ ہمارے والی اسٹوری آن ایئر ہونے سے کافی پہلے ہی سہراب اور نمرسی کی پارٹنرشپ ٹوٹ چکی تھی۔ پھر سہراب اور اس کے قریبی ساتھی ویسے ہی جیل میں چلے گئے۔ یہ جو کیا ہے، نمرسی نے ذاتی طور پر کیا ہے۔ سنا یہ ہے کہ وہ ویسے بھی کٹر قسم کا جرمن ہے اور امیگرینٹس لوگوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔''

شامیر کے ذہن میں فوراً زویا کی ماما سارہ جیم کا چہرہ آ گیا۔ سارہ اور اس کی بیٹیاں خود پر ہونے والی زیادتی کی ساری ذمے داری پاکستانی سہراب درانی پر ڈالتی رہی تھیں اور اب بھی ڈال رہی تھیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس سامنے آ رہی تھی۔

عظمت سلطان صاحب نے بات جاری رکھتے

ہوئے کہا۔ ”شامیر! میرا اور تمہارا رشتہ صرف ایک باس اور ماتحت کا نہیں ہے، میں تمہیں گھر کے فرد کی طرح اہمیت دیتا ہوں۔ زویا تمہاری زندگی سے اسی دن نکل گئی تھی جس دن اس نے تمہارے ساتھ پاکستان آنے سے انکار کیا تھا اور اب تو وہ تمہاری اطلاعات کے مطابق کچھ اور ہی راستوں پر گامزن محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں اگر کوئی سوچ تمہارے ذہن میں ہے تو اسے نکال دو۔ یہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ نمرسی کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔“

”اس اندیشے سے تو تم بھی مکمل طور پر انکار نہیں کرسکو گے۔ بے شک نمرسی اس وقت جرمنی میں نہیں ہے۔ اس کا وہ پہلے والا زور بھی ٹوٹ چکا ہے لیکن بدکرداری کی بدکرداری اور عداوت کسی وقت بھی سامنے آسکتی ہے......“

عظمت سلطان صاحب، شامیر کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس قسم کی ہی بات کچھ دن پہلے حولیہ نے بھی کہی تھی۔ وہ حولیہ اور سلطان صاحب کو کیسے بتاتا کہ وہ جس کو ”ماضی“ بتا رہے ہیں، وہ ماضی نہیں ہے...... وہ حال ہے...... فرینکفرٹ کی وہ لڑکی آج بھی ایک کانٹے کی طرح اس کے دل میں اٹکی ہوئی ہے۔ اب وہ یہ کانٹا نکالے بغیر واپس نہیں جاسکتا...... نہ ہی کوئی اندیشہ اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک سکتا ہے۔ اس کے اندر کی متلاشی روح اب پوری طرح بیدار ہوچکی تھی۔

☆☆☆

شامیر ہوٹل میں تھا اور بے قراری سے چینل کی رپورٹر مارگریٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق وہ فرینکفرٹ سے روانہ ہوچکی تھی۔ شامیر چاہتا تھا کہ مارگریٹ کو مسٹر رضوان اور مسز حامدہ کی چھان بین پر لگائے۔ اسے پوری امید تھی کہ تحقیقی صحافت سے تعلق رکھنے والی مارگریٹ یہ کام اچھی طرح کرلے گی۔

شامیر کے فون پر کال کے سگنل آئے۔ دوسری طرف فارہ ہی تھی۔ فارہ اور امو خالہ وغیرہ ابھی تک پیڈربورن میں تھے۔ شامیر نے ان سے کہا تھا کہ وہ ایک رات کے لیے چینل کے کام سے نکلا ہے، اگلے روز واپس پہنچ جائے گا۔

”کہاں ہیں جناب عالی! واپسی کے لیے نکلے یا نہیں؟“ فارہ نے لہجے کو شوخ بناتے ہوئے کہا۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد شامیر بولا۔ ”سوری فارہ! میں فون کرنے ہی والا تھا۔ دراصل یہاں کام تھوڑا سا لمبا ہوگیا ہے۔ آج کی رات مجھے مزید رکنا پڑ جائے گا۔“

یہ بات سن کر فارہ پہلے تو چپ ہوئی، پھر ایکدم بھڑک اٹھی۔ یوں لگا جیسے وہ کئی دن سے جو غصہ اپنے اندر دبائے ہوئے تھی، وہ یکا یک چنگاری پا کر شعلہ بن گیا ہے۔ نہایت تپے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”آپ ٹھیک سے بتا کیوں نہیں دیتے کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”کیا مطلب فارہ؟“

وہ مزید تلخ آہنگ میں بولی۔ ”آپ بتائیں، آپ کس کو بے وقوف بنا رہے ہیں؟ کیا آپ کے سوا باقی سب کی عقل بند ہوچکی ہے۔ صرف آپ ہی روشن اور ہوشیار دماغ والے رہ گئے ہیں؟ آپ بتا کچھ رہے ہیں، کر کچھ رہے ہیں۔ ٹھیک سے کہہ کیوں نہیں دیتے کہ اب تک وہی خبیث آپ کے دماغ میں گھسی ہوئی ہے اور آپ آفس ورک کی آڑ میں اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“

شامیر کو فارہ سے ایسے لب و لہجے کی توقع نہیں تھی۔ فارہ کا یہ غصیلا انداز اس نے بہت عرصے بعد دیکھا تھا...... وہ جیسے ٹھٹک سا گیا۔ ”یہ تم کس ٹون میں بات کر رہی ہو فارہ؟“

”میری ٹون آپ کی مسلسل غلط بیانیوں کی وجہ سے ایسی ہوئی ہے۔ آپ امو کو دھوکا دے سکتے ہیں، مجھے نہیں۔ آپ ہمارے حال پر رحم فرمائیں اور سچ بتا دیں۔ اگر وہ خبیث آپ کو مل گئی ہے یا ملنے والی ہے تو پھر ہمیں یہاں کیوں ٹانگ رکھا ہے ہوٹل میں...... ہمیں واپس پولیٹن بھیج دیں۔ کم از کم امو کو ٹھیک سے میڈیکل ایڈ مل سکے۔“

فارہ نے زویا کے لیے دوسری بار خبیث کا لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ طیش میں گویا ہوا۔ ”فارہ! تم اپنی زبان

سنبھال کر بات کرو۔ میں ایسے لہجے کا عادی نہیں ہوں۔"
"اگر آپ جھوٹ بولو گے...... مکاری دکھاؤ گے تو پھر ایسا لہجہ بھی سننا پڑے گا۔ آپ کو اتنا خیال بھی نہیں کہ امو بیمار ہیں اور......" فقرہ مکمل کیے بغیر اس نے یکلخت فون بند کر دیا۔

شامیر سناٹے کی سی کیفیت میں بیٹھا تھا۔ ایسی بدتمیزی کی توقع اسے فارہ سے نہیں تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس سے ایک بناوٹی لہجے میں گفتگو کرتی ہے۔ آج اس نے جو لہجہ اپنایا ہے، وہی اس کا اصل ہے۔ یہ کیسا زہر تھا جو اس کے اندر جمع ہوتا جا رہا تھا......

قریباً ایک گھنٹے بعد امو خالہ کا فون آ گیا۔ انہوں نے کہا۔ "شامی! پتا نہیں کہ وہ غصے میں تم سے کیا کچھ کہہ گئی ہے۔ میں نے ٹھیک ٹھاک کلاس لی ہے اس کی۔ اب بیٹھی رو رہی ہے۔ میں نے بھی چپ نہیں کرایا۔"

"امو! آج بڑا دکھ ہوا ہے اس کی باتیں سن کر...... اپنے آپ پر بھی غصہ آیا ہے کہ آپ کی طبیعت خراب تھی تو میں یہاں کیوں چلا آیا۔ میں آج رات کو ہی واپس آ رہا ہوں۔ آئی ایم ویری سوری امو خالہ۔"

"شامی! غلطی اس کی ہے۔ شرمندہ بھی اسی کو ہونا چاہیے اور مجھے لگتا ہے کہ اب وہ ہو بھی رہی ہے۔ کبھی کبھی اسے اپنی زبان پر اختیار نہیں رہتا۔ جب تک یہ معافی نہیں مانگے گی تم سے، میں بھی اس سے بات نہیں کروں گی۔ تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ اگر کام کی نوعیت ایسی ہے تو بے شک آج کی رات یہاں رہ لو۔"

امو خالہ نے جس طرح کی باتیں کیں، ان سے شامیر کے غم وغصے میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی۔ بہر حال وہ سوچ رہا تھا کہ اگر مارگریٹ وقت پر یہاں پہنچ جاتی ہے تو پھر وہ اسے ضروری ہدایات دے کر آج رات ہی یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔

مارگریٹ شام سات بجے کے قریب ہوٹل میں شامیر کے پاس پہنچ گئی۔ وہ سرخ وسپید رنگت والی ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ سرخ سویٹر اور جینز میں ملبوس تھی۔ یہاں کے اکثر لڑکے لڑکیوں کی طرح وہ اسموکنگ بھی کرتی تھی۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ وہ شامیر کو ڈبل اے چینل کے ایک اہم "محقق صحافی" کی حیثیت سے اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے بڑے دھیان سے شامیر کی ساری باتیں سنیں اور فرمانبرداری سے اس کی ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ شامیر نے اسے مسز حامدہ کے بارے میں ساری ابتدائی معلومات فراہم کر دی تھیں۔

مارگریٹ کے ساتھ ملاقات سے وہ کافی مطمئن ہوا اور تھوڑی ہی دیر بعد لیونا برگ کے اس نہایت دلکش قصبے سے واپس پیڈر بورن روانہ ہو گیا۔ قریباً تین گھنٹے کے سفر کے بعد وہ رات بارہ بجے کے قریب پیڈر بورن پہنچا۔ یہاں ہوٹل میں امو خالہ اس کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کے لیے خود کھانا گرم کیا اور اس کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرتی رہیں۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی تکلیف کا تذکرہ بھی کر رہی تھیں۔ شامیر نے سوچ لیا تھا کہ وہ کل انہیں واپس اسٹریٹ پولیٹن لے جائے گا۔

یہ رات کا آخری پہر تھا۔ شامیر تھکا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رہ رہ کر مسز حامدہ کا حجاب سے ڈھکا ہوا اجلا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ آخر انہوں نے اس تصویر کے حوالے سے غلط بیانی کیوں کی اور یہ کیوں ظاہر کیا کہ اب ان کا رابطہ زویا سے نہ ہونے کے برابر ہے، تین ساڑھے تین سال ہو گئے وہ اس سے ملی ہی نہیں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے فارہ کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر شامیر کی پیشانی پر بے ساختہ، ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں۔ وہ منہ موڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ دروازہ بھیڑ کر اندر آ گئی۔ کچھ دیر اس کے سامنے خاموش بیٹھی رہی پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ "سوری۔ میں کچھ سخت بول گئی۔ دراصل میں دوپہر سے بڑی شدت کے ساتھ آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

شامیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنے بوٹوں کے تسمے کھولتا رہا۔

تھوڑے انتظار کے بعد وہ دوبارہ بولی۔ "آپ کچھ زیادہ ہی ناراض لگ رہے ہیں...... دیکھیں، میں معافی مانگ رہی ہوں آپ سے۔"

اس مرتبہ شامیر نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں وہ پھر اسی ہیجان خیز نائٹی میں نظر آرہی تھی جس میں چند دن پہلے نظر آئی تھی بلکہ آج تو یہ لباس اپنے ڈھیلے ڈھالے انداز کی وجہ سے کچھ اور بھی حشر سامانی لیے ہوئے تھا۔ شامیر جلدی سے دوسری جانب دیکھنے لگا۔

فارہ نے اٹھ کر شامیر کے جوتے وارڈروب کے نچلے خانے میں رکھے اور دوبارہ شامیر کے سرہانے آن کھڑی ہوئی۔ چند سیکنڈ محویت سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اچانک اس کے پہلو میں آن بیٹھی اور اپنا رخسار اس کے کندھے سے ٹکا دیا۔

''پلیز...... پلیز۔'' اس نے کہا۔

''اچھا...... ٹھیک ہے۔ اگر تمہیں احساس ہوگیا ہے تو......'' شامیر نے اسے خود سے دور ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ اسی طرح اس کے ساتھ چپکی رہی۔

''نہیں...... آپ دل سے نہیں کہہ رہے ہیں۔'' وہ ناک میں گنگنائی۔

پھر یکایک جیسے اسے کچھ یاد آیا...... ''ارے۔ وہ آپ کی ہنسلی والی چوٹ کا کیا ہوا؟'' اس نے تیزی سے شامیر کا گریبان کھول کر اس کا کندھا عریاں کر دیا۔ وہاں نیلگوں نشان اور ہلکا سا ابھار موجود تھا۔ وہ اسے پوروں سے سہلاتی رہی تب اچانک اس پر اپنا گال رکھ دیا اور شامیر سے چپک سی گئی۔

شامیر نے اسے خود سے دور ہٹانے کی کوشش کی۔ ''نہیں، پہلے آپ مجھے معاف کریں۔''

''بھئی کر تو دیا ہے۔''

''اس کا عملی ثبوت دیں۔'' وہ پھر ناک میں گنگنائی۔

''وہ کس طرح؟''

''مجھے نہیں پتا۔'' اس نے کہا اور کچھ اور بھی شامیر کے ساتھ لگ گئی۔

شامیر بوکھلا گیا۔ اس کی سانسیں زیروزبر ہونے لگیں۔ یہ تنہائی اور یہ خاموشی بڑی سنگین نوعیت کی تھی۔ وہ شامیر سے معافی مانگنے کے لیے آئی تھی مگر معافی مانگنے یا سوری کہنے کے لیے کیا ایسا لباس پہننا ضروری تھا؟ اگر وہ واقعی معافی مانگنے کے لیے آئی تھی تو پھر شاید معافی کے علاوہ ''تلافی'' بھی کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ارادے پہلے بھی کچھ خطرناک ہی رہے تھے لیکن آج تو وہ سراپا خطرۂ ایمان بنی ہوئی تھی۔ کچھ بھی تھا، شامیر خاک کا پتلا تھا۔ بہک جانے کا امکان روزِ اول سے اس کی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کرتا تھا۔ اسے لگا کہ اس کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا ہے۔

دفعتاً سائڈ ٹیبل پر پڑے اس کے فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ ایک طرح سے تائیدِ غیبی کی طرح تھا۔ اس نے خود کو سنبھال کر فارہ سے علیحدہ کیا اور فون کی اسکرین دیکھی۔ اسے تعجب ہوا، یہ مارگریٹ کی کال تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی رابطہ کرے گی۔ ابھی چھ سات گھنٹے ہی تو ہوئے تھے۔

اس نے کال ریسیو کی اور بات کرتا ہوا باہر بالکونی میں آگیا۔ ''کیا بات ہے مارگریٹ؟''

''محترم شامیر! آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔ سراغ مل گیا ہے۔''

''کس کا؟'' شامیر نے تڑپ کر پوچھا۔

''مس زویا کا۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔

شامیر چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گیا۔

''یہ...... کیا...... کہہ رہی ہو تم؟'' وہ سخت حیرانی میں بولا۔

''میں پوری تصدیق کے بعد ہی آپ کو رپورٹ کر رہی ہوں۔'' مارگریٹ نے اعتماد سے جواب دیا۔

یہی وقت تھا جب اندر کمرے میں فارہ چڑھی ہوئی سانسوں اور لال بھبوکا چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جھنجلاہٹ صاف نظر آرہی تھی...... ''کہاں سے آگئی یہ منحوس کال۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

☆☆☆

شامیر اب جلد از جلد لیونابرگ پہنچنا چاہتا تھا۔ تاہم اس سے پہلے اس نے اموخالہ، فارہ اور افشاں کو ٹرین پر چڑھا دیا تاکہ وہ واپس ''پولیٹن'' پہنچ سکیں۔ اموخالہ اور فارہ کو اس نے یہی بتایا کہ آفس کے کام کے لیے اسے ہنگامی طور پر پھر لیونابرگ جانا پڑ گیا ہے۔ اس نے کبھی کوئی بات امو سے راز نہیں رکھی تھی لیکن آج کل

مجبور ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ وہی تھی جو جین کے ذریعے شامیر کے سامنے آئی تھی۔ امو خالہ نے ساڑھے تین برس پہلے جین کی لاہور آمد والی بات اس سے چھپائی تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھیں کہ شامیر دوبارہ زویا والے چکر میں پڑے۔ ان کی یہی احتیاط اب شامیر کے رویے میں بھی جھجک پیدا کر رہی تھی۔ کسی وقت اسے گہرا رنج محسوس ہوتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ امو خالہ سے اس بارے میں بات کرے۔ انہوں نے جین کی آمد والی اہم بات اس سے کیوں چھپائی؟ کیا انہیں اس کے کرب کا احساس نہیں ہوا تھا؟ پھر کسی وقت وہ سوچتا، کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ انہوں نے یہ بات کسی مقصد کے تحت چھپائی ہو؟ لیکن پھر وہ خود ہی اپنے اس خیال کو رد کر دیتا۔ امو خالہ ایسی نہیں ہو سکتی تھیں......

امو خالہ وغیرہ کو ٹرین میں سوار کرانے کے فوراً بعد اس نے مین اسٹیشن سے ہی لیونا برگ والی ٹرین پکڑی اور روانہ ہو گیا۔ اس کے اندر ایک ہلچل مچی ہوئی تھی...... اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ مسز حامدہ کی غلط بیانی والا اسراغ اتنی جلدی اسے زویا تک پہنچا دے گا۔ ٹرین میں سفر کے دوران میں ہی مارگریٹ سے فون پر شامیر کی بات ہوئی۔

مارگریٹ نے کہا۔ ''مسٹر شامیر! آپ کے جانے کے بعد میں نے مسز حامدہ کے گھر پر مسلسل نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ سامنے ہی ایک گیسٹ ہاؤس کی پارکنگ ہے۔ میں نے اپنی گاڑی وہاں کھڑی کی ہوئی تھی اور گاڑی کے اندر ہی موجود تھی۔ دس بجے کے قریب مسز حامدہ اکیلی ہی اپنی فیاٹ کار پر نکلیں اور چل پڑیں۔ میں ان کے پیچھے گئی۔ قصبے کے مضافات میں پہنچ کر وہ ایک ایسی بلڈنگ کے سامنے پہنچیں جہاں بہت سے رہائشی فلیٹس موجود ہیں۔ بلڈنگ کے مین گیٹ پر ہی مسز حامدہ اور مس زویا کی ملاقات ہوئی۔ مس زویا کے ساتھ ڈیڑھ دو سال کی پیاری سی بچی بھی تھی۔ میں نے دونوں کو پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔''

''اب زویا کہاں ہے؟''

''وہ وہیں بلڈنگ میں ہے۔ سیکنڈ فلور...... فلیٹ نمبر 18...... میں اب ہوٹل واپس آگئی ہوں۔''

''مسز حامدہ وہاں کتنی دیر رکیں؟''

''تقریباً ایک گھنٹا...... اس کے بعد مس زویا انہیں گاڑی تک چھوڑنے آئیں۔ اس دفعہ بچی ان کے ساتھ نہیں تھی۔ مس زویا سے رخصت ہو کر مسز حامدہ سیدھی اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئیں۔''

''ٹھیک ہے مارگریٹ...... ویل ڈن...... تم نے بہت اچھی خبر دی ہے۔ میں چند گھنٹے میں تمہارے پاس ہوٹل پہنچ رہا ہوں۔'' شامیر نے کہا۔

اس نے کال ختم کی ہی تھی کہ رابرٹ کی کال آگئی۔ یہ ویڈیو کال تھی۔ وہ اپنے گھر میں بہت افسردہ بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ہی ٹیبل پر دو سالہ عینی کی ایک تصویر دکھائی دے رہی تھی۔ رابرٹ نے اسے بتایا کہ پرسوں عینی کی دوسری سالگرہ تھی۔ سالگرہ اس نے اکیلے ہی منائی۔ تب سے اس کا دل بہت دکھا ہوا ہے۔

شامیر کے پاس غمزدہ رابرٹ کے لیے ایک سنسنی خیز اور اچھی خبر موجود تھی لیکن وہ فی الحال یہ خبر اسے پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے وہ پوری طرح تصدیق کرنا چاہتا تھا اور خود زویا سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے رابرٹ کے ساتھ تسلی تشفی کی بات کی اور کہا کہ وہ زویا کی تلاش کے سلسلے میں ہی نکلا ہوا ہے۔ جیسے ہی کوئی اچھی خبر ملی، وہ اسے ضرور آگاہ کرے گا۔

......طویل سفر اختتام پذیر ہوا اور شامیر چینل کی رپورٹر مارگریٹ کے پاس ہوٹل میں پہنچ گیا۔ یہ اتوار کا روز تھا...... سہ پہر کے تین بجے تھے۔ پھولوں اور رنگوں سے سجے ہوئے لیونا برگ کا موسم چمکیلا اور خوشگوار تھا۔ گراسی میدانوں میں کھیل کود اور سیر و تفریح ہو رہی تھی۔ خوشحالی، امن پسندی اور سکون یہاں کے باشندوں کے چہروں پر رقم تھے اور انہی روشن چہروں والے باشندوں میں وہ لڑکی بھی تھی جو اس کی زندگی سے اوجھل ہونے کے بعد یہاں چھپی ہوئی تھی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ پچھلے چار برسوں میں کسی نے اسے کتنا یاد کیا ہے اور اس کی ذات کے حوالے سے کیا کیا دکھ اٹھائے ہیں۔ جوں جوں وہ اور مارگریٹ زویا کی رہائش گاہ کے نزدیک پہنچ رہے تھے شامیر کے دل کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ زویا کا سامنا کس طرح کرے گا

اور وہ اس کا سامنا کس طرح کرے گی؟

مارگریٹ کی گاڑی شامیر خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ دونوں اب مطلوبہ بلڈنگ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ شامیر نے مارگریٹ سے پوچھا۔ ''تم نے کچھ اندازہ لگایا کہ مس زویا اس فلیٹ میں اکیلی ہے یا کسی کے ساتھ رہ رہی ہے؟''

''نہیں مسٹر شامیر! اس کا اندازہ تو مجھے نہیں ہوسکا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا، شاید آپ بھول گئے۔ جس وقت میں نے اوپر جا کر فلیٹ کا نمبر وغیرہ دیکھا، مجھے اندر کی صورتِ حال دکھائی نہیں دی تھی۔''

ایک درمیانے سائز کے گیسٹ ہاؤس کے سامنے انہوں نے گاڑی پارک کی اور باہر نکل آئے۔ ایک قریبی ریستوران کے باہر دور تک میزیں لگی ہوئی تھیں۔ بے فکرے لوگ، گروپس اور جوڑوں کی صورت میں بیٹھے بیئر وغیرہ پی رہے تھے یا اسنیکس لے رہے تھے۔ سہ پہر کی چمکیلی دھوپ میں نئے نئے ماڈلز کی گاڑیاں شفاف سڑک پر تیزی سے گزر جاتی تھیں۔

پلاننگ کے مطابق مارگریٹ تو وہیں اپنی فیاٹ کار کے آس پاس رہی اور شامیر اتر کر رہائشی عمارت کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ عمارت سے چالیس پچاس قدم دور ہی تھا کہ اس کی نگاہ ایک بغلی سڑک کی طرف اٹھی اور اس کی ساری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ چند سیکنڈ کے لیے دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے سرخ اسکرٹ میں ملبوس زویا کو دیکھا۔ اس نے بال تراشے ہوئے تھے اور اس کے کندھے پر ایک بڑے سائز کا جدید شولڈر بیگ تھا۔

یوں لگا جیسے وہ دو تین سیکنڈ پہلے شامیر کو دیکھ چکی تھی اور اب بے طرح ٹھٹکی ہوئی تھی۔ یکایک بجلی سی کوند گئی۔ وہ مڑی اور اوجھل ہوگئی۔

شامیر خود کو سکتے کی سی کیفیت سے نکال کر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ گلی کے موڑ پر پہنچا تو وہ دکھائی نہیں دی۔ خوش قسمتی سے شامیر کو اس کے سرخ اسکرٹ کی ایک جھلک نظر آگئی۔ وہ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں گھسی تھی۔

ایک زیبرا کراسنگ کو خطرناک طریقے سے پار کر کے شامیر برق رفتاری سے اسٹور تک پہنچا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ بدحواسی کے عالم میں شامیر کئی لوگوں سے ٹکرایا اور ان سے معذرت کی۔ یکایک اسے دوبارہ زویا کی جھلک نظر آئی۔ وہ اسٹور کے دوسرے دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔

شامیر چلایا۔ ''زویا......زویا رکو۔''

تب تک وہ باہر نکل چکی تھی۔ شامیر اندھا دھند اس کے پیچھے لپکا۔ یہ اس ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی عقبی سڑک تھی۔ اس سڑک کا رنگ ڈھنگ فوڈ اسٹریٹ کا سا تھا۔ یہاں کافی رش تھا۔ سرخ اسکرٹ کی جھلک اب کافی دور نظر آرہی تھی۔ شامیر لوگوں سے ٹکراتا، انہیں دھکیلتا اور معذرت کے الفاظ بولتا ہوا اس کے پیچھے لپکتا چلا گیا۔ اس نے زویا کو ایک اور دروازے میں گھستے دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ بھی اس دروازے میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ لیڈیز اور چلڈرن گارمنٹس کا ایک بڑا ڈسپلے تھا۔ چاروں طرف... ہینگرز پر لباس نظر آرہے تھے۔ وہ زویا کی تلاش میں اردگرد نگاہ دوڑانے لگا۔ اس ہال نما جگہ کا دوسرا دروازہ نظر نہیں آرہا تھا۔ شامیر کو تسلی ہوئی کہ اگر وہ نکلے گی تو اسی ایک دروازے سے نکلے گی۔ وہ ہال کے مختلف گوشوں میں اسے ڈھونڈنے لگا۔ سینے میں اس کا دل شدت سے دھڑ دھڑا رہا تھا۔ اس گارمنٹس اسٹور میں موجود لوگ ذرا تعجب سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یقیناً شامیر کی بیتابی اور عجلت دیکھ کر ان کے ذہنوں میں مختلف سوال اٹھ رہے ہوں گے۔

شامیر نے جونہی ایک کارنر میں ایک بڑے وارڈ روب کے پیچھے جھانکا، وہاں سے کوئی تیزی سے نکلا اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ یہ سرخ اسکرٹ ہی تھا مگر اب شامیر اس ''سرخ اسکرٹ'' کو مزید موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جھپٹ کر سرخ اسکرٹ والی زویا کو بازو سے پکڑ لیا۔

وہ ہیجانی انداز میں پکاری۔ ''چھوڑ دو مجھے...... چھوڑ دو...... ہیلپ...... ہیلپ۔''

اس نے خود کو چھڑانے کے لیے زور مارا۔ ''ہوش کرو زویا...... تماشا نہ بناؤ۔ میری بات سنو۔''

''میں تمہیں نہیں جانتی...... چھوڑ دو مجھے۔'' وہ پھر چلائی۔

اسٹور میں موجود لوگ ان کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ چند افراد کے تیور خطرناک تھے...... یکا یک زویا کو اندازہ ہوا کہ بات بڑھ جائے گی۔ اس کا رویّہ ایک دم بدلا ہوا نظر آیا۔ اس سے پہلے وہ شامیر کو پہچاننے سے ہی انکار کر رہی تھی مگر اب وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے جانے دو۔ میں تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی اور یہ کیا طریقہ ہے اس طرح سرِراہ مجھے زبردستی روکنے کا......''

''زویا! تم مجھے دیکھ کر گھبرا رہی ہو۔ تحمل سے کام لو۔ اس طرح تماشا بن جائے گا۔ ہم باہر جا کر آرام سے بات کرتے ہیں۔''

اس نے اب اپنی ہیجانی کیفیت سے نکلنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے دائیں بائیں دیکھا...... اور اپنے تاثرات سے اردگرد موجود لوگوں کو یہ باور کرایا کہ یہ ان دونوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ کھینچا تانی میں اس کا شولڈر بیگ پھسل کر فرش پر گر گیا تھا۔ شامیر نے بیگ اٹھا کر دوبارہ اس کے کندھے پر لٹکایا۔ شامیر نے محسوس کیا کہ وہ تھر تھر کانپ رہی ہے۔

قریباً پانچ منٹ بعد وہ دونوں اسی فیاٹ گاڑی میں بیٹھے تھے جو زویا کے فلیٹ کے قریب ہی ایک پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی۔ مارگریٹ بھی یقیناً گاڑی کے آس پاس ہی موجود تھی...... بہرحال اس نے اپنی موجودگی ظاہر کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔

زویا کی خوبصورت آنکھوں میں حیرت کا سمندر لہریں لے رہا تھا اور یہ حیرت آنسوؤں سے تر تھی۔ لباس اور حلیے کے اعتبار سے وہ کافی بدل چکی تھی۔ گلے میں اسکارف موجود تھا مگر اصل لباس تو اسکرٹ ہی تھا۔ بالوں کا کلر تبدیل تھا اور وہ پہلے سے کافی چھوٹے بھی نظر آ رہے تھے۔ کندھوں تک بھی نہیں پہنچ رہے تھے۔ یہی بال تھے جو کبھی اس کی کمر سے نیچے تک جاتے تھے اور جنہوں نے فرینکفرٹ میں کامرس بینک کی چھت پر دیوانہ وار جھوم کر ایک قاتل ادا سے شامیر کا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔

''تت...... تم یہاں کیسے شومیر؟ مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔'' وہ انگلش میں بولی۔

''بھروسا تو مجھے بھی نہیں ہو رہا کہ اتنے برسوں بعد تمہیں فرینکفرٹ سے اتنی دور اس چھوٹے سے قصبے کی اس گمنام اسٹریٹ میں دیکھ رہا ہوں۔''

اس نے ایک بار سرتاپا شامیر کو دیکھا پھر گلوگیر آواز میں بولی۔ ''شومیر! میں تم سے نہیں پوچھوں گی کہ تم یہاں کیسے پہنچے اور کیوں پہنچے؟ نہ ہی کوئی اور سوال کروں گی۔ بس اتنی بات کہوں گی کہ اگر تمہارے دل میں اب بھی میرے لیے کوئی تھوڑی بہت محبت ہے تو اس کے صدقے میری ایک بات مان لو۔ میں جہاں ہوں جیسی ہوں، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔''

شامیر نے ایک طویل آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ بھی دوں تو وہ حالات کیسے چھوڑیں گے جو تم اپنے پیچھے چھوڑ آئی ہو۔''

وہ اسکارف کے ایک کنارے سے اپنے آنسو پونچھ کر ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ''شومیر! مجھے سچ سچ بتانا، تمہارے علاوہ ابھی تک اور کس کو معلوم ہوا ہے کہ میں یہاں لیونا برگ میں ہوں؟''

''ابھی تک تو صرف مجھے معلوم ہے۔''

وہ گہری نظروں سے شامیر کو دیکھتی رہی جیسے اس کی بات کی سچائی پرکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ تب اچانک اس نے شامیر کی کلائی پکڑی اور اس کا داہنا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔ ''تمہیں میری قسم شومیر! میرے بارے میں کسی کو نہ بتانا...... تم سمجھ لو تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی...... تو میرے ساتھ...... کچھ بہت برا ہو جاتا ہے۔''

شامیر نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر سے ہٹایا اور روکھے لہجے میں بولا۔ ''اس قسم کی جذباتی بلیک میلنگ کے بغیر بھی تم جو بات کہو گی وہ میں مان لوں گا لیکن میرے علاوہ بھی کوئی ایسا ہے جس کے ساتھ تمہاری وجہ سے بہت زیادتی ہوئی ہے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں نا کہ حالات انسان کا تعاقب کرتے ہیں، وہ تمہارا بھی کریں گے۔''

اس سے پہلے کہ زویا جواب میں کچھ کہتی، اس

کے شولڈر بیگ میں سے موبائل فون کا میوزک سنائی دیا۔ چند سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے لرزاں ہاتھوں سے موبائل فون نکالا۔ شامیر کی تیز نگاہ نے اسکرین پر ابھرنے والے نام کو نوٹ کیا۔

''سویٹ ٹام۔''

دوسری طرف سے مردانہ آواز میں جو کچھ کہا گیا، وہ جرمن زبان میں کہا گیا تھا تاہم اس میں ''عینی'' کا نام شامیر نے صاف سنا۔ بولنے والا یقیناً زویا کا بوائے فرینڈ گٹارسٹ ٹام تھا۔

مختصر کال ختم کرنے کے بعد زویا نے اپنی رسٹ واچ دیکھی پھر شامیر کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''شومیر! مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے...... میری بچی اکیلی ہے۔''

''اوہو...... تو تمہاری شادی ہو چکی ہے؟'' وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔

اس نے ذرا چونک کر شامیر کو دیکھا، پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''تو...... تمہاری نہیں ہوئی؟''

''کیسے کرتا؟ کوئی کچھ بتا کر ہی نہیں گیا تھا...... سمجھو کہ، انتظار کی پتھریلی زمین پر تیز دھوپ میں ننگے پاؤں کھڑا کر گیا تھا...... پھر شاید بھول ہی گیا کہ مڑ کر دیکھنا بھی ہے۔''

زویا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ دھیمی آواز میں گویا ہوئی۔ ''اب ان باتوں کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں شومیر! وقت بہت آگے نکل گیا ہے۔''

''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔'' شامیر نے زویا کے بالوں اور باقی سراپا پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

سرد موسم کے باوجود زویا کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا تھا۔ اس نے دوبارہ رسٹ واچ دیکھی۔ ''میں اب زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔ میری بچی اکیلی ہے...... اگر تم مجھے بغیر کچھ کہے سنے معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر کوئی اور ٹائم رکھ لو۔ ہم ایک ملاقات کرلیں گے۔ کسی بھی پبلک جگہ پر ایک آدھ گھنٹے کی ملاقات۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''میں تمہارے اس وعدے پر کیسے یقین کرلوں زویا؟ تم نے رابطہ موجود ہونے کے باوجود مجھ سے چار برس تک بات نہ کی۔ شاید دس، بیس یا تیس برس مزید بھی اسی طرح گزر جاتے اگر آج میں تمہیں یہاں نہ پالیتا۔''

''نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ میں ایک بار تم سے بات ضرور کروں گی۔'' اس نے بے چینی سے انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

شامیر جلتے لہجے میں بولا۔ ''لگتا ہے کہ بچی کے لیے بہت بے چین ہو رہی ہو تم...... لیکن زویا...... یہ صرف تمہاری بچی ہی تو نہیں ہوگی، کوئی اور بھی تو ہوگا جو اس بچی کے لیے دن رات تڑپ رہا ہوگا۔''

وہ ایک بار پھر ٹھٹکی۔ ''تو تم مجھے ٹریس کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو؟''

''ٹریس کرنا تو میرا پروفیشن ہے اور ایک بار تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ کسی وقت تم بھی کہیں گم ہو سکتی ہو اور مجھے...... تم کو ڈھونڈنا پڑ سکتا ہے۔''

''تت...... تمہیں رابرٹ نے یہاں بھیجا ہے؟''

''نہیں، اسے کچھ پتا نہیں کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ وہ خود بھی اس وقت پیڈربورن میں ہے۔''

زویا کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس نے شامیر کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ ''شومیر! اسے میری بھنک بھی نہ پڑنے دینا...... میرا بہت کچھ برباد ہو جائے گا۔ میں جب تم سے ملوں گی تو تفصیل سے سب کچھ بتاؤں گی۔'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''پتا نہیں، تم تفصیل سے بتاؤ گی یا تفصیل سے چھپاؤ گی...... ابھی تک تو یہی لگا ہے کہ تم میرے سائے سے بھی دور رہنا چاہتی ہو۔ پرسوں بھی تو یہی کچھ ہوا ہے۔''

''کک...... کیا مطلب؟''

''دیکھو زویا! سچ بولنے کا کہہ رہی ہو تو اب جھوٹ نہ بولنا...... تمہیں پرسوں سے ہی معلوم تھا نا کہ میں یہاں لیونا برگ میں آیا ہوا ہوں۔ تمہاری دوست حامدہ رضوان نے تمہیں سب کچھ بتادیا تھا نا؟''

اس کی پلکیں بے ساختہ لرزیں اور وہ شامیر سے نظریں ہٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ یہ ایک طرح سے اس کا اعتراف تھا۔ شامیر نے سانس کو ایک آہ کی طرح اندر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''اچھا چھوڑو...... دفع کرو...... یہ بتاؤ کب ہوگی ہماری ملاقات؟''

''کل تو نہیں...... پرسوں...... میں تمہیں فون کروں گی...... یا پھر واٹس ایپ...... تمہارا نمبر؟''

''نمبر وہی ہے جو یہاں چار سال پہلے تھا۔'' شامیر نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

وہ کوئی الوداعی کلمہ کہے بغیر تیزی سے باہر نکلی اور لڑکھڑاتی ہوئی سی چیری کے درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔

☆☆☆

شامیر کا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ بے شمار سوالات ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ زویا واقعی بہت بدل چکی تھی۔ بے شک پہلے کی طرح دلکش تھی۔ اسی طرح نگاہوں کے رستے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر رہی تھی مگر بہت کچھ تبدیل بھی ہو چکا تھا اس کے اندر۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے تسلیم کیا تھا کہ وہ دو دن پہلے اس بات سے آگاہ تھی کہ شامیر یہاں لیونا برگ آیا ہوا ہے اور یہ بات اسے یقیناً حامدہ نے ہی بتائی تھی۔ پرسوں رات شامیر سے تفصیلی بات کرنے سے پہلے حامدہ نے یقیناً زویا سے رابطہ کیا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ پرسوں رات حامدہ نے زویا کے بارے میں جتنی بھی منفی باتیں بتائیں، وہ زویا کے مشورے سے ہی بتائیں۔ دوسرے لفظوں میں زویا، شامیر کو اپنی طرف سے بدظن کرنا بھی چاہتی تھی؟

اپنی سوچوں میں گم شامیر فیاٹ گاڑی کو پارکنگ سے نکال کر کچھ آگے لے گیا۔ اسے معلوم تھا کہ مارگریٹ کہیں آس پاس ہی موجود ہوگی اور اپنی گاڑی کو بھی دیکھ رہی ہوگی۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ ایک جگہ رکا تو مارگریٹ بھی وہاں پہنچ گئی اور جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''ملاقات ہوگئی جی؟'' اس نے شامیر سے پوچھا۔

''ہاں...... لیکن فی الحال کوئی خاص بات نہیں ہوسکی۔ تفصیلی ملاقات کے لیے پرسوں کا وقت طے پایا ہے۔''

''یعنی اب ہم پرسوں یہاں آئیں گے؟''

شامیر کچھ دیر سوچ کر بولا۔ ''نہیں مارگریٹ! میں چاہتا ہوں کہ تم یہیں کہیں آس پاس موجود رہو۔''

وہ شامیر کو دیکھ کر کہنے لگی۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کو اندیشہ ہے، مس زویا پھر کہیں اوجھل نہ ہو جائے؟''

''ہاں مارگریٹ! اس امکان کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جاسکتا۔''

وہ چند لمحے توقف کرکے بولی۔ ''اوکے۔ یہ میرے لیے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا...... میں نے یونہی معلومات کے لیے سامنے والے گیسٹ ہاؤس میں روم کا پتا کیا تھا۔ روم دستیاب ہیں۔ کرایہ بھی مناسب ہے۔ میں کل کا دن یہاں رک کر بڑے اچھے طریقے سے مس زویا کا خیال رکھ سکتی ہوں۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' شامیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

نہ جانے کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس پر کچھ اہم انکشافات ہونے والے ہیں۔ اب پرسوں تک کا وقت گزارنا اس کے لیے خاصا دشوار تھا۔

☆☆☆

لیونا برگ کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ شامیر قدیم طرز کے خوبصورت گھروں کے درمیان ایک تنگ سڑک سے گزرتا ہوا اس مقام کی طرف جارہا تھا جہاں آج زویا سے اس کی ملاقات ہونا تھی۔ شامیر نے لیونا برگ کے اس تاریخی قصبے کے بارے میں کافی کچھ سن رکھا تھا۔ آج اس کو پوری ''وضاحت'' سے دیکھنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔ ٹیکنی کلر گھر خوشنما کھلونوں کی طرح تھے۔ ان میں سے اکثر ڈیڑھ دوسو سال تک پرانے تھے۔ کئی گھروں کی پیشانی پر ان کی ''تاریخ تعمیر'' بھی لکھی ہوئی تھی۔ مارگریٹ نے شامیر کو بتایا تھا کہ یہ یہاں کی روایت پسندی کی نشانیاں ہیں۔ ان گھروں میں زیادہ تر بڑی عمر کے لوگ ہی رہتے ہیں۔ قدامت پسند لوگ جو اپنی یادوں سے جڑے رہنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ لیونا برگ کے کمیونٹی ہال اور بڑے گرجا گھر کے سامنے سے گزر کر شامیر دریا کی جانب بڑھنے لگا۔ گرجا دیکھ کر اسے پادری جوناتھن یاد آ گئے۔ زویا کی فیملی ان کی عقیدت مند تھی۔ فرینکفرٹ میں ہونے والی ملاقات میں اجلے چہرے والے پادری جوناتھن نے اسے بتایا تھا کہ وہ لیونا برگ کے مرکزی گرجے میں فرائض انجام دیتے ہیں۔ کیا وہ اب بھی یہیں کہیں تھے؟ وہ ان کے بارے میں سوچتے سوچتے

''ایلم ناؤ'' دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ یہ خوبصورت دریا قصبے کی گنجان آبادی کے بیچوں بیچ سے گزرتا تھا۔ یہاں ایک تہوار کا سا سماں تھا۔ شامیر کو یوں لگا جیسے پُرسکون قصبے لیونابرگ کی ساری رونق اور خرمستی یہیں دریا کے آس پاس سمٹ آئی ہے۔ ہر عمر کے خوش باش جوڑے، کھلے عام ایک دوسرے کو اپنی محبت کا یقین دلا رہے تھے۔ جام گردش کر رہے تھے اور موسیقی کی دھنا دھن فضا میں ارتعاش پیدا کرتی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید شامیر ان مناظر سے لطف اٹھاتا مگر اس کے اندر تو ایک طوفان بپا تھا۔ چار سال کی گھٹن اب اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ بے شمار سوالات ذہن میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ دریائے ایلم ناؤ کے اندر بھی بہت سے تفریحی بجرے تیر رہے تھے۔ اس کے علاوہ پانی کے اوپر بنے ہوئے ریسٹورنٹ بھی تھے۔ ایسے ہی ایک ریسٹورنٹ ''فل مون'' میں زویا سے اس کی ملاقات طے تھی۔ ریسٹورنٹ کا نام شامیر کو دور ہی سے جگمگاتا نظر آ گیا۔ وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوا اور ڈائننگ ہال میں دائیں گوشے کی ایک میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ قریب ہی ایک طویل میز پر سیاحوں کی ایک ٹولی بیٹھی تھی۔ کھانے کے انتظار میں گائڈ ان سیاحوں کو لیونابرگ کے بارے میں مختلف باتیں بتا رہا تھا۔

اس نے کہا۔ ''دوسری جنگِ عظیم میں جب اتحادی فوج اور فضائیہ جرمنی پر شدید ترین بمباری کر رہی تھیں، قریبی شہر ہیمبرگ کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ شہر کا بڑا حصہ برباد ہو گیا۔ تاہم صرف 45 کلومیٹر کے فاصلے پر موجود رنگوں اور خوشبوؤں کا یہ قصبہ لیونابرگ بالکل محفوظ رہا...... جنگ جیسے اسے چھوئے بغیر گزر گئی تھی......''

گائڈ کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولتا رہا۔ شامیر اٹھ کر کھڑکیوں کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ اس کی نگاہ بار بار گھڑی کی طرف اٹھ جاتی تھی۔

وہ آئے گی؟ نہیں آئے گی؟...... وہ آئے گی؟ نہیں آئے گی؟ یہ سوال اس کی دھڑکنوں کو زیر و زبر کر رہا تھا۔ چار سال پہلے یہ دھڑکنیں اسی طرح زیر و زبر ہوئی تھیں جب بہ وقتِ روانگی اس نے فرینکفرٹ کے ائرپورٹ پر اس کی راہ دیکھی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد اس نے رسٹ واچ دیکھی اور اسے کال کرنے کے لیے اپنا ہاتھ موبائل فون کی طرف بڑھایا۔ یہی وقت تھا جب وہ نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔ آج وہ مشرقی لباس قمیص اور ٹراؤزر میں تھی۔ ایک گلابی اسکرول بھی اس کے کندھوں کو ڈھانپ رہی تھی۔ شامیر اٹھ کھڑا ہوا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

گزرنے والے وقت نے اس کے خدوخال اور جسمانی ساخت پر بہت تھوڑا اثر ڈالا تھا۔ بال چھوٹے ہو گئے تھے مگر اسی طرح گھنے تھے۔ صراحی دار گردن وہی تھی اور وہ گولڈن چین بھی وہی، جسے دیکھ کر شامیر نے ایک مرتبہ کہا تھا...... ''یہ چین خوش قسمت ہے جو تمہارے اس قدر نزدیک ہے......'' اور اس گردن سے اوپر اس کی ٹھوڑی اور ٹھوڑی سے اوپر چمکیلے رخسار جن کی ہڈیاں تھوڑی سی ابھری نظر آتی تھیں...... اور ایک رخسار پر وہ دلکش گڑھا جس نے اپنی اتھاہ گہرائیوں میں شامیر کو ہمیشہ کے لیے جذب کر لیا تھا۔ وہ شاید آج بھی اس گڑھے کو چھونے کی حسرت دل میں رکھتا تھا۔ لیکن نہیں...... اب بہت کچھ بدل چکا تھا...... اور شامیر یہی جاننے کے لیے یہاں موجود تھا کہ کیا کچھ بدل چکا ہے۔

سب سے پہلے شامیر نے زویا سے اس کے والد کی وفات پر تعزیت کی۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

''تمہاری بچی کہاں ہے؟'' شامیر نے پوچھا۔

''ٹام کے پاس۔ میں اسے سلا آئی ہوں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''ٹام کو پتا ہے کہ تم کہاں ہو؟''

''ہاں پتا ہے۔''

اس سے پہلے کہ شامیر کچھ اور کہتا، وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''آج میں تم کو جو کچھ بتاؤں گی، سچ بتاؤں گی۔ چاہے اس سچ کو بتانے میں مجھے اور سننے میں تمہیں کتنی بھی تکلیف ہو۔''

''یہی بات مناسب ہے۔'' شامیر نے جواب دیا۔

''لیکن اس سے پہلے...... کیا تم مجھے یہ بتانا پسند کرو گے کہ تم مجھ تک کیسے پہنچے؟''

''تمہاری سینئر دوست مسز حامدہ کی مدد سے۔''

''مگر انہوں نے تو تمہیں نہیں بتایا؟''
''تم شاید بھول رہی ہو میرا اور تمہارا تعلق ایسے پیشے سے ہے جہاں کسی کے کچھ بتائے بغیر بھی کافی کچھ سمجھ لیا جاتا ہے۔''
''پھر بھی؟''
شامیر۔ نے زویا کی اجازت سے سگریٹ سلگایا اور پھر وہ ''کلیہ'' بتادیا جس کے سبب اسے حامدہ پر شک ہوا اور اسی شک کے نتیجے میں زویا کا سراغ لگ گیا۔
پوری بات سن کر وہ بے ساختہ اپنی کہنی کے اس مدھم نشان کو دیکھنے لگی جو چار سال پہلے کے واقعے کا نتیجہ تھا۔
اسی دوران میں کھانا آ گیا۔ لذیذ کھانا تھا...... مگر شاید دونوں نے ہی بے دلی سے کھایا اور بات صرف کھانے کی ہی نہیں تھی، وہ دونوں جیسے اردگرد کے ماحول سے ہی کٹے ہوئے تھے۔ کھانے کے دوران میں زویا نے شامیر سے اموخالہ اور فارہ وغیرہ کے بارے میں پوچھا اور اس طرح کے دیگر چھوٹے موٹے سوالات کیے۔
آخر کھانا ختم ہوا...... شامیر نے نیا سگریٹ سلگا لیا تھا۔ زویا نے سوفٹ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔ ''شومیر! تم ''ڈبل پرسنیلٹی'' کے بارے میں جانتے ہو؟''
اس اچانک سوال نے شامیر کو چونکایا۔ ''ڈبل پرسنیلٹی؟ یعنی دورخی شخصیت...... لیکن...... یہ بات تم کیوں کر رہی ہو؟''
''جو میں تمہیں بتانے جا رہی ہوں...... اس میں یہی بات مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ میں تمہیں ایک ایسے بندے کے بارے میں بتانے جا رہی ہوں جو مکمل طور پر دو شخصیات میں بٹا ہوا ہے...... وہ بہت اعلیٰ جرمن خاندان سے تعلق رکھتا ہے، پڑھا لکھا ہے...... نفیس ہے۔ اپنے حلقۂ ارباب میں اس کی عزت ہے، مگر اس کی شخصیت کا ایک دوسرا رخ ہے جو بالکل مختلف ہے۔''
شامیر گہری نظروں سے زویا کو دیکھ رہا تھا۔ ''کہیں تم اپنے شوہر کے بارے میں تو بات نہیں کر رہی ہو؟''
''اسی کے بارے میں کر رہی ہوں۔'' وہ عجیب دکھی اور گمبھیر انداز میں بولی۔
کچھ دیر تک دونوں کے درمیان ایک سنسناتی ہوئی خاموشی حائل رہی پھر اس نے نشست پر پہلو بدلا۔ ''شومیر! میں نے تم سے وعدہ کیا ہے، اس ملاقات میں تم سے جو کہوں گی سچ کہوں گی...... جس شخص کو تم میرا شوہر کہہ رہے ہو اس کے دو روپ ہیں۔ ایک روپ میں وہ ہمدرد ہے، محبت کرنے والا ہے، اپنے اندر خدا خوفی رکھتا ہے مگر دوسرے روپ میں وہ انتہائی بدنما ہے، پرلے درجے کا شکی مزاج ہے، بے حد سنگدل ہے...... بلکہ خطرناک ہے۔ میں نے اس کا ساتھ نبھانے کی، اس کے ساتھ رہنے کی بہت کوشش کی، مگر ناکام ہو گئی۔''
گفتگو میں ذرا سا وقفہ آیا تو شامیر بولا۔ ''زویا! میں رابرٹ سے مل چکا ہوں۔ اس سے بات چیت کر چکا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری بات مجھے حیرت زدہ کر رہی ہے۔''
''تمہاری بات تو دور کی ہے شومیر...... میرے اپنے بھی حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ وہ میری باتوں پر یقین نہیں کر پاتے۔ خاص طور سے ماما تو اسے عام نوعیت کے ازدواجی اختلافات قرار دیتی ہیں۔''
''اپنی بچی کے ساتھ رابرٹ کا رویہ کیسا ہے؟''
''بہت اچھا...... بلکہ غیر معمولی طور پر اچھا لیکن یہاں بھی وہی دہرا روپ آ جاتا ہے۔ جب وہ دوسرے روپ میں ہوتا ہے تو بچی کو بھی کوستا ہے۔ اسے اٹھا کر پٹخ دیتا ہے۔ اس کے حوالے سے گھناؤنے شکوک ظاہر کرتا ہے۔''
''ایسا کیوں ہے...... کیونکر ہوا ہے؟''
زویا نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ دریا میں بے شمار روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں۔ پانی اور پانی سے باہر رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ مگر ریسٹورنٹ کے اس گوشے میں نیم تاریکی اور کسی حد تک خاموشی تھی۔ خوشیوں کے سمندر میں یہ جیسے ایک علیحدہ ہی چھوٹا سا اداس جزیرہ تھا۔
زویا نے کہا۔ ''ماما جرمنی کے چند اعلیٰ نسب خاندانوں کے راگ الاپتی رہتی ہیں...... رابرٹ کی یہ ہلڈ براند فیملی بھی تو ان ہی میں سے ایک ہے۔ رابرٹ

کی ماں کا شادی کے بعد ایک جرمن شخص سے ہی افیئر چلا تھا۔ وہ چھ سالہ رابرٹ اور اس کی چھوٹی دودھ پیتی بہن کو چھوڑ کر اس فوٹو گرافر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ یہی واقعہ ہے شومیر! جو اس شخص کی جڑوں کو زہریلا کر چکا ہے۔ وہ انتہا درجے کا شکی اور بدگمان ہو چکا ہے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی۔ اس نے پیڈر بورن والے اس گھر میں جگہ جگہ خفیہ کیمرے نصب کرا رکھے ہیں۔ یہ کیمرے کسی اور کے لیے نہیں، میرے لیے تھے۔ گھر کے واش روم تک ان کیمروں سے محفوظ نہیں تھے۔''

شامیر کو یاد آیا کہ اس گھر میں ایک دو جگہ اس کی نظریں خفیہ کیمرے کے لینس پر پڑی تھیں۔

زویا اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھی۔ ''اس شخص کو ہمہ وقت شبہ رہتا تھا کہ میرے کسی سے ناجائز تعلقات ہیں۔ کسی معمولی سے شک پر وہ مجھے غلیظ گالیاں دیتا تھا...... بری طرح پیٹ ڈالتا تھا...... جسمانی تکلیف پہنچاتا تھا...... لیکن صبح سویرے اس کا دوسرا روپ سامنے آتا تھا۔ وہ روتا تھا، مجھ سے معافیاں مانگتا تھا۔ ایک دو بار اس نے میرے پاؤں پر سر تک رکھ دیا۔ وہ وعدہ کرتا تھا کہ آئندہ مجھ سے ایسا برتاؤ نہیں کرے گا مگر چند روز بعد پھر وہی میں ہوتی تھی اور وہی اس کا اذیت ناک شک۔ وہ مجھ سے ملنے جلنے والے ہر ''میل'' پر شک کرتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے باس جن کی عمر اسّی سال کے قریب ہے اور میرا ایک کزن جو صرف پندرہ سولہ سال کا ہے...... وہ بھی اس کے شک سے محفوظ نہیں تھے۔''

زویا کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ اس نے آنسو ٹشو پیپر سے صاف کیے اور کہا۔ ''کبھی کبھی مجھے اس کی حالت پر ترس بھی آتا تھا مگر دھیرے دھیرے اس کی زیادتیاں بڑھتی گئیں اور میرا ترس کم ہوتا گیا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ اسے پیڈر بورن کے ایک نامور سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر جاؤں۔ وہ ایک بار گیا بھی لیکن تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا، وہ اسی سائیکاٹرسٹ پر شک کرنا شروع ہوگیا۔ ایک رات اس نے مجھ پر الزام لگا دیا کہ میں اس سائیکاٹرسٹ سے جسمانی تعلق بنا چکی ہوں

اور اس کے گھر کی انیکسی میں جا کر اس سے ملتی ہوں۔ اس نے مجھے مارا۔ قینچی سے میرے بال کاٹ ڈالے......
یہ...... یہ میرے بال دیکھ رہے ہو نا تم۔ یہ کتنے لمبے ہوا کرتے تھے؟ اب ان کا اتنا چھوٹا ہونا کسی فیشن کا نتیجہ نہیں ہے، یہ اسی جانور کے ظلم کی زد میں آئے۔''
شامیر حیرت کے ریلے میں تھا۔ خود کو ذرا سنبھال کر بولا۔ ''تمہارے یہ نئی طرز کے بال دیکھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی تھی لیکن...... زویا...... رابرٹ کے گھر میں، میں نے تمہاری کچھ تصویریں بھی دیکھی ہیں، ان میں تم مقامی طرز کے نیم عریاں لباس میں نظر آرہی ہو اور خوش بھی دکھائی دے رہی ہو؟''
''یہ سب بھی اس کی خوشنودی کے لیے تھا۔ میں نے کہا ہے نا کہ وہ جب اچھے روپ میں ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ اس سے زیادہ محبت کرنے والا اور ہمدرد شوہر شاید پورے جرمنی میں نہ ہو۔ اسے میرا احجاب کرنا پسند نہیں تھا۔ میرا اسکارف لینا پسند نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں گھر میں مقامی طرز کے بولڈ لباس میں نظر آؤں...... خود کو سنوار کر رکھوں۔ میں نے وہ سب کچھ کیا جو وہ چاہتا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس کا دوسرا روپ اس سے دور ہو جائے لیکن وہ نہیں ہوا۔ وہ شاید ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ علاج معالجے کی حدوں سے گزر چکا ہے شومیر!''
''جب تم نے گھر چھوڑا تو کوئی خاص واقعہ ہوا؟'' شامیر نے پوچھا۔
''خاص واقعہ تو وہاں ہر روز ہی ہوتا تھا۔ آخری دنوں میں اس خبیث نے برملا یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ عینی بھی شاید اس کی بچی نہیں ہے۔ وہ اسے میرے پرانے دوست میوزیشن ٹام سے منسوب کرنے لگا تھا۔ ایک رات اس نے روتی ہوئی بچی کو بستر سے اٹھا کر بے بی کارٹ میں پٹخ دیا۔ اس معصوم کی ناک سے خون بہنے لگا۔ صبح وہ اسے گود میں لے کر پھرتا رہا اور روتا رہا۔ میرے ساتھ ساتھ بچی سے بھی معافی مانگتا رہا، مگر چند روز بعد اس سے بھی بدتر کیفیت میں ہمارے سامنے آ گیا۔''
زویا کی آنکھوں میں پھر نمی آگئی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ تب اس نے اپنے شولڈر بیگ کی زپ کھولی اور اس میں سے موبائل فون نکالا۔ ہینڈ فری بھی اس کے ساتھ اٹیچ تھا۔ اس نے موبائل کے وائس ریکارڈر پر جا کر موبائل شامیر کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ''اس شخص کی جنونی کیفیت کے میرے پاس کئی ثبوت ہیں۔ ان میں سے ایک چھوٹا سا ثبوت تم خود سنو اور اس شخص کی حالت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرو۔''
شامیر نے ایئر فون کان میں لگایا۔ زویا نے ریکارڈنگ پلے کی۔ شامیر کی سماعت میں ایک طوفان سا بپا ہو گیا۔ کسی کمرے میں اٹھا پٹخ ہو رہی تھی اور چنگھاڑیں گونج رہی تھیں۔ رابرٹ کی آواز شامیر نے پہچانی...... وہ دہاڑ رہا تھا۔ جو فقرے شامیر کی سمجھ میں آئے وہ کچھ اس طرح تھے۔ ''بکواس کرتی ہو تم۔ ازل کی جھوٹی ہو۔ جھوٹے اور مکار خاندان سے تعلق رکھتی ہو...... تمہارے خون میں ملاوٹ ہے۔ تمہاری ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔ یو باسٹرڈ...... یو ڈرٹی کریچر......''
زویا کی گھگیائی ہوئی آواز ابھری۔ ''رابرٹ! تم ہوش میں نہیں ہو...... خدا کے لیے...... ایسی بے ہودہ بات مت کرو۔''
رابرٹ کی چنگھاڑ پھر سنائی دی۔ ''اگر سچی ہو تو رکھو، اس مقدس کتاب پر ہاتھ...... رکھو ہاتھ اور کہو کہ یہ میری اور تمہاری بچی ہے...... یہ ہم دونوں کی بچی ہے۔''
اس کے ساتھ ہی ایک طمانچے کی آواز ابھری۔ زویا کی کراہ سنائی دی۔ کوئی چیز گر کر ٹوٹی۔ زویا روتے روتے بلند آواز میں بولنے لگی۔ رابرٹ اس سے بھی بلند آواز میں چلانے لگا۔ بچی بھی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ ایک شور قیامت بپا تھا۔ الفاظ اور فقرے سمجھ میں نہیں آرہے تھے، پھر ریکارڈنگ ختم ہو گئی۔
شامیر نے ہینڈ فری اتار دیا۔ وہ حیرت زدہ تھا۔ اس نے رابرٹ کی آواز صاف پہچانی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنا دھیما، اتنا مہذب اور شائستہ نظر آنے والا شخص ایسے خوفناک لہجے میں بات کر سکتا ہے۔
یہ تھا ہلڈ برانڈ جیسے اعلیٰ جرمن خاندان کا ارفع نسل والا سپوت...... زویا کی ماما کو فخر تھا اپنے جرمن ہونے پر۔ وہ اس بات پر بھی شاد تھی کہ اس کی دو

بیٹیاں جرمن شوہروں کے ساتھ آسودہ زندگی گزار رہی ہیں، اس نے تیسری کے لیے بھی جرمن شوہر ہی ڈھونڈا تھا...... اور اس تیسرے نے اس کے سارے آدرش غلط ثابت کر دیے تھے۔ اچھے برے طبقے اور اچھے برے لوگ کس قوم میں موجود نہیں ہوتے۔

ایک توقف کے بعد شامیر نے زویا سے پوچھا۔ ''کیا یہ ریکارڈنگ تم نے اپنی ماما کو سنائی؟''

''بہت سی باتیں میں نے انہیں بتائیں اور بہت سی چھپا بھی لیں۔ مم...... میں اس معاملے کو حد سے زیادہ بھڑکانا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اپنی اور بچی کی جان کی طرف سے بھی خطرہ لاحق ہو جاتا تھا اور جہاں تک ماما کی بات ہے' انہوں نے تو جیسے مستقل طور پر اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ ان کا تعصب آج بھی یہی ہے کہ چونکہ اپنی دیگر بہنوں کے برعکس میں اپنے باپ کے مذہب سے ہی جڑی رہی ہوں اس لیے میری سوچ اور میرے عمل میں زبردست کھوٹ پیدا ہو چکا ہے۔ وہ میری تباہ حال ازدواجی زندگی کی زیادہ تر ذمے داری بھی مجھ پر ہی ڈالتی ہیں۔''

''اور دونوں بہنیں؟''

''حولیہ بھی ایسی ہی ہے۔ بڑی بہن ایمہ کسی وقت میری طرفداری کرتی تھی مگر اس کا جرمن شوہر کیونکہ خود بھی زبردست قسم کا نسل پرست ہے لہٰذا وہ کھل کر میری حمایت نہیں کر سکتی تھی اور......''

بات کرتے کرتے زویا ایک دم رک گئی۔ اس نے ذرا چونک کر شامیر کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''شومیر! کیا تم یہاں آ کر ماما یا حولیہ سے ملے ہو؟''

''ہاں ملا تھا۔'' شامیر نے چند لمحے کے توقف کے بعد جواب دیا۔ ''وہ لوگ بھی تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکے ہیں۔ تمہاری والدہ خاص طور سے پریشان ہیں۔''

زویا نے ایک آہ بھری۔ ''شومیر! اگر تم ماما اور حولیہ سے مل چکے ہو تو پھر تمہیں دیگر حالات بھی معلوم ہو گئے ہوں گے۔ یہ بھی پتا چل گیا ہوگا کہ میری شادی کیوں اور کن حالات میں ہوئی۔''

''نہیں، حولیہ نے زیادہ کچھ تو نہیں بتایا۔'' شامیر انجان بنتے ہوئے بولا۔ ''بس اس نے کسی ڈکیتی کا ذکر کیا تھا جس کے بعد تم لوگوں کی مالی حالت بری ہو گئی۔''

''اس واقعے نے ہمیں تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ماما مزاحمت کرتے ہوئے سخت زخمی ہو گئی تھیں۔ بعد میں ان کے زخم بگڑ گئے۔ ہم میونخ سے شفٹ ہو کر 'ایسن' میں چلے گئے۔ وہاں بھی ان کی زندگی بچانے کی کوششیں جاری رہیں۔ ماما کا ایک پاؤں کاٹ دیا گیا...... ٹانگوں کے سات آٹھ آپریشن ہوئے۔ اس موقعے پر رابرٹ بڑھ چڑھ کر ماما کا ساتھ دیتا رہا۔ ہم اس کے احسانوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے۔ یہی وقت تھا جب میں نے اپنے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور ماما کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے رابرٹ کو شوہر کے طور پر قبول کر لیا...... بعدازاں میرا یہ فیصلہ ایک بڑی غلطی ثابت ہوا جس کی سزا میں اب تک بھگت رہی ہوں۔'' شامیر مسلسل گہری نظروں سے زویا کو گھور رہا تھا۔ اسے کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی کہ وہ زویا کی باتوں پر یقین نہ کرے۔

زویا نے اپنی اس روداد میں کہیں بھی نمرسی کا نام نہیں لیا...... نہ ہی اس لرزہ خیز حقیقت کا ذکر کیا جو نمرسی کی منتقم المزاجی کا بین ثبوت تھی۔ وہ بہن کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی بات چھپا گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی ماما نشے اور طیش میں چُور ہو کر نیم دیوانگی کے عالم میں شامیر کے سامنے سب کچھ اگل چکی ہیں......

اس کا مطلب تھا کہ زویا اور اس کے اہلِ خانہ اب ماضی کے اس ورق کو پلٹنا ہی نہیں چاہتے اور شاید یہ سب ایک لحاظ سے ٹھیک ہی تھا مگر بعد میں جو کچھ ہوا تھا، وہ تو ماضی نہیں تھا...... اور وہ سب کچھ اپنی تمام تر سنگینی کے ساتھ زویا کے اردگرد موجود تھا۔ بقول زویا کے وہ ایک ایسے شوہر کے ہتھے چڑھ گئی تھی جو خطرناک قسم کی دہری شخصیت کا مالک تھا اور اس کی زندگی برباد کر رہا تھا۔

لیکن کچھ سوال ایسے تھے جو اب بھی زویا کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور ان کے جواب زویا ہی دے سکتی تھی۔

شامیر نے پوچھا۔ ''تم نے کہا ہے کہ آج مجھے جو

کچھ بتاؤ گی سچ بتاؤ گی تو پھر ایک سچ ٹام کے بارے میں بھی بتا دو۔ تم اس کے ساتھ کس حیثیت میں یہاں موجود ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ حامدہ نے تمہیں اس بارے میں بتا دیا ہوگا۔''

''لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ انہوں نے تمہارے بارے میں جو کچھ بھی بتایا، وہ درست نہیں تھا...... یا پورا درست نہیں تھا۔''

''یعنی تم اب بھی میرے اندر اچھائی کی تھوڑی بہت جھلک دیکھ رہے ہو؟''

''دیکھنی تو نہیں چاہیے کیونکہ ٹام کے سلسلے میں جو کچھ سامنے آیا ہے، وہ بہت زیادہ دل دکھانے والا ہے۔ رابرٹ کا تو یہ بھی خیال ہے کہ چند روز پہلے تم نے یا ٹام نے اپنے کسی ہمدرد کی مدد سے اس کے گھر میں غیر قانونی دخل اندازی کی۔ تم نے اپنے اور بچی عینی کے شناختی کاغذات اس کے گھر سے نکلوائے۔''

زویا کے چہرے پر حیرت آمیز پریشانی نظر آئی۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ شامیر اس کے موجودہ حالات کے بارے میں اتنی گہرائی سے جانتا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے شامیر سے پوچھا کہ وہ اس طرح کی بات کیونکر کہہ رہا ہے؟ شامیر نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو کچھ روز پہلے اس نے رابرٹ کے گھر میں دیکھا اور جھیلا تھا۔

پوری تفصیل سننے کے بعد زویا نے غیر متوقع طور پر اعتراف کرلیا کہ ٹام نے اپنے ایک ہمراز دوست بش ہوپ کی مدد سے یہ کاغذات اور پاسپورٹ وغیرہ حاصل کیا ہے۔ ٹام کا خیال تھا کہ یہ کام آسانی سے ہو جائے گا مگر اس خرانٹ رابرٹ نے اس کام کو قریباً قریباً ایک واردات میں بدل دیا۔ زویا اس انکشاف پر بھی حیرت زدہ نظر آ رہی تھی کہ اس واقعے میں رابرٹ کے گھر آئے ہوئے جس مہمان نے بش کی مزاحمت کی، وہ کوئی اور نہیں خود شامیر تھا۔

انکشاف انگیز گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ اس آبی ریسٹورنٹ سے باہر ہنگامہ ہائے ہاؤ اپنے عروج پر تھا۔

فلک شگاف موسیقی کی مدھم لہریں اس ریسٹورنٹ کے اندر تک پہنچ رہی تھیں۔ ''محبت'' میں سرشار جوڑے سڑکوں اور گھاس کے قطعوں پر لڑھکے نظر آتے تھے۔ شامیر نے ان مخمور مناظر سے نگاہیں چراتے ہوئے زویا کی طرف دیکھا۔ اس کا سوال ابھی اپنی جگہ موجود تھا، اس سے پہلے کہ وہ پھر زویا سے پوچھتا کہ وہ یہاں کس حیثیت سے ٹام کے ساتھ موجود ہے کہ اس نسبتاً پُرسکون ریسٹورنٹ میں بھی شور برپا ہو گیا۔ بدمست سیاحوں کی ایک ٹولی اندر آ گئی۔ یہ بھی جرمنی کے ہی کسی علاقے کے لگتے تھے۔ چند ایک کی بڑی بڑی ڈاڑھیاں اور لمبے بال تھے۔ ان میں دو تین عورتیں بھی نظر آتی تھیں۔ غالباً کسی مقامی تہوار یا رواج کی نسبت سے انہوں نے لکڑی کے پھل والے مصنوعی کلہاڑے اور دو تین لالٹینیں بھی تھام رکھی تھیں۔ کچھ افراد موسیقی کے آلات کے ساتھ مصروفِ کار تھے۔ ان کے شور نے دیگر لوگوں کی طرح شامیر اور زویا کو بھی ڈسٹرب کر دیا۔ انتظامیہ نے چاہا کہ یہ پُرشور ٹولی یہاں سے چلی جائے مگر وہ کسی نہ کسی طرح ایک بڑی میز پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گئے۔

زویا نے اشارے سے ہیڈ ویٹر کو پاس بلایا اور کہا کہ ان لوگوں کا شور بند کرایا جائے۔

ویٹر نے لجاجت سے کہا۔ ''میڈم! یہ زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔ کسی تقریب کا کیک کاٹ کر ابھی یہاں سے چلے جائیں گے۔''

زویا منہ بنا کر رہ گئی۔ اتنے شور میں گفتگو کرنا آسان نہیں تھا۔ کئی دوسرے لوگوں کی طرح وہ دونوں بھی خاموشی سے گرین ٹی کی چسکیاں لینے لگے...... وہ دونوں جانتے نہیں تھے کہ اس نئی وارد ہونے والی ٹولی میں لمبے بالوں والا ایک ایسا شخص بھی ہے جو بڑے دھیان سے انہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر کچھ ہلچل سی نظر آ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی جینز کی پاکٹ میں سے موبائل فون نکالا اور ہال سے باہر آ کر کسی کو کال کرنے میں مصروف ہو گیا۔

(جاری ہے)

لیونا برگ سے ایک طول طویل فاصلے پر اٹلی کے شہر میلانو میں ایک پُرشکوہ رہائشی عمارت کے اندر سوئمنگ پول کے کنارے گارڈن لائٹس کی روشنی میں ایک فربہ اندام شخص ''میٹ'' پر اوندھا لیٹا تھا اور ایک پری پیکر لڑکی مختصر لباس میں اس کی کمر کا مساج کرنے میں مصروف تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر سوئمنگ پول کے اندر ایک ہٹے کٹے سردار صاحب بغیر پگڑی کے پیراکی کر رہے تھے۔ وہ نشے کی حالت میں گا ہے بگا ہے بھونڈی آواز میں گنگنانے لگتے تھے۔ چیا چیا چرخا چلے......

اسی دوران میں مساج کراتے ہوئے تنومند جرمن کے بیش قیمت سیل فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ لڑکی نے بڑے ادب سے اسے فون پیش کیا۔ اسی طرح اوندھے لیٹے لیٹے...... ڈبل ٹھوڑی والے اس بارعب شخص نے بھاری آواز میں کہا۔

''ہاں ہاں بولو...... نمرسی بات کر رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے آواز ابھری۔ ''باس! میں یہاں لیونا برگ آیا ہوا ہوں، دوستوں کے ساتھ۔ آپ کو ڈسٹرب نہ کرتا لیکن ایک اہم اطلاع ہے۔ کم از کم میرا خیال تو یہی ہے کہ یہ آپ کے لیے اہم ہوگی۔''

پس منظر میں موسیقی وغیرہ کا شور سنائی دے رہا تھا۔ نمرسی نے اندازہ لگایا کہ اس کا یہ سابق کارندہ ہیری حسب توقع کسی عیاشی والی جگہ پر موجود ہے۔

وہ بھاری آواز میں بولا۔ ''اب جو کچھ کہنا ہے کہہ چکو۔''

ہیری نے کہا۔ ''سر! میں کچھ دیر پہلے یہاں دریا کے کنارے ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہوا ہوں۔ یہاں میں نے اپنی پرانی مہربان زویا کو دیکھا ہے۔ زویا راشد نیوز چینل والی۔''

نمرسی تھوڑا سا چونکا ضرور تاہم اس نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا، روکھے لہجے میں بولا۔ ''پتا نہیں کہ تم نے اسے ٹھیک سے دیکھا ہے یا نہیں لیکن...... اگر دیکھا بھی ہے تو لعنت بھیجو اس پر۔ اس سے حساب برابر ہو گیا تھا۔ کیسے کی سزا مل گئی تھی اسے۔''

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں سر، لیکن سوری۔ میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ زویا کے ساتھ ایک اور شخص بھی ہے۔ وہی پاکستانی...... شومیر یا شامیر...... اس نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی رکھ لی ہے۔ بال بھی کچھ لمبے ہیں، مگر میں نے اسے ایک سو ایک فیصد پہچان لیا ہے۔ یہ وہی باسٹرڈ ہے۔''

اس بار نمرسی واقعی چونکا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خوبرو لڑکی نے جلدی سے تولیا اس کے بالوں بھرے شانوں پر ڈال دیا اور ذرا ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ''تمہیں یقین ہے ہیری کہ یہ وہی ہے؟''

''میں نے کہا ہے نا جی کہ ایک سو ایک فیصد۔''

نمرسی کی نگاہوں کے سامنے قریباً چار سال پہلے کے وہ مناظر گھوم گئے جب انہیں فرینکفرٹ کے سٹی سینٹر میں اپنی ایک بڑی پراپرٹی سے ہاتھ دھونا پڑ گئے تھے۔ یوں تو پاکستانی سہراب درانی اور وہ اس پراپرٹی میں ففٹی ففٹی کے پارٹنر تھے، لیکن یہ پراپرٹی جانے سے نمرسی کا نقصان یوں زیادہ ہوا تھا کہ اس پراپرٹی کے نتیجے میں فرینکفرٹ میں ہی اس کی ایک ذاتی پراپرٹی بھی زد میں آ گئی تھی۔ نمرسی کو یوں لگا کہ اس کا وہ زخم تازہ ہو گیا ہے، درحقیقت اس بڑے نقصان کے بعد وہ کبھی ٹھیک سے سنبھل نہیں سکا تھا۔ آج کل وہ یہاں میلانو میں اپنے سکھ پارٹنر انوپ سنگھ کے ساتھ مل کر پراپرٹی کا کام کر رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ایک سائڈ بزنس انڈیا سے منشیات کی اسمگلنگ بھی تھی۔ ان دونوں کاموں میں وہ خود فیس پر نہیں تھا۔ یہ دونوں کام انوپ سنگھ نے سنبھال رکھے تھے۔ متلاشی اداروں کے خیال میں وہ آج کل میکسیکو میں کہیں رہ رہا تھا۔

اس نے سگار کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ وہی باسٹرڈ صحافی ہے تو پھر اس پر نظر رکھو۔ اس سے کچھ حساب کتاب کرنا ہے۔''

''جیسے آپ کا حکم سر۔'' کارندے ہیری نے خوش ہو کر کہا۔

☆☆☆

زویا اور شامیر وہیں آبی ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ بدمست سیاحوں کی ٹولی رخصت ہو چکی تھی۔ انہوں نے صرف کیک کاٹنے پر اکتفا نہیں کیا تھا، مشروبات بھی لیے تھے اور اس کے ساتھ موسیقی کی دھنا دھن بھی جاری رکھی تھی۔ ان کے جانے کے بعد ڈائننگ ہال کا ماحول ایک بار پھر قابلِ قبول ہو گیا۔ گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اس بار شامیر نے براہِ راست زویا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بلاتمہید پوچھا۔ ''زویا! ٹام سے شادی کر چکی ہو؟''

وہ جیسے پہلے سے اس سوال کی توقع کر رہی تھی لہٰذا پزل نہیں ہوئی۔ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''اپنے بھائی سے شادی کون کر سکتا ہے۔ وہ میرا سگا بھائی نہیں ہے

لیکن سگے بھائیوں سے بڑھ کر اہمیت دیتی ہوں اسے۔''
شامیر بھونچکا سا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس موقع پر کیا کہے۔
وہ بدستور مطمئن لہجے میں بولی۔ ''ویسے دو ماہ پہلے ٹام کی شادی ہو چکی ہے۔ اپنے ہی میوزک بینڈ کی ایک برٹش پرفارمر کرسٹینا کے ساتھ اس نے پسند کی شادی کی ہے۔ دونوں تین سال سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ اب وہ میرے ساتھ والے فلیٹ میں رہتے ہیں اور بڑے خوش وخرم ہیں......''
زویا نے اپنے موبائل فون کی اسکرین پر دو تین تصویریں اسے دکھائیں۔ ان میں ٹام اور اس کی نوبیاہتا برٹش بیوی دکھائی دے رہے تھے۔
شامیر نے کہیں سنا تھا کہ بعض اوقات سمندروں میں خشکی اور صحراؤں میں پانی کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ نگاہوں کے سراب ہوتے ہیں۔ اسی طرح ''حالات'' کے سراب بھی ہوتے ہیں۔ جو کچھ نظر آرہا ہوتا ہے اور جس کی تصدیق بھی ہو رہی ہوتی ہے...... وہ ویسا ہوتا نہیں ہے۔ یہ ایک ''الیوژن'' ہوتا ہے۔ ایک بصری واہمہ، ایک ادراکی دھوکا۔ پسِ پردہ حقائق کچھ اور ہوتے ہیں۔ شامیر کو یوں محسوس ہونے لگا کہ زویا کے حوالے سے بھی جو کچھ نظر آرہا تھا اور ثابت ہو رہا تھا...... وہ غلط نظر آرہا تھا اور غلط ثابت ہو رہا تھا۔
چار سال پہلے زویا نے روٹھے ہوئے شامیر کو نہ منایا اور اسے پاکستان جانے دیا، یہ ایک علیحدہ معاملہ تھا...... لیکن اس کے بعد بقول جین وہ بہت روتی اور پچھتاتی رہی۔ عرصے تک جدائی کا غم اسے ریزہ ریزہ کرتا رہا۔ اس کے بعد نمرسی والی سنگین واردات ہوئی اور وہ کچھ اور گردابوں میں پھنس کر رہ گئی، اس کی بہن کی زندگی خراب ہوئی، بہن کا بچہ ضائع ہوا۔ اس کی ماں شدید زخمی ہوئی اور وہ لوگ گھر سے بے گھر ہو کر اس سرحدی شہر ایسن میں جا پہنچے۔ یہاں رابرٹ نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ بتدریج سامنے آرہا تھا...... وہ ایک مسلسل عذاب سے گزری۔ اس نے رابرٹ کی بچی کو جنم دیا۔ رابرٹ کے مجبور کرنے پر ہی وہ گھر میں نئی تراش کے بولڈ لباس پہنتی رہی۔ رابرٹ کی وجہ سے ہی وہ اپنے مشرقی طرز کے خوبصورت لمبے بالوں سے محروم ہوئی۔ عام خیال یہ تھا کہ اس نے رابرٹ سے بے وفائی کی۔ اپنے دوست ٹام کا سہارا لیا اور رابرٹ کی بچی کو لے کر ٹام کے ساتھ بھاگ گئی اور ایک بیوی کی طرح اس کے ساتھ رہنے لگی۔ اب یہ آخری الزام بھی درست ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی پوری تصدیق تو نہیں ہوئی تھی مگر شامیر کے دل کے اندر سے گواہی آرہی تھی کہ وہ اس معاملے میں بھی شاید جھوٹ نہیں بول رہی۔
اب ایک سب سے اہم سوال شامیر کے ذہن میں منڈلا رہا تھا۔ وہ سوال جو وہ تین ساڑھے تین برس سے اب تک ہزاروں بار خیالوں ہی خیالوں میں فرینکفرٹ کی اس لڑکی سے پوچھ چکا تھا۔ اس سوال کو پوچھنے کے لیے بے پناہ حوصلہ چاہیے تھا اور اس کا جواب سننے کے لیے آہنی کلیجے کی ضرورت تھی...... یہ سوال محبت کے بارے میں تھا اور اس ''آس'' کے حوالے سے تھا جو مر کر بھی نہیں مرتی۔
شامیر کچھ دیر تک میز کی چمکیلی سطح کو گھورتا رہا، پھر میز پر ہی نظریں جمائے جمائے بولا۔ ''زویا! ہم نے ایک دوسرے سے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے...... کیا تم اب بھی یہی سمجھتی ہو کہ پچھلی بار فرینکفرٹ چھوڑنے سے قبل میں نے تمہاری ماما پر ہاتھ اٹھایا تھا؟''
ایک لمبے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''شاید، اب میں ایسا نہیں سمجھتی...... مگر شومیر! اب ان باتوں سے کچھ فائدہ نہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ سب کچھ ماضی کا حصہ ہے۔''
''ان دنوں میں...... اس جولائی میں جو کچھ بھی ہوا...... وہ سب کچھ؟'' شامیر نے عجیب دلسوز انداز میں پوچھا۔
''ہاں شومیر! وہ سب کچھ۔'' زویا بے حد سنجیدگی سے بولی۔ یوں لگا کہ وہ کچھ کہنے کے لیے اپنے آپ کو کمپوز کر رہی ہے۔ تب اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''شومیر! یہ سچ ہے کہ تمہارے جانے کے بعد میں غمزدہ رہی۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ ہم منزل کے بالکل قریب آکر بچھڑے ہیں۔ اس وقت شاید ہم دونوں میں سے کوئی ایک، تھوڑی سی کوشش کر کے قدم آگے بڑھا لیتا تو صورت حال مختلف ہو جاتی۔ بہر طور آہستہ آہستہ میں نے خود کو سنبھالنا شروع کر دیا۔ پھر حالات ایسے ہوئے کہ سارے معاملات کسی اور طرف چل پڑے۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں شومیر! جو کہوں گی سچ کہوں گی اور سچ یہی ہے کہ وقت بہت آگے نکل گیا ہے۔ اب وہ ساری باتیں بہت دور کی لگتی ہیں اور کسی حد تک ''آؤٹ آف ڈیٹ'' بھی۔ میں اب کوئی کنواری لڑکی نہیں ہوں۔ ایک بچی کی ماں ہوں۔ زمانے کا بہت سرد گرم دیکھ چکی ہوں اور دیکھ رہی ہوں۔ شاید تمہیں یہ جان کر مایوسی بھی ہو کہ

پچھلے ڈیڑھ دو سال میں، میں نے شاید ہی گزرے دنوں کے بارے میں سوچا ہو۔ غالباً حال ہی اتنا کٹھن ہے کہ ماضی کے بارے میں سوچنا مشکل محسوس ہوتا ہے۔ میں خدا کا شکر کرتی ہوں کہ اس نے مجھے کم از کم ماضی کی تلخیوں کے حوالے سے تو مکمل سکون دیا ہے۔ اب میں پرانے زخموں کو کریدنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

شامیر بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ ایک سرد لہر سی پورے سراپا میں دوڑ رہی تھی۔ زویا کے روکھے پھیکے، سپاٹ لب و لہجے نے اس کے اندر بھی جیسے کئی ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کو گل کر دیا تھا۔

''تو یہ واقعی آخری ملاقات ہے؟'' اس نے بہ زبان خاموشی خود سے سوال کیا۔

وہ کمزور دھاگا بھی اب ٹوٹ چکا ہے جو ایک طرف ماضی کے اس جولائی سے اور دوسری طرف آس کی ایک شعاع سے بندھا ہوا تھا؟

کیا اب راکھ میں کوئی بھی چنگاری نہیں بچی ہے؟

زویا کی آواز نے شامیر کو خیالوں سے چونکایا۔ ''میں تم سے بس دو التجائیں کرنا چاہتی ہوں۔ ایک تو یہ کہ میری یہاں لیونابرگ میں موجودگی کے بارے میں کسی کو پتا نہ چلے...... اور دوسری یہ کہ...... تمہارے لیے اور شاید میرے لیے بھی یہی بہتر ہے کہ اب ہم کبھی ملنے کی کوشش نہ کریں۔ ایک دوسرے کو بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔''

شامیر نے ایک طویل سرد آہ کھینچی۔ ''کچھ اور کہنا ہے تو وہ بھی کہہ دو۔''

کئی سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ہاں...... اور اگر ہو سکے تو پاکستان میں ہی رہنے والی کسی پیاری سی ہم وطن کو اپنی زندگی کی ساتھی بنا لو۔''

ریستوران کی کھڑکیوں سے باہر رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ دریائے ایلم ناؤ کے کنارے موسیقی گونج رہی تھی۔ کوئی مقامی گلوکارہ بلند آواز میں میڈونا کا معروف گانا الاپ رہی تھی۔ The Power of Good bye

تمہارا دل مجھے راستہ نہیں دے رہا۔
اس لیے مجھ کو جانا ہوگا
تم میرے لیے ایک سبق کی طرح تھے اور میں تمہیں پڑھنے پر مجبور تھی۔
میں تمہارے لیے ایک قلعے کی طرح تھی اور تم نے مجھے جلانا ہی جلانا تھا

☆☆☆

شامیر کو رخصت کرنا، اسے الوداع کہنا کافی کٹھن ثابت ہوا تھا۔ خاصے بوجھل لمحے تھے وہ۔ بہرحال اب زویا اپنے فلیٹ میں واپس آ چکی تھی۔ ٹام اور اس کی برٹش وائف کرسٹینا جانتے تھے کہ زویا کہاں گئی ہے اور کس سے مل کر آئی ہے۔ زویا کی دو سالہ بچی ان دونوں کے پاس ہی سو رہی تھی۔ زویا نے اسے سوتی حالت میں ہی اٹھایا۔ سینے سے لگا کر بھینچا۔ اس کا منہ چوما اور پھر اسے لے کر اپنے فلیٹ کی طرف بڑھی۔

''زویا! وہ چلا گیا؟'' ٹام نے عقب سے آواز دے کر پوچھا۔

''ہاں ٹام!'' زویا مڑے بغیر بولی۔

''تھینکس گاڈ!'' کرسٹینا کی آواز سنائی دی۔

زویا اپنے کمرے میں آ گئی۔ بچی کو بڑی احتیاط سے اپنے پاس بستر پر لٹایا۔ وال کلاک دیکھا۔ رات کے دو بجنے والے تھے۔ یوں تو اگلے روز چھٹی تھی تاہم وہ جس مقامی میگزین میں پروف ریڈنگ کا کام کر رہی تھی، وہاں دوپہر میں تھوڑا سا کام تھا اور اس کے لیے آفس جانا ضروری تھا۔

وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بری طرح جل رہے تھے۔ سینے میں دھواں سا تھا۔ سلیپنگ گاؤن کی ڈوری باندھتے ہوئے وہ دروازے کی طرف گئی۔ اس کی سلائڈنگ بولٹ چیک کی۔ تب الماری کی طرف بڑھی۔ ایک اندرونی دراز سے اس نے کاپی سائز کی ایک البم نکالی۔ اس پوری البم میں صرف شامیر اور زویا کی تصویریں تھیں۔ ایک پورے پیج پر شامیر کی ایک بڑے سائز کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ فرینکفرٹ میں دریائے مائنز کے کنارے، ایک فوارے کے پاس، اپنے دونوں بازو سینے پر باندھے کھڑا تھا اور کیمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے اس تصویر کو دیکھتی رہی پھر اچانک اس نے البم کو اس تصویر سمیت اپنے سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... روتی چلی گئی...... ''شومیر...... شومیر!'' اس نے بے قراری سے کہا۔

اس کے سینے میں آنسوؤں کا دریا سا بہہ رہا تھا۔ بہ زبانِ خاموشی وہ شامیر سے مخاطب ہوئی...... ''تمہیں کیا پتا، تم میرے لیے کیا ہو...... تمہیں کیا پتا، ہر پل ہر لمحہ کیسے گزرتا ہے تمہارے بغیر...... تمہیں چاہا تو پھر کچھ نہیں چاہا...... تمہیں

سوچا تو پھر کچھ نہیں سوچا...... تم میری زندگی کی پہلی اور آخری چاہ ہو شومیر!...... مجھے معاف کر دینا...... میری مجبوریوں کو بخش دینا...... میں تمہیں اور خود کو کانٹوں پر نہیں گھسیٹ سکتی...... مجھے یہاں میرے عذابوں میں رہنے دو۔ میرے لیے اپنی زندگی مصیبتوں میں نہ ڈالو۔ ویسے بھی میں اب کہاں ہوں تمہارے قابل؟ تم اپنے پیارے پاکستان کی محفوظ فضاؤں میں چلے جاؤ۔ ہر لمحے میری دعا ہے کہ چاہتیں، خوشیاں اور کامرانیاں تمہارے قدم چومیں......'' آنسو اس کے رخساروں پر چل رہے تھے۔

......اور قریباً یہی وقت تھا جب شامیر اپنے دل پر پہاڑ جیسا بوجھ لیے خوبصورت قصبے لیونا برگ سے واپس جا رہا تھا۔ داستانوں جیسی دلکشی والا یہ رنگ برنگ قصبہ اب اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ فیاٹ گاڑی مارگریٹ ڈرائیو کر رہی تھی۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ گاڑی کے اندر ماحول بے حد بوجھل تھا۔ رات کے سناٹے میں گاڑی ہائی وے پر تیزی سے تیرتی چلی جا رہی تھی۔ شامیر کے سینے میں بھرا ہوا دھواں گاڑھا اور تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ روتا نہیں تھا مگر تیزابی آنسو تو روئے بغیر بھی آنکھوں سے نکل آتے ہیں اور اسے یہی خدشہ تھا۔ ہائی وے کے کنارے چند روشنیاں نظر آئیں۔ یہاں فلنگ اسٹیشن اور ایک دو اسٹورز تھے۔

''مارگریٹ! ذرا یہاں گاڑی روکو۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

مارگریٹ نے گاڑی کی رفتار کم کی اور پھر اسے پارکنگ ایریا میں موڑ کر روک دیا۔

''کچھ اسنیکس لے آؤ...... اور سوفٹ ڈرنکس بھی۔'' اس نے مارگریٹ سے کہا۔

وہ ''اوکے سر'' کہتی ہوئی چلی گئی۔ شامیر کے سینے کا دھواں گاڑھا ہوتا گیا...... اور رونا ضروری نہیں ہوتا، آنسو ویسے بھی تو آنکھوں سے ابل پڑتے ہیں۔ اس نے اپنا بازو موڑ کر ڈیش بورڈ پر رکھا اور اس پر اپنا ماتھا ٹیک دیا۔ آنسو بہتے چلے گئے۔ آتشیں مگر بالکل خاموش آنسو۔ اس نے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے۔ دو تین منٹ بعد اس نے گاڑی کا ایک دروازہ کھولا۔ پانی کی بوتل نکال کر اپنا منہ دھویا۔ اسی دوران میں مارگریٹ بھی واپس آتی دکھائی دی...... وہ دونوں ایک بار پھر روانہ ہوگئے۔ شامیر کو اپنا آپ پہلے سے کچھ ہلکا محسوس ہو رہا تھا لیکن سینے میں ہلکا ہلکا دھواں بھرتی ہوئی آگ تو اپنی جگہ تھی۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے مارگریٹ بولی۔ ''کل آپ نے فادر جوناتھن کا ذکر کیا تھا نا۔ شام کے بعد میں لیونا برگ کے بڑے گرجے میں گئی۔ فادر جوناتھن اب وہاں نہیں ہیں...... وہ اب برج برگ نام کے ٹاؤن میں شفٹ ہو گئے ہیں...... یہ برج برگ یہاں راستے میں ہی آتا ہے۔ ویسے فادر جوناتھن کی نیک نامی تسلیم شدہ ہے۔ میں بھی انہیں جانتی ہوں۔ ایک دو بار ایک ٹی وی پروگرام میں بھی دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب کے نام پر لوگوں کو تقسیم نہیں ہونا چاہیے...... وہ عیسایت سے زیادہ انسانیت کے پرچار پر زور دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مقامی حلقوں میں مقبول ہیں۔''

''ہاں، یہ بات تو میں نے بھی محسوس کی تھی ان میں۔'' شامیر نے مختصر جواب دیا۔

شامیر، مارگریٹ کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی نگاہ عقب نما آئینے پر بھی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے شبہ ہو رہا تھا کہ ایک سفید رنگ کی ہائی روف گاڑی مسلسل ان کے پیچھے یا آگے دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ عقب میں تھی اور درمیان میں آجانے والی ایک اوڈی کار کو اوورٹیک کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

مارگریٹ اپنی رو میں بولتی چلی جارہی تھی۔ اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھیں جی، دائیں طرف اس قصبے کی روشنیاں بھی نظر آرہی ہیں...... اگر آپ فادر جوناتھن سے ملنا چاہیں تو ہم دس منٹ میں وہاں پہنچ سکتے ہیں......''

مارگریٹ نے یہ بات یونہی کہہ دی تھی۔ رات کے اس پہر فادر جوناتھن کا دروازہ کھٹکھٹانے کی کوئی تک نہیں تھی مگر شامیر کو سفید رنگ کی ہائی روف کے حوالے سے جو شک ہو رہا تھا، اس کے سبب وہ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے رسٹ واچ دیکھی پھر مارگریٹ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کتنی دور ہے انٹر چینج؟''

''دو کلومیٹر۔''

''تو چلو پھر...... ہمیں کون سا کہیں جلدی پہنچنا ہے۔''

مارگریٹ شاید خود بھی پادری جوناتھن کو اور اس برج برگ نامی قصبے کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے گاڑی انٹر چینج کی طرف موڑ دی۔ یہ دیکھ کر شامیر کی رگوں میں خون سنسنا اٹھا کہ سفید گاڑی بھی ان کے پیچھے ہی آئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ اس چھوٹے سے پُرسکون قصبے میں تھے۔ قصبے کی شفاف سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹس اونگھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں...... اور یہ لائٹس ہی نہیں پورا قصبہ نیند کی زد میں تھا۔ بس کہیں کہیں کوئی فلنگ اسٹیشن، کوئی چھوٹا ریسٹورنٹ یا گروسری اسٹور کھلا نظر آتا تھا۔

''مارگریٹ! ایک گاڑی مسلسل ہمارے پیچھے آرہی ہے۔'' شامیر نے کہا تو وہ بری طرح ٹھٹک گئی۔

دو چار منٹ بعد اسے بھی یقین ہوگیا کہ ہائی روف ویگن واقعی ان کے پیچھے آرہی ہے۔ اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ اس میں ایک سے زیادہ افراد سوار ہیں۔ ''کون ہو سکتے ہیں یہ؟'' مارگریٹ نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ لیکن یہ بات اب یقینی ہے کہ یہ ہمارے تعاقب میں ہیں اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ ان کو ہمارے ہوشیار ہونے کا پتا چل گیا ہے۔''

مارگریٹ نے پھرتی سے گاڑی ایک تنگ سڑک پر موڑ دی۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد سفید وین بھی اس سڑک پر آگئی اور عقب نما میں نظر آنے لگی۔

''کک...... کہیں یہ زویا کے شوہر کے بھیجے ہوئے بندے تو نہیں؟'' مارگریٹ نے پوچھا۔

''مجھے تو ایسا نہیں لگ رہا۔'' شامیر نے جواب دیا۔

اب صاف پتا چل رہا تھا کہ سفید گاڑی ان کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ شاید اس میں سوار لوگوں کو بھی یہ احساس ہوگیا تھا کہ یہ ایک گنجان قصبے کی بل کھاتی سڑکیں ہیں...... اور وہ جس فیاٹ کے پیچھے ہیں، وہ کسی بھی وقت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکتی ہے۔ رات کے ان پہروں میں سڑکوں پر کہیں کہیں پولیس کا گشت بھی نظر آیا کرتا ہے مگر شامیر اور مارگریٹ کو ایک پولیس موبائل کے سوا کہیں اور کوئی پولیس والا نظر نہیں آیا۔ ''کیا ہم ریڈیو پر پولیس سے مدد مانگنے کی کوشش کریں؟'' مارگریٹ نے ہراساں لہجے میں سوال کیا۔

اس سے پہلے کہ شامیر جواب میں کچھ کہتا، سفید ویگن ان کے بالکل قریب آگئی۔ دونوں گاڑیاں ایک نسبتاً کشادہ سڑک پر پہلو بہ پہلو دوڑ رہی تھیں۔ شامیر نے ایک نظر وین کے اندر ڈالی۔ ڈرائیور کے علاوہ دو افراد مزید دکھائی دیے۔ وہ شکلوں سے ہی لڑائی بھڑائی والے لوگ نظر آتے تھے۔ مارگریٹ کو ڈر محسوس ہوا کہ وین اسے اوورٹیک کرے گی اور پھر اسے روکنے کی کوشش کرے گی۔ اس نے بڑی مشاقی سے دفعتاً فیاٹ کو پھر ایک بغلی سڑک پر موڑ دیا۔ وین اپنی جھونک میں آگے نکلتی چلی گئی مگر یوں تیزی کے ساتھ مڑنے کی وجہ سے مارگریٹ بھی گاڑی کو سنبھال نہ سکی۔ وہ بری طرح لہرائی۔ فٹ پاتھ پر چڑھی اور پھر ایک دیوار سے ٹکرا گئی۔ رات کے اس پہر سڑکیں اور گلیاں خالی تھیں ورنہ کار کا یوں آؤٹ آف کنٹرول ہونا کسی جانی نقصان کا باعث بن سکتا تھا۔

تصادم کے باوجود مارگریٹ نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے تیزی سے گاڑی ریورس کی، اسے دوبارہ سڑک پر چڑھایا اور پھر سے بھگا دیا۔ وین کو رکنے، مڑنے اور پھر اس بغلی سڑک پر آنے میں جو وقت لگا، اس نے مارگریٹ اور شامیر کو سو ڈیڑھ سو میٹر دور پہنچا دیا۔

''بائیں موڑ لو۔'' شامیر نے چلا کر کہا۔

مارگریٹ نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ یہاں

دونوں طرف رہائشی مکانات تھے۔ مخروطی چھتیں، پھولوں سے سجی ہوئی بالکونیاں۔ سڑک کی دونوں اطراف گاڑیاں پارک تھیں۔ ''وہ آرہے ہیں۔'' مارگریٹ نے عقب نما میں دیکھ کر ہراساں لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں شامیر کو تکلیف کی جھلک بھی محسوس ہوئی۔

مارگریٹ نے پھر گاڑی کو ایک سڑک پر موڑا۔ اسے ایک گھر کا کھلا ہوا گیٹ نظر آیا۔ بڑی حاضر دماغی سے بروقت فیصلہ کرتے ہوئے اس نے کار گیٹ کے اندر گھسا دی اور گھر کے احاطے میں ہی دائیں جانب موڑ کر یکایک اس کی لائٹس آف کر دیں۔

آٹھ دس سیکنڈ بعد باہر سڑک پر انجن کا شور ابھرا اور پتا چلا کہ سفید وین بڑے فراٹے کے ساتھ آگے نکل گئی ہے۔ کھلے گیٹ میں سے اس کی ایک جھلک شامیر کو نظر بھی آئی۔ اب اس احاطے میں مزید نہیں رکا جاسکتا تھا۔ گھر کے اندر ایک دو کھڑکیاں روشن ہوگئی تھیں۔ رکھوالی کا ایک کتا شور مچانے لگا تھا۔ ایک شخص جو غالباً چوکیدار یا گارڈ تھا، لپکتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی مارگریٹ نے اپنا یوٹرن مکمل کیا اور اس گھر سے باہر نکل آئی۔ سفید وین جنوب کی طرف گئی تھی، مارگریٹ اور شامیر کا رخ اب شمال کی طرف تھا۔ اس گھر کا کھلا ہوا گیٹ ان دونوں کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا تھا۔

''ویل ڈن مارگریٹ۔'' شامیر نے اس کا کندھا تھپکا۔ ''تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی ہے؟''

''نہیں سر! بس پاؤں میں کچھ موچ سی لگ رہی ہے۔''

''کہاں جاتا ہے یہ راستہ؟'' شامیر نے پوچھا۔

''یہ ایک بائی پاس کی طرح ہے جی...... پندرہ بیس کلومیٹر کا سفر کر کے ہم دوبارہ اپنے روٹ پر آسکتے ہیں۔'' وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

وہ دونوں سخت تناؤ میں تھے۔ بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ وہ انہیں چکما دے کر نکل آئے ہیں مگر اندیشے ابھی باقی تھے۔ ''کون ہوسکتے تھے یہ لوگ؟'' یہ سوال بار بار شامیر کے ذہن میں ابھرتا تھا۔ ان کا پیچھے آنے کا انداز، پھر ان دونوں کو روکنے کی بے خوف کوشش، ان کے بگڑے ہوئے تیور...... یہ سب کچھ بتا رہا تھا کہ یہ کوئی معمولی معاملہ نہیں تھا۔ اس بات کا امکان پچیس تیس فیصد سے زیادہ نہیں تھا کہ وہ راہزن یا مقامی وارداتیے ہوں...... تو پھر...... ایک خیال بجلی کی سی سرعت سے بار بار شامیر کے دماغ سے ٹکرا رہا تھا اور اوجھل ہو رہا تھا۔ کہیں...... یہ وہی معاملہ تو نہیں، جس کا اندیشہ پہلے جین نے اور پھر حولیہ نے اور پھر کسی حد تک زویا نے بھی ظاہر کیا تھا۔ وہ لوگ جنھوں نے زویا کی فیملی کے ساتھ بدترین بدمعاشی کی تھی، انہیں ذلیل کر کے گھر سے بے گھر کیا تھا...... اور نتیجے میں وہ سنگین تر مصائب کے حوالے ہوئے تھے۔ لیکن اگر ایسا ہے تو کیسے ہوا ہے؟ اور اگر واقعی ایسا ہوگیا ہے...... اور لیونا برگ میں نمرسی گروپ کے کسی شخص نے شامیر کو دیکھ اور پہچان لیا ہے تو پھر...... پھر یہ عین ممکن تھا کہ زویا کو بھی دیکھ اور پہچان لیا ہو بلکہ قریب از قیاس یہ تھا کہ ان دونوں کو ریسٹورنٹ میں اکٹھے دیکھ لیا گیا ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ زویا کی خبر لینا اور اسے خطرے سے آگاہ کرنا ضروری ہوگیا ہے۔

شامیر نے ہائی وے کے ایک پارکنگ ایریا میں کار رکوائی اور فون ہاتھ میں تھام کر سوچنے لگا۔ وہ لیونا برگ سے ایک بار پھر یہ عہد کر کے نکلا تھا کہ مڑ کر زویا کی طرف دیکھے گا اور نہ کبھی اس سے ازخود رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ زویا کے رویّے میں جو اٹل کیفیت اسے نظر آئی تھی، اس کے دکھ کو لفظوں میں بیان کرنا شامیر کے بس سے باہر تھا مگر یہ وقت کی بے ثباتی تھی کہ وہ تین چار گھنٹے بعد ہی اس کو کال کرنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ زویا کا نمبر ڈائل کیا۔ بیل جانا شروع ہوئی اور پھر...... جاتی رہی...... اس نے کم از کم تین بار اسے کال ملانے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ وہ ایک گہری دکھ بھری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ اب لیونا برگ سے کافی دور آچکے تھے۔ ان کی منزل یعنی پیڈربورن اب صرف اسّی نوّے کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ شامیر کی ہدایت پر مارگریٹ نے گاڑی پھر ہائی وے پر چڑھا دی۔ شکر کا مقام تھا کہ تصادم کے سبب گاڑی کو ''زیادہ اور نمایاں'' نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وہ تیزی سے پیڈربورن کی طرف بڑھنے لگے۔ شامیر کے دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ یہ سوچ اس کے لیے سوہانِ روح تھی کہ کہیں اس کی یہاں آمد کی وجہ سے زویا کی پریشان زندگی مزید پریشانیوں اور خطروں کا شکار نہ ہوجائے۔ مارگریٹ خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہی تھی تاہم اس کے دل و دماغ میں بھی تشویش کی بلند لہریں موجود تھیں۔

☆☆☆

زویا دیر سے سوئی تھی، پھر بھی صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ اٹھ گئی۔ عینی ابھی تک اس کے پہلو میں سو رہی تھی۔ رات والی سنگین اور دلفگار ملاقات کے سارے مناظر ایک

بار پھر اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ اس نے سائڈ ٹیبل سے اپنا سیل فون اٹھایا۔ رات کے آخری پہر چار بجے کے قریب اس کے نمبر پر شامیر کی تین کالز آئی تھیں۔ مسلسل بیل سے وہ جاگ گئی تھی مگر اس نے کال وصول نہیں کی تھی۔ پتا نہیں کہ اب وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ زویا کو یہی لگتا تھا کہ وہ جتنی بار اس کی آواز سنے گی، اتنی ہی بار اس کے زخموں سے خون رسے گا اور وہ بے حال ہوگی۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ کچھ روز کے لیے فون بند ہی کر چھوڑ دے۔

فریش ہونے کے بعد اس نے ننھی عینی کو جگایا۔ اس کا ڈائپر بدلا اور اس کو فیڈ کرانے کا سوچنے لگی۔ وہ چھوٹی سی جان اس کے روز و شب کا محور بن کر رہ گئی تھی۔ اچانک دروازے پر ناک ہوئی۔ اس نے یہی سمجھا کہ ٹام کی بیوی کرسٹینا آئی ہے تاکہ وہ دونوں مل کر ناشتا بنا سکیں لیکن پھر اسے یاد آیا کہ ٹام اور کرسٹینا کو تو صبح سویرے بذریعہ ٹرین ہیمبرگ جانا تھا۔ وہاں کرسٹینا کے والدین رہتے تھے......

اس کا مطلب تھا کہ اگر آج اسے آفس جانا پڑا تو وہ ننھی عینی کو ''ڈے کیئر'' والوں کے حوالے کر کے جائے گی...... اس نے دروازہ کھولا تو دو افراد اسے دھکیلتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان کے پیچھے ایک تیسرا بھی تھا جس نے آنکھوں پر سیاہ گلاسز چڑھا رکھے تھے، ان تینوں کی صورتیں ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھیں کہ وہ خطرناک لوگ ہیں۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' زویا سرتاپا لرز کر ہراساں آواز میں بولی۔

''اس کو بدتمیزی نہیں ''مہمانوں کی آمد'' کہا جاتا ہے۔'' سیاہ چشمے والے نے منہ ٹیڑھا کر کے جرمن زبان میں کہا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' وہ بلند آواز میں بولی۔

ایک شخص نے اسے دھکا دیا۔ وہ صوفے پر جا گری۔ پھر اس نے لپک کر عینی کو گود میں اٹھا لیا، جس نے اجنبیوں کو دیکھ کر منہ بسورنا شروع کر دیا تھا۔ ایک شخص نے فلیٹ کے مین دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا تھا۔

''دیکھو، شور وغیرہ کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ ورنہ یہاں تمہارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' سیاہ چشمے والے لمبے تڑنگے جرمن نے کرخت انداز میں کہا۔

''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟'' وہ ہکلائی۔

''چاہتے تو یہی تھے کہ یہ معاملہ وہیں پر ختم ہو جائے، مگر لگتا ہے کہ تمہاری شامت اعمال نے تمہیں آواز دی ہے۔ تم نے پھر پرانے زخم ہرے کر دیے ہیں۔''

''تم کیا بکواس کر رہے ہو؟'' اس نے عینی کو سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا۔ تب اس کی نگاہ سیاہ چشمے والے کے ایک ساتھی پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ یہ چہرہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا...... ہاں، وہ جانتی تھی۔ یہ اس کا ''ہم کار'' وہی ہیری تھا جس نے چار سال پہلے سہراب اور نمرسی کی غیر قانونی پراپرٹی ڈھونڈنے کے سلسلے میں کچھ کام کیا تھا اور پھر سب کچھ ادھورا چھوڑ کر اچانک غائب ہو گیا تھا۔ تب بھی خیال یہی تھا کہ وہ لالچی بک گیا ہے۔ زویا کو ہیری کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اپنے لیے بیگانگی اور تضحیک صاف نظر آئی۔

زویا کے دل و دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اب اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ اس خوبصورت صبح میں جن بدصورت لوگوں نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی، ان کا تعلق کسی نہ کسی طور رونالڈ و نمرسی سے تھا۔ وہ جانور جس نے تین ساڑھے تین سال پہلے اس پر اور اس کی فیملی پر عرصۂ حیات تنگ کیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کا دل بند ہو جائے گا اور وہ اپنی بچی سمیت فرش پر گر کر ختم ہو جائے گی۔

''تت...... تم لوگ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟'' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بمشکل بول پائی۔

سیاہ چشمے والا صوفے کے ہتھے پر زویا کے بالکل قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے اپنا سوال بدل دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم جان گئی ہو کہ ہم کون ہیں اور اگر جان گئی ہو تو پھر یہ بھی ضرور جان گئی ہو گی کہ ہم نے تمہارے آرام میں مخل ہونے کی جسارت کس لیے کی ہے۔ ہم یہاں تمہارے عاشق کے بارے میں جاننے کے لیے حاضر ہوئے ہیں اور یہ جاننے کے لیے حاضر ہوئے ہیں کہ یہ ''گرما گرم'' معاملات اب کہاں تک پہنچے ہیں۔'' آخری الفاظ کہتے ہوئے اس نے بڑے لوفر انداز میں زویا کے بالوں کو چھوا۔

وہ چلا اٹھی۔ ''اپنے یہ گندے ہاتھ دور رکھو مجھ سے...... ورنہ...... ورنہ......''

''ورنہ کیا؟ پڑوسیوں کو آواز دو گی... پولیس کو بلا لو گی؟'' وہ زویا کی بات کاٹ کر بولا۔

گفتگو کے دوران میں زویا کی گرفت اپنی بچی پر بالکل ڈھیلی ہو گئی تھی۔ سیاہ چشمے والے نے یکایک جھپٹا مار کر بچی اس سے چھین لی۔ وہ بچی واپس لینے کے لیے لپکی، مگر ہیری نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا۔ ''خبردار! آواز نہ

نکالنا، ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔'' وہ خطرناک لہجے میں بولا۔

وہ جہاں کی تہاں ساکت کھڑی رہ گئی۔ سیاہ چشمے والے نے بچی کو چوما، اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر اسے لے کر کھڑکی کے بالکل پاس جا کھڑا ہوا۔ ادھ کھلی کھڑکی میں سے اس نے نیچے جھانکا...... اور معنی خیز انداز میں بولا۔ ''کافی اونچائی ہے۔''

''خدا کے لیے نہیں...... خدا کے لیے، اسے پیچھے ہٹاؤ۔'' وہ بلک اٹھی۔

وہ بچی کو پچکارتے ہوئے بولا۔ ''حوصلہ رکھو، اسے کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس تم اپنی آواز ذرا دھیمی رکھو اور آرام سے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔''

زویا نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔ سیاہ چشمے والے نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ غنڈا صحافی...... تمہارا عاشق نامدار؟''

''تم...... کس کی بات کر رہے ہو؟'' وہ کھوکھلی آواز میں بولی۔

''اسی کی...... جسے تمہاری کشش بار بار کھینچ کر جرمنی لا رہی ہے اور جس کے ساتھ تم کل رات فل مون ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھیں۔''

وہ کچھ دیر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر ہمت کر کے بولی۔ ''تم پاکستانی شومیر کی بات کر رہے ہو۔ میں کئی سال بعد کل رات اس سے ملی ہوں۔ وہ یہاں کسی اور کام سے آیا ہوا ہے۔ پتا نہیں کس طرح مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔ ہمارے درمیان بس...... عام نوعیت...... کی بات چیت ہوئی۔ مم...... میں قسم کھاتی ہوں اب میرے اور اس کے درمیان کچھ نہیں ہے۔''

''تمہارے اور اس کے درمیان اب کچھ نہیں ہے۔'' سیاہ چشمے والا تمسخر کے لہجے میں بولا۔ ''لیکن ہمارے اور اس کے درمیان تو اب بھی کافی کچھ ہے۔ نمرسی صاحب اس سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کہاں ہے وہ شہزادہ؟''

''مم...... مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں قسم کھاتی ہوں۔ وہ رات کو ہی کہہ رہا تھا کہ میں واپس جا رہا ہوں۔ وہ چلا گیا ہوگا۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں گیا ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے دوغلی نسل کی دوغلی لڑکی۔ اتنا پرانا یارانہ...... اتنے پکے بندھن...... اور یہ بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ اچھا...... چلو چھوڑو...... نہیں پتا ہوگا لیکن اس شہزادے کا...... اس جانِ من کا فون نمبر تو تمہارے پاس ہوگا؟''

''میں سچ کہتی ہوں۔ کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ اس کا فون نمبر اور ای میل وغیرہ میں نے مدتوں پہلے ڈیلیٹ کر چھوڑا تھا۔'' اس نے ذرا توقف کیا۔ تب ایک بار پھر اپنی بچی کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ ''پلیز! اسے مجھے دے دو، دیکھو اس کا رنگ زرد ہو رہا ہے۔''

''کہاں زرد ہو رہا ہے، اتنے سکون سے تو بیٹھی ہے۔'' سیاہ چشمے والے نے ایک بار پھر اس کا ماتھا چوما...... اور کمرے کے اندر ہی ایک چھوٹا سا چکر لگانے کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہے مان لیتے ہیں کہ تمہارے پاس اپنے عاشق کا فون نمبر Save نہیں ہے۔ پر اس نے یہاں پہنچ کر تمہیں کوئی کال شال تو کی ہوگی نا۔ اس کا نمبر آ گیا ہوگا۔''

زویا کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس وہ آیا اور چلا گیا...... بلکہ میں نے ہی اسے بھیج دیا...... حقیقت میں، میں اس سے ملنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں تو......''

زویا کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ سیاہ چشمے والے کے فون پر کال کے سگنل آ رہے تھے۔ بچی اپنے ساتھی کو سونپ کر اس نے اسکرین دیکھی اور ایک دم مؤدب نظر آنے لگا۔ اس نے دوسرے کمرے میں جا کر یہ ویڈیو کال اٹینڈ کی۔ کچھ الفاظ زویا کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔ یہ جان کر اس کی دھڑکنیں مزید بڑھ گئیں کہ وہ اپنے باس یعنی رونالڈو نمرسی سے ہی بات کر رہا ہے۔ اس کا اپنا نام مائیکل تھا اور اس کی حیثیت غالباً نمرسی کے دستِ راست کی تھی۔

دو چار منٹ بعد وہ موبائل فون سمیت زویا کے سامنے آ گیا...... اس نے موبائل زویا کے ہاتھ میں تھمایا۔ اسکرین پر جو شخص نظر آیا، وہ یقیناً نمرسی ہی تھا۔ اس کا بالوں سے بھرا ہوا بالائی جسم بالکل عریاں تھا۔ گلے میں سونے کی بنی ہوئی ایک صلیب لٹک رہی تھی۔ اس کا بہت بڑا چہرہ سوجا ہوا تھا اور آنکھوں میں ایک لرزہ خیز سی مکاری کروٹیں لے رہی تھی۔ اس سے پہلے زویا نے بس ایک دوبار ہی نمرسی کو دیکھا تھا اور وہ بھی دور سے...... یا پھر اخبار وغیرہ میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک دبنگ شخص تھا۔ زویا نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ ہر اتوار کو باقاعدگی سے گرجا جاتا ہے اور خود کو مذہبی بھی سمجھتا ہے مگر اس کی شخصیت پر دور دور تک مذہب یا اخلاقیات کا سایہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کسی سینٹ کا پیروکار بھی کہلاتا تھا۔ شاید اس کا سینٹ بھی اسی کی طرح کا اخلاق باختہ تھا۔

وہ بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''ڈیئر بے بی! لگتا ہے کہ تم لوگوں نے پہلی سزا سے کچھ سبق نہیں سیکھا...... اور اگر سیکھا ہے تو بھول گئے ہو۔ تمہارے اندر کا ملاوٹی خون پھر اچھالے مار رہا ہے اور تم اپنے اس پاکستانی عاشق کے ساتھ سونے کے لیے پھر سے تڑپنا شروع ہوگئی ہو۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے سر! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں......''

''اور میں بھی بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں کہ میں اپنا حساب کتاب ادھورا نہیں چھوڑتا...... اور پھر ایسی صورت میں کہ میرا مقروض دیدہ دلیری سے خود ہی چل کر آئے اور میری ناک کے عین نیچے خرمستیاں شروع کردے...... کہاں ہے وہ؟''

''میں سچ کہتی ہوں، مجھے کچھ پتا نہیں۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ اسے روتے دیکھ کر عینی نے بھی سسکیاں لینا شروع کردی تھیں۔

''تمہاری بچی بہت پیاری ہے۔ یسوع اسے لمبی عمر دے۔ میں تمہیں ایک دو گھنٹوں کا وقت دیتا ہوں۔ اپنا اچھا بُرا ٹھیک سے سوچ سمجھ لو۔'' پھر اسے جیسے ایک دم کچھ یاد آیا۔ وہ اپنے دستِ راست مائیکل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بے بی کا سیل فون اچھی طرح دیکھو، ہوسکتا ہے کہ اس میں عاشقِ باکمال کی کوئی کال وغیرہ موجود ہو۔''

''اوکے سر۔'' سیاہ چشمے والے مائیکل نے ادب سے جھک کر کہا۔

نمرسی نے اپنی بالوں بھری کلائی گھما کر رسٹ واچ دیکھی اور زویا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بے بی! میں تمہیں دو گھنٹے دے رہا ہوں۔ اس وقت کے اندر اندر کوئی پیش رفت ہوجانی چاہیے۔'' اس کے ساتھ ہی اسکرین پر سے نمرسی کی شبیہ اوجھل ہوگئی۔ اس نے کال منقطع کردی تھی۔

زویا نے منت سماجت کی تو مائیکل نے اس کی بچی واپس اس کی گود میں ڈال دی۔ ہیری بڑی توجہ سے زویا کے سیل فون کی چھان بین کرنے لگا۔ تیسرا شخص خود ہی فریج سے کچھ سوفٹ ڈرنکس اور فروٹ نکال کر لے آیا تھا۔ اگر کوئی اس فلیٹ میں آ بھی جاتا تو یہی سمجھتا کہ یہ زویا کے مہمان یا ملنے جلنے والے ہیں۔

ہیری نے زویا کا فون مائیکل کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے 18 گھنٹوں میں یہ تین نمبرز ایسے ہیں جن سے کال آئی ہے اور وہ Save نہیں ہیں۔ مجھے اس نمبر پر شک ہو رہا ہے۔ کل رات چار بجے اوپر تلے تین مسڈ کالز اس نمبر سے آئی ہیں۔'' ہیری نے ایک نمبر پر انگلی رکھی۔

زویا کے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ یہی شامیر کا نمبر تھا۔

''کون ہے یہ؟'' مائیکل نے کرخت آواز میں زویا سے پوچھا۔

''مجھے...... ٹھیک سے معلوم نہیں۔ مم...... میں سو رہی تھی۔''

''چلو کال کرو اس پر۔'' مائیکل نے زویا کے تاثرات دیکھنے کے بعد تحکم سے کہا۔ ''اور خبردار کوئی ہوشیاری نہیں چلے گی۔ جو بھی ہے اس سے بالکل نارمل لہجے میں بات کرنی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی مائیکل نے زویا سے بچی واپس لینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

زویا نے بے تابی سے عینی کو سینے سے چمٹا لیا۔ وہ بلک کر بولی۔ ''نہیں...... تم جو کہو گے میں ویسا ہی کروں گی۔''

مائیکل چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ پھر ذرا دھیمے لہجے میں بولا۔ ''تو چلو...... کرو کال۔''

زویا کا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ شامیر کا نمبر ہے اور وہ فوراً اس کی کال ریسیو کرے گا۔ وہ خطرے میں تھا اور وہ اس کی وجہ سے خطرے میں تھا۔ کاش وہ یہاں نہ آیا ہوتا۔ کاش اس نے راکھ میں دبی ہوئی آگ کو دبا ہی رہنے دیا ہوتا...... اس نے لرزتے دل کے ساتھ نمبر پریس کیا۔ دوسری طرف سے جرمن زبان میں کہا گیا۔ ''رابطہ ممکن نہیں۔ آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔'' یہ ساڑھے نو بجے کا وقت تھا۔

☆☆☆

پیڈربورن کے ٹرین اسٹیشن پر گھڑی کی سوئیاں ساڑھے نو کا وقت بتا رہی تھیں۔ ابھی آٹھ دس منٹ پہلے مارگریٹ کے مشورے پر شامیر نے اپنا موبائل فون آف کردیا تھا۔

مارگریٹ کا خیال تھا کہ چونکہ شامیر نے زویا کو کالز کی تھیں اس لیے اس کا نمبر زویا کے پاس موجود ہے۔ اگر شامیر کا تعاقب کرنے والے زویا تک پہنچ گئے تھے تو پھر وہ شامیر کے فون نمبر کے ذریعے اس کی موجودہ لوکیشن ٹریس بھی کرسکتے تھے۔ شامیر سخت بے چین تھا۔ اگر اسے اور زویا کو فل مون میں اکٹھے دیکھا گیا تھا تو عین ممکن تھا کہ زویا بھی کسی مشکل میں ہو۔

شامیر نے مارگریٹ سے کہا کہ وہ بذریعہ کار واپس فرینکفرٹ چلی جائے۔ ساتھ ہی اسے یہ ہدایت بھی کی کہ فی الحال وہ چینل کے آفس نہ جائے بلکہ روپوش ہی رہے۔ اس نے کہا۔ ''میں باس عظمت سلطان صاحب سے بات کرلوں

گا۔ سمجھ لو کہ تم ان کی اگلی ہدایات تک رخصت پر ہی ہو۔ اپنے پاؤں کی موچ ٹھیک کرواور گاڑی کی مرمت کے لیے بھی وہ تمہیں کچھ رقم بھجوائیں گے۔ میں اب اپنی خالہ اور کزن کے پاس واپس اسٹریٹ پولیٹن ویانا جارہا ہوں۔‘‘

مارگریٹ واپس چلی گئی۔ شامیر ویانا والی ٹرین پر بیٹھ گیا۔ بے شک وہ جرمنی کی سرحد پار کر کے آسٹریا جارہا تھا مگر یہ اتنا ہی آسان تھا جیسے ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانا۔ پورے یورپ میں یہی صورتِ حال تھی۔ یوریل (ٹرین) میں اکثر اوقات مسافروں کے پاسپورٹ تک چیک نہیں ہوتے تھے۔ ٹرین ویانا کی طرف رواں تھی اور شامیر کا دماغ گھڑدوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ کسی وقت اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ اس نے یہاں آکر اور زویا کے بارے میں جستجو کر کے زویا کے حق میں بُرا کیا ہے۔ اسے پرانے معاملوں کو ہوا دینا ہی نہیں چاہیے تھی۔ جو کچھ دل پر بیت رہی تھی، اسے خود ہی جھیلتے رہنا چاہیے تھا۔ زویا کی سردمہری نے بھی اسے بہت شاک پہنچایا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گزرے وقت کے ساتھ وہ بہت کچھ بھول چکی ہے اور اب زندگی کے نئے مسائل، نئے غم اور نئی راحتیں اس کی ترجیح ہیں، پھر اسے بار بار اموخالہ کا خیال بھی آتا تھا۔ وہ اس صورتِ حال اور شامیر کی موجودہ مصروفیات سے ناخوش تھیں۔ جلد از جلد پاکستان واپس چلے جانا چاہتی تھیں...... تو کیا اسے ان کی بات مان لینی چاہیے؟ رختِ سفر باندھ لینا چاہیے؟ لیکن ایک بات طے تھی۔ وہ زویا کی خیر خیریت جانے بغیر پاکستان واپس نہیں جاسکتا تھا۔

اس نے ایک بار پھر سوچا کہ اپنا فون آن کر کے زویا سے رابطہ کرے۔ اس نے فون پاکٹ سے نکال بھی لیا، مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ آرام دہ، ہائی اسپیڈ ٹرین جیسے ہوا میں تیرتی ہوئی سرسبز میدانوں میں سے گزر رہی تھی...... یہ ٹرین اسے اموخالہ اور فارہ وغیرہ کی طرف لے جارہی تھی۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ فارہ بے قراری سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ شامیر کو غائب ہوئے آج تیسرا روز تھا، وہ کال بھی اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ امو بھی اس سے رابطہ نہیں کر پائی تھیں۔ شروع شروع میں فارہ صرف امو کی خوشنودی کے لیے شامیر کی طرف متوجہ ہوتی تھی اور اس سے قربت بڑھانے کی کوشش کرتی تھی، مگر اب یہ بتدریج اس کا اپنا مسئلہ بھی بن گیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی انا مجروح ہوئی ہے۔ اس میں ایک ضد سی پیدا ہوگئی تھی شامیر کو زیر کرنے کی......

اسے اپنا اسیر بنانے کی...... اس نے کندھے سے دوپٹا اتار کر ایک طرف پھینکا اور خود کو قدِ آدم آئینے میں دیکھنے لگی۔ کمان کی طرح کسا ہوا بدن، دہکتے ہوئے رخسار، نوخیز شباب اور گہری سیاہ آنکھیں، جن میں سے امنگ ترنگ چھلکتی تھی۔ کیا کمی تھی اس میں جو وہ اسے نظرانداز کر کے اس دوغلی نسل کی بے وفا، شادی شدہ زویا کے پیچھے بھاگا پھر رہا تھا۔

اسے پیڈر بورن کی وہ رات یاد آئی جب امو کی ہدایت کے مطابق اس نے شامیر سے معافی مانگی تھی۔ معافی مانگنے کی آڑ میں وہ اس کے بہت قریب چلی گئی تھی۔ ایک حسبِ منشا سا ماحول بن گیا تھا اور تب ہی وہ منحوس فون کال آگئی جس کی وجہ سے شامیر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

وہ مناظر یاد آئے تو اندر کی مایوسی اور طیش کے سبب اس کا سینہ جلنے لگا...... اس نے اپنے لمبے ریشمی بالوں کو کھول دیا اور چند گہری سانسیں لے کر ٹھنڈے پانی کا گلاس پیا۔ وہ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ شامیر ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے لیونا برگ سے واپس لوٹا تھا۔ اس کا موقف وہی پہلے والا تھا...... وہ چینل کے کام کے لیے گیا ہوا تھا...... فارہ اچھی طرح جانتی تھی اور امو کو بھی یقین ہو چکا تھا کہ اس نے زویا کو ڈھونڈ لیا ہے اور اب اس کے چکر میں دیوانہ ہوا پھرتا ہے۔ فارہ نے ایک اور گہری آتشیں سانس لی۔ اس کے اندر کی اتھل پتھل ایک زلزلے کی سی صورت اختیار کر چکی تھی۔ وہ شامیر کو ''فتح'' کرنے کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہوگئی تھی۔

ایک ہیجان تھا جو اسے ہر مصلحت سے بیگانہ کر رہا تھا۔ شامیر اور امو ساتھ والے کمرے میں محوِ گفتگو تھے۔ فارہ نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ ابھی آٹھ ہی بجے تھے۔ مقامی معمولات کے مطابق تو ڈنر کا وقت ہو چکا تھا مگر امو، شامیر اور فارہ کے مطابق ابھی ڈنر میں ایک ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔

تین چار گھنٹے جیسے پلک جھپکتے میں گزر گئے تھے۔ اب گھڑی کی سوئیاں رات ساڑھے گیارہ کا وقت بتا رہی تھیں۔ ایک تیز سرد ہوا کے باعث گھر کی کھڑکیوں میں ہلکا سا ارتعاش موجود تھا۔ افشاں کے کمرے کی بالکونی کی طرف بس ایک لائٹ آن تھی، باقی سارا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اہلِ خانہ، دیر ہوئی سو چکے تھے۔ فارہ آہستگی کے ساتھ شامیر کے بیڈروم میں داخل ہوئی۔ اس نے بیڈ کی ایک طویل چادر اوڑھ رکھی تھی۔ سفر کا تھکا ہارا شامیر سنگل پلائی والا کمبل لیے سو رہا تھا۔ اندرونی روشنی مدھم تھی۔ فارہ نے دروازہ اندر سے بولٹ کیا۔ جو چادر لپیٹ رکھی تھی وہ اتار پھینکی۔ وہ نہایت مختصر بلکہ برائے نام لباس میں تھی۔ اسی طرح وہ شامیر کے قریب چلی گئی۔ وہ ہانپی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آتشیں لہر نظر آرہی تھی۔

شامیر غنودگی کی کیفیت میں تھا...... یا شاید وہ نیند سے غنودگی کی کیفیت میں آیا تھا۔ اس کی سماعت ہوا کی دورافتادہ ''سائیں سائیں'' سن رہی تھی۔ اسے لگا کہ وہ کسی سمندر میں ہے، ایک خوبصورت تفریحی ''کروزر'' پر ہچکولے کھا رہا ہے۔ پوری رات کا چاند گہرے بادلوں کے پیچھے ڈوب اور ابھر رہا ہے۔ کوئی اس کے بہت قریب ہے۔ اس کی سانسیں اس کی گردن سے ٹکرا رہی ہیں۔ کون ہے یہ؟ شاید زویا ہی ہے۔ اس کے دل کا انمٹ داغ اس کے ارمانوں کی معراج، اس کی حسرتوں کا عروج۔ وہ اس سے پیوست تھی۔ وہ اس کے بالوں کو بوسے دینے لگا۔ اس کے چہرے کو محسوس کرنے لگا۔

''عینی کو کہاں چھوڑ آئی ہو؟'' اس نے لڑکھڑاتی ہوئی غنودہ آواز میں پوچھا۔

''کون عینی؟''

اسے عینی کا پتا نہیں تھا۔ یہ کون تھی؟ یہ یہاں کیسے چلی آئی تھی؟ اس نے اپنی پلکیں اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کی پلکوں پر بہت بھاری بوجھ رکھا تھا۔ وہ انہیں اٹھا نہیں پا رہا تھا۔ ٹھیک سے کچھ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ ہاں اس کا دھندلایا ہوا ذہن یہ تو جان گیا تھا کہ وہ کہیں اور نہیں، اپنے بیڈروم میں ہی ہے اور جس کو وہ اپنی بانہوں میں لیے ہوئے تھا، وہ زویا نہیں ہے۔

اس نے ایک دیوانی کوشش کی اور اپنے ذہن کو جگانے اور آنکھوں کو کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ ''فارہ! یہ کیا حرکت ہے؟ یہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ طیش میں بولا اور اسے دھکیل کر دور ہٹایا۔

پھر وہ کمبل سے نکل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چند قدم آگے جا کر اس نے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کمرے کی روشنیاں آن کر دیں۔ اس دوران میں فارہ نے بیڈ سے اتر کر وہ چادر دوبارہ اپنے گرد لپیٹ لی تھی جسے لپیٹ کر وہ یہاں آئی تھی۔ چند سیکنڈ تک دونوں ساکت نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ فارہ کے چہرے پر اب شدید جھلاہٹ اور غصے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچے اور تیزی سے رخ پھیر لیا، ایسا کرتے ہوئے اس کے لمبے بالوں نے ایک غصیلا ہلکورا لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ کمرے سے باہر تھی۔

شامیر جیسے بے دم سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک حیرت آمیز طیش کے سبب اس کا سر چکرا رہا تھا۔ یہ سوچ کر

اس کا دل بیٹھنے لگا کہ کچھ دیر پہلے عجیب طرح کی مدہوشی کے عالم میں وہ کس طرح کے ''رویے'' کا مظاہرہ کررہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ابھی اسی وقت امو خالہ کو جگائے اور انہیں بتائے کہ فارہ کس طرح اپنی حدوں کو پھلانگ رہی ہے......

مگر اس طرح خالہ کے سامنے جا کر، ان کی بیٹی کے بارے میں بات کرنا شامیر کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ایسا کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا جس سے خالہ کو تکلیف پہنچے۔ ''آہ'' وہ ایک بات سوچ کر کراہ اٹھا۔ کیا فرق رہ گیا تھا اس لڑکی میں اور لبنانی خشامہ جیسی ''سیکس ورکر'' میں؟ بلکہ وہ تو بلانے پر آتی تھی، یہ بن بلائے ''اپنا آپ'' ہتھیلی پر لیے ہوئے تھی۔

اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور ماتھا پکڑلیا۔ دماغ میں دھندسی بھری ہوئی تھی اور پلکوں پر تاحال بوجھ تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ڈنر کے دوران میں اس نے جو سوفٹ ڈرنک لیا تھا اس میں ایک چھوٹی سی نشہ آور گولی موجود تھی۔ شامیر کے لیے اس کیف کا انتظام فارہ نے ہی کیا تھا......

☆☆☆

فارہ کمرے میں بند صبح سے رورہی تھی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا تھا اور آنکھیں ورم زدہ تھیں۔ امو خالہ جانتی تھیں کہ یہ سب کیوں ہے؟ یہ سب شامیر ہی کی وجہ سے تھا۔ وہ مسلسل اسے دھتکار رہا تھا۔ کل رات بھی یقیناً کوئی ایسی ہی بات ہوئی تھی جس کے سبب پچھلے اٹھارہ گھنٹے سے فارہ کمرے سے نکلی تھی اور نہ اس نے کچھ کھایا پیا تھا۔ شامیر کا موڈ بھی بگڑا بگڑا تھا۔

ثمینہ (امو خالہ) کو شامیر اچھا لگتا تھا مگر صرف ایک داماد کے طور پر۔ اگر وہ داماد نہیں تھا تو پھر کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ایسے میں ثمینہ کو شامیر کا مرحوم باپ یاد آجاتا تھا۔ اس نے جس طرح فارہ کی بڑی بہن شائلہ کو بہو بنانے سے انکار کیا تھا اور پھر اس انکار پر ڈٹ گیا تھا، وہ ثمینہ کبھی بھول نہیں سکی تھی...... اور بات صرف شائلہ کی ہی نہیں تھی...... ثمینہ خالہ کا خیال یہی تھا کہ شامیر کی پوری فیملی میں ایک خاص قسم کی اکڑ اور نخوت پائی جاتی تھی۔ اس فیملی میں ایک خاص قسم کی عادت تھی جو عموماً دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہ لوگ قریبی عزیزوں کی لڑکیوں کو بہو نہیں بناتے تھے، ہاں اپنی لڑکیوں کو کھاتے پیتے رشتے داروں میں بیاہ ضرور دیتے تھے۔ پتا نہیں، یہ کیا سائیکی تھی؟ ثمینہ خالہ کا گمان تھا کہ یہ احساسِ کمتری ہے۔ وہ بیٹیوں کو فالتو چیز سمجھتے ہیں اور بیٹوں کے لیے برادری کے باہر سے بہتر لڑکیاں لانا چاہتے ہیں۔ بس یہی گمان یا پھر بدگمانی تھی جس کے سبب ثمینہ خالہ کی ضد اور نفرت کو مزید ہوا ملی تھی۔

انہوں نے جیسے تہیہ کررکھا تھا کہ شامیر کو داماد بنا کر چھوڑنا ہے۔ بے شک فارہ عمر میں شامیر سے دس برس چھوٹی تھی، مگر انہوں نے بڑے تحمل کے ساتھ بتدریج اپنے منصوبے پر عمل کیا تھا...... یہاں یورپ آنے سے پہلے انہیں یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں سترّ اسّی فیصد تک کامیاب ہوچکی ہیں، مگر پھر یہاں آنے والا یہ ''منحوس پروگرام'' آڑے آگیا تھا۔

ثمینہ خالہ کے خیال میں زویا ایک زہریلی ناگن تھی جو ایک بار پھر شامیر کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ ثمینہ خالہ کو زویا سے بھی زیادہ غصہ شامیر پر تھا۔ وہ ان کی بیٹی کو مسلسل ریجیکٹ کررہا تھا۔ آج کل کسی وقت تو ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس کا منہ نوچ لیں۔

''اپنے باپ پر ہی گیا ہے۔'' وہ فرسٹریشن کے عالم میں بے ساختہ بڑبڑائیں۔ ان کے سر میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ آج وہ شامیر سے حتمی بات کرنے کا تہیہ کرچکی تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد انہوں نے اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔

''شامی! مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی، کبھی بھی نہیں تھی۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ پچھلے تین دن تم کہاں رہے ہو؟''

''امو! میں آپ کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا، لیکن موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا...... لیکن......''

''لیکن کیا؟''

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہا پھر نظریں جھکائے جھکائے عاجزی سے بولا۔ ''اگر آپ کو محسوس نہ ہو تو ایک بات آپ بھی مجھے بتادیں۔ یہ بات کافی عرصے سے میرے ذہن میں اٹکی ہوئی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ جیسی ہستی کے حوالے سے میں اپنے دل میں کوئی ''ان کہی'' رکھوں۔''

امو خالہ نے مضطرب انداز میں چونک کر شامیر کی طرف دیکھا، پھر سنبھل کر کہا۔ ''ہاں...... جو کہنا چاہتے ہو کہہ دو۔''

وہ بدستور نظریں جھکائے ہوئے گویا ہوا۔ ''امو! تین ساڑھے تین سال پہلے جرمنی سے ایک جین نامی لڑکی پاکستان گئی تھی۔ وہ میرا پوچھتی ہوئی ہمارے گھر تک بھی پہنچی تھی...... اس نے آپ کو......''

''بس......'' امو خالہ نے تیزی سے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ''آخر دل کی بات تمہاری زبان پر آہی گئی نا۔'' ان کا

چہرہ لال بھبوکا ہوگیا اور آنکھوں میں آتشیں نمی چمک گئی۔

''بس ایک یہی دن دیکھنا باقی رہ گیا تھا مجھے...... میرا بیٹا تھانیدار بن کر مجھ سے ہی سوال کرے گا، مجھے ہی کٹہرے میں کھڑا کرے گا۔ مجھ سے پوچھے گا کہ میں نے اس سے دھوکا کیوں کیا؟ میں نے کیوں نہ اسے من چاہی راہوں پر چلنے دیا؟ کیوں نہ واپس جرمنی جانے دیا؟ اس عیار، ضدی لڑکی کا کھلونا بننے دیا۔ کیوں نہ اس کے گھر والوں کی سازشیں کامیاب ہونے دیں......؟''

وہ غم و غصے کے عالم میں بولتی چلی گئیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے چل رہے تھے۔ وہ بار بار حسرت کے عالم میں اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتی تھیں اور کبھی ہچکیاں لینے لگتی تھیں۔ شامیر ہکا بکا تھا۔ اسے ایسے ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے پچھلے آٹھ دس برسوں میں کبھی اموخالہ کو ایسی کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔

روتے روتے انہوں نے شامیر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''معاف کردے بیٹا، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں خود کو تیرا سرپرست سمجھ بیٹھی تھی۔ تیرے اچھے بُرے کا سوچنے لگی تھی۔ بس مجھے معاف کردے اور اب مجھے اور فارہ کو پاکستان واپس جانے دے۔ تیرا جب تک دل چاہے یہاں رہ۔ میں اب تجھ سے کچھ نہیں کہوں گی......''

شامیر نے بے تاب ہوکر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ انہیں چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ تو اب بس ایک ہی بات کہے جارہی تھیں...... ''مجھے اور فارہ کو اب واپس جانا ہے، کل ہی یہاں سے واپس جانا ہے۔''

شامیر کے دل پر چوٹ پڑ رہی تھی، اس نے بمشکل اموخالہ کو سنبھالا۔ ان کے آنسو پونچھے، ان سے جوابی معافی مانگی...... اور ان سے وعدہ کیا کہ اب وہ بھی یہاں زیادہ دیر نہیں رکے گا۔ ممکن ہے کہ دو تین دن میں وہ اکٹھے یہاں سے روانہ ہوجائیں۔

اموخالہ چپ ہوگئی تھیں مگر اپنا چہرہ انہوں نے اب بھی پلو میں چھپا رکھا تھا۔

☆☆☆

زویا اپنے فلیٹ کے اندر انہی تین افراد کے گھیرے میں تھی۔ اس مہلک گھیرے میں اب اسے 36 گھنٹے سے زیادہ ہوچکے تھے۔ شامیر کہاں ہوگا؟ اس کے ذہن سے بار بار یہ سوال اٹھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ دعا نکلتی تھی کہ وہ یہاں سے جاچکا ہو۔ پاکستان روانہ ہوچکا ہو۔ پچھلے 36 گھنٹے میں سیاہ چشمے والے بدمعاش مائیکل کے حکم پر اس نے کم و بیش بیس دفعہ شامیر والا فون نمبر ملایا تھا۔ یہ نمبر ملاتے ہوئے ہر دفعہ اس کے دل کی گہرائی سے دعا نکلی تھی کہ نمبر بند ہو...... اور وہ بند ہی ملا تھا (ہر ٹرائی کے بعد زویا کا فون، مائیکل اس سے واپس لے لیتا تھا)

ان 36 گھنٹوں میں اس کی دوست حامدہ رضوان اور قریبی شہر ہیمبرگ سے ٹام کی کالز بھی آئی تھیں۔ مائیکل کی ہدایت کے مطابق اس نے نارمل انداز میں یہ کالز اٹینڈ کی تھیں۔ آج سہ پہر ایک پڑوسن ابلے ہوئے آلوؤں اور مشروم کی نمکین ڈش لے کر آئی تھی۔ زویا نے یہ ڈش دروازے پر ہی وصول کی تھی اور پڑوسن کو بتایا تھا کہ مہمان آئے ہوئے ہیں۔

عینی کو تھپک تھپک کر سلاتے ہوئے زویا نے ایک بار پھر وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ اسے لگتا تھا کہ گزرنے والے ہر منٹ اور گھنٹے کے ساتھ شامیر کے لیے خطرہ کم ہوتا جارہا ہے، یہ امید بڑھتی جارہی ہے کہ وہ پاکستان روانہ ہوچکا ہوگا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' مائیکل کی مکروہ آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ وہ قریب ہی صوفے پر ٹانگیں پسارے وھسکی سے دل بہلا رہا تھا۔

''میں اس کے سوا اور کچھ نہیں سوچ رہی کہ تم لوگوں سے میری اور میری بچی کی جان کیسے چھوٹ سکتی ہے۔''

مائیکل نے زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جان چھوٹنے کا بس یہی راستہ ہے کہ تمہارا عاشق اپنا فون آن کرلے اور تم اسے اپنے ساتھ کچھ ''رنگین وقت'' گزارنے کے لیے پھر یہاں بلالو۔ یا پھر کسی طرح وہ خود ہی تمہاری کشش سے مجبور ہوکر یہاں چلا آئے۔''

''تمہاری گندی زبان مجھے مسلسل تکلیف پہنچا رہی ہے اور تم لوگوں کو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

''حاصل کیے بغیر تو ہم یہاں سے جانے والے نہیں۔ چاہے مستقل طور پر تمہارے اس فلیٹ میں قیام کرنا کیوں نہ پڑ جائے...... ویسے ایک دوسرا امکان بھی ہے۔ ہم اپنے طور پر بھی اس لفنڈر کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ کیا پتا کہ تمہاری مدد کے بغیر ہی اس کا کھوج لگ جائے۔''

زویا ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ ان تینوں کی یہاں موجودگی اس کے ذہن میں مسلسل خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی تھی۔ بظاہر تو وہ شریفانہ لباس میں تھے اور مائیکل کے سوا ان کی شکل و صورت بھی عام ہی تھی لیکن حقیقت میں وہ کتنے خطرناک ہوسکتے تھے، یہ زویا ہی جانتی تھی۔ ابھی تک تو

وہ اپنی حدود کے اندر ہی تھے مگر کب کس وقت ان کے اندر کا شیطان انہیں کسی شیطانیت پر اکسا دیتا، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جو کچھ اس کی بہن کے ساتھ ہوا تھا، وہ مرتے دم تک نہیں بھول سکتی تھی...... اس کی بہن سے انسانیت سوز سلوک کرنے والوں میں یہ خبیث مائیکل بھی شامل تھا۔ وہ جب اسے دیکھتی تھی، اس کا دماغ کھول کر رہ جاتا تھا...... اور پھر فوراً ہی خوف کی سرد لہر سی جسم میں دوڑتی تھی۔

ننھی عینی، زویا کی بانہوں میں ہی سو گئی تھی۔ مائیکل نے گردن لمبی کر کے اسے دیکھا اور بولا۔ ”یہ سو گئی ہے۔ چلو، اٹھو اب...... کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر دو۔ تمہارے مہمان بھوکے ہیں۔“

کچن سامنے ہی تھا۔ وہ عینی کو کچن کے دروازے کے بالکل سامنے ہی بے بی کارٹ میں لٹا کر کچن میں چلی گئی۔ یہ تیسری مرتبہ تھا کہ اسے ان تینوں گھس بیٹھیوں کے لیے کھانا بنانا پڑ رہا تھا۔ یہ سب اسے قید بامشقت کی طرح لگ رہا تھا۔

اس نے آملیٹ کے لیے پیاز وغیرہ کاٹا۔ وہ جھلاہٹ میں پلیٹوں کو ادھر سے ادھر پٹخ رہی تھی۔ مائیکل کچن کے دروازے میں کھڑا تمسخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”مہمانوں کی تعداد کی وجہ سے تو پریشان نہیں ہو؟“

زویا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ ہنس کر کہنے لگا۔ ”ویسے تو میں اکیلا بھی تمہاری نگہداشت کے لیے کافی تھا لیکن ہر چیز کے کچھ منفی اور مثبت پوائنٹس ہوتے ہیں...... ہمارے باس کے ایک گرو ہیں، ہم نے انہیں کبھی دیکھا نہیں لیکن وہ باتیں بہت پہنچی ہوئی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کسی چھت کے نیچے جوان ”عورت مرد“ اکیلے ہوں تو ان کے دماغوں کے اندر ایک ایسا پرزہ کام کرنا شروع کر دیتا ہے جو عام حالات میں نہیں کرتا اور اس پرزے کی کارکردگی بڑی رنگین و سنگین ہوتی ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا تم۔“ اس کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔

”کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم مجھے کام کرنے دو اور اپنے دوستوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھو۔“

”بیٹھ جاتا ہوں، لیکن مجھے بات تو مکمل کرنے دو......“ وہ دروازے کی چوکھٹ سے کندھا ٹکا کر بولا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی پتلون کی جیب تھوڑا سا مزید ابھر گئی۔ اس جیب میں بھرا ہوا پسٹل موجود تھا اور یہ بات وہ کل صبح ہی جان گئی تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اب میرے دوستوں کے ساتھ ہونے کا فائدہ تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ تنہائی سے محفل بہتر ہے...... ویسے اگر تمہیں تین مہمانوں کی خدمت گراں محسوس ہو رہی ہے تو تھوڑا سا بوجھ تمہارے اوپر سے کم کر دیتے ہیں۔ جونی کچھ دیر بعد چلا جاتا ہے۔ وہ ایک دو دن سامنے والے گیسٹ ہاؤس میں بھی رہ سکتا ہے۔ باقی ہیری رہ گیا۔ وہ تو ویسے بھی تمہارا پرانا کرم فرما ہے۔ کسی وقت تمہارے ساتھ ایک ہی چینل میں کام کرتا رہا ہے۔ دوست تھا تمہارا۔“

”غدار تھا۔“ زویا نے تلخ لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ مائیکل جواب میں کچھ کہتا، اس کے اسمارٹ فون پر کال کے سگنل آئے۔ یہ اس کے باس نمرسی کی ویڈیو کال تھی۔ باس غصے میں بھرا ہوا ایک بیش قیمت صوفے پر بیٹھا تھا۔ ایک نوخیز اٹالین حسینہ اس کے عقب میں موجود تھی اور اس کے کندھے دبا رہی تھی۔ شاید ابھی کچھ دیر پہلے نمرسی کی کسی سے جھڑپ ہوئی تھی۔ خشونت کے تاثرات ہنوز اس کے چہرے پر موجود تھے۔ وہ خشک لہجے میں مائیکل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اس دوغلی نسل کی سورنی نے کچھ بکا یا نہیں؟“

”ابھی تک تو کچھ نہیں باس۔“

”تو تم وہاں صرف جھک مار رہے ہو؟“

”نہیں باس!“ مائیکل لرز کر بولا۔ ”یہ ابھی تک تو یہی کہہ رہی ہے کہ اسے کچھ پتا نہیں، بس میں چاہ رہا ہوں کہ گھی سیدھی انگلیوں سے ہی نکل آئے۔“

”وہ کمینہ کسی بھی وقت نکل جائے گا یہاں سے۔ اور یہ تمہارے لیے بڑی شرمندگی کی بات ہوگی۔“

”تو آپ کا کیا حکم ہے؟“

”حکم تو وہی ہے جو پہلے تھا۔ اس باسٹرڈ کو ایک یادگار سبق ملنا چاہیے۔ کم از کم اتنا تو ہونا چاہیے کہ وہ جھک کر بلی کی طرح میرے جوتے چاٹے بلکہ......“ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ایک توقف کے بعد ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ویسے کل سہ پہر کی ٹرین سے میں خود بھی فرینکفرٹ آنے کا سوچ رہا ہوں۔ تھوڑا سا کام ہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔“

کچن میں ڈبل روٹی سینکتے ہوئے زویا یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اس کا زرد رنگ کچھ اور زرد پڑ گیا۔

☆☆☆

اموخالہ کے آنسوؤں اور گریہ وزاری نے شامیر کے دل پر بہت اثر کیا تھا۔ دوسری طرف زویا سے مل کر اور اس

کے سرد مہر رویے سے اسے جو مایوسی ہوئی، وہ بھی کام دکھا رہی تھی۔ یہ ایسی مایوسی تھی جس نے شامیر کو بنیادوں سے ہلا دیا تھا۔ اس نے اپنی بچی کا ذکر کیا تھا، اپنے بدلے ہوئے حالات کا ذکر کیا تھا اور بڑی بے رحمی سے شامیر کو یہ بتا دیا تھا کہ وہ اب اس کے لیے ایک بیتی ہوئی کہانی ہے...... اس کے سینے میں زویا کی محبت کا جو چراغ جلتا تھا، وہ تو کبھی بجھ نہیں سکتا تھا، مگر اب وہ یہی چاہ رہا تھا کہ اس چراغ کو بے مہری اور بے مروتی کی ہواؤں میں پھڑ پھڑانے سے بچا لے اور واپس چلا جائے۔

واپس جانے سے پہلے اسے ایک کام تو بہر صورت کرنا تھا اور وہ یہ کہ ایک دفعہ زویا کی موجودہ صورتِ حال معلوم کرنا تھی۔ پتا چل جاتا کہ وہ کسی مصیبت میں تو نہیں ہے؟

یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ وہ اپنا فون آن کرے یا پھر کسی اور کے فون سے زویا سے بات کرنے کی کوشش کرے۔ اسے پھر اپنی دراز قد خیر خواہ جین یاد آئی، مگر اس سے رابطہ کرنے کے لیے بھی تو فون آن کرنا ضروری تھا اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے ویانا کے ایک قریبی قصبے ''وارسونا'' جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ نکل کھڑا ہوا۔ دو ٹرینیں بدل کر وہ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ''وارسونا'' پہنچ گیا۔ یہ ''ونڈ ملز'' یعنی پون چکیوں سے گھرا ہوا ایک دور افتادہ قصبہ تھا۔ چند اچھے ہوٹل بھی موجود تھے۔ ایک پارک میں بیٹھ کر اس نے اپنا نمبر آن کیا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ زویا پہلے کی طرح اس کی کال اٹینڈ نہیں کرے گی لہٰذا اس نے پہلے زویا کی قریبی دوست مسز حامدہ رضوان کا نمبر ملایا۔ حامدہ رضوان نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ دو تین رسمی جملوں کے بعد انہوں نے استفسار کیا کہ وہ ابھی تک پاکستان نہیں گیا؟ وہ بولا۔ ''بس جانے ہی والا ہوں جی۔ دراصل میں ایک بار زویا کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا۔ آپ کی اس سے بات ہوئی ہے؟''

وہ اطمینان سے بولیں۔ ''ہاں، ابھی آج صبح بھی ہوئی ہے۔ کیوں، تم اس طرح کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''آپ خود اس کے پاس گئی تھیں؟''

''نہیں فون پر بات ہوئی تھی۔'' وہ انگلش میں بولیں۔ ''وہ بالکل ٹھیک ہے بس بچی کو ہلکا سا بخار تھا۔ وہ بھی کل تک ٹھیک ہو جائے گی انشاءاللہ۔''

زویا کی خیریت جاننے کے بعد شامیر نے مسز حامدہ سے زیادہ بات چیت مناسب نہیں سمجھی۔ ویسے بھی مسز حامدہ کا لہجہ آج روکھا پھیکا سا تھا۔ اس کی وجہ یقیناً چار دن پہلے والی صورتِ حال میں پوشیدہ تھی (شامیر مسز حامدہ کے ذریعے ہی زویا کی ٹوہ لگانے میں کامیاب ہوا تھا)

شامیر نے اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ رات کے ساڑھے نو کا وقت تھا۔ اس نے سوچا وہاں اسٹریٹ پولیٹن میں یقیناً امو خالہ اور فارہ نے پھر سے پریشان ہونا شروع کر دیا ہوگا۔ اس نے فوراً ہی امو خالہ کا نمبر ملایا اور ان سے کہا کہ وہ اب بالکل فارغ ہو رہا ہے۔ دس پندرہ منٹ میں بینک کے آفس سے واپس روانہ ہو رہا ہے۔ وہ لوگ پیکنگ وغیرہ کر لیں۔ وہ ٹکٹ ری کنفرم کراتا ہوا آئے گا۔ کل کسی وقت نکل چلیں گے۔

امو خالہ خوش ہو گئی تھیں۔ اس گفتگو کے دوران میں ہی شامیر واپسی کی انٹرسٹی ٹرین میں سوار ہو گیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ فون کو دوبارہ آف کرنے سے پہلے کم از کم ایک بار زویا سے مختصر بات کرنے کی کوشش کرے مگر پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ ٹرین روانہ ہو چکی تھی۔ ابھی وہ فون آف کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کال کے سگنل آئے۔ وہ بے طرح چونک گیا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ یہ زویا کی کال تھی۔ اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو کون...... ہیلو۔'' اس نے بے تابی سے کہا۔

''میں زویا بول رہی ہوں۔'' چند سیکنڈ بعد ٹھہری ہوئی سی آواز آئی۔

''زویا تم ٹھیک تو ہو نا؟ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لیے حامدہ صاحبہ کو بھی فون کیا تھا۔''

''تم کہاں ہو شومیر؟'' دھیمی آواز میں پوچھا گیا۔

''ویانا کے آس پاس ہی ہوں......اور تم کہاں ہو؟''

''میں اپنے فلیٹ میں۔''

''زویا! میں نے پرسوں رات تمہیں کئی بار فون کیا۔ بیل جاتی رہی لیکن رابطہ نہیں ہوا۔ میں بہت ضروری بات کرنا چاہتا تھا، ورنہ شاید فون نہ کرتا۔''

''کک......کیسی بات؟''

''تمہارے اردگرد کوئی اور تو نہیں؟''

''نہیں......''

''زویا! تم سے ملاقات کے بعد میں پرسوں رات ہی لیونا برگ سے نکل آیا تھا۔ راستے میں ایک واقعہ ہو گیا بلکہ اسے سنگین واقعہ ہی کہنا چاہیے۔ کچھ لوگوں نے ایک وین میں میرا پیچھا کیا۔ میں تمہیں ڈرانا نہیں چاہتا لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ اسی رونالڈ ونمرسی کے لوگ ہوں گے۔ اگر یہ وہی کمینے تھے اور انہوں نے ہم دونوں کو اکٹھے بھی دیکھا تھا تو پھر میرا

یہ اندیشہ بجا تھا کہ وہ تم تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں تمہیں بار بار کال کرتا رہا۔''

دوسری طرف خاموشی کا لمبا وقفہ آیا۔ شامیر کو لگا کہ کہیں وہ فون بند تو نہیں کر گئی یا رابطہ تو منقطع نہیں ہو گیا۔

''ہیلو زویا...... ہیلو۔'' اس نے کہا۔

ننھی عینی کے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ ابھی لائن پر ہی تھی۔

''ہیلو زویا! تم سن رہی ہونا؟'' شامیر نے پوچھا۔

''ہاں سن رہی ہوں۔ مم...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''اس کا مطلب تو پھر یہی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے ہم دونوں کو اکٹھے نہیں دیکھا۔ اس سفید ویگن میں تین یا چار بندے تھے۔ بڑے خراب تیور تھے ان کے۔ اگر وہ کوئی عام وارداتیے ہوتے تو اس طرح خود کو خطرے میں ڈال کر مسلسل مجھے گھیرنے کی کوشش نہ کرتے۔ میں بمشکل ان سے جان چھڑا سکا تھا۔''

اس واقعے کے بارے میں دونوں کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔

تب زویا نے ایک توقف کے بعد دفعتاً پوچھا۔ ''کیا تم میرے پاس آسکتے ہو؟''

وہ ایک بار پھر حیران ہوا۔ سنبھل کر بولا۔ ''زویا! تم بالکل خیریت سے تو ہونا؟''

''یہ بات کتنی بار بتاؤں؟'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''خاص ہی ہے نا جو تم کو بلا رہی ہوں...... کب تک پہنچ سکتے ہو؟''

شامیر سوچ میں پڑ گیا...... پرسوں رات کو زویا کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ یوں لگا تھا کہ اس کی موجودگی میں وہ سخت مضطرب ہے۔ جلد از جلد شامیر کو خدا حافظ کہہ دینا چاہتی ہے مگر دو ہی دن بعد وہ اسے پھر اپنے پاس بلا رہی تھی۔

''کیا آنا بہت ضروری ہے زویا؟''

''آجاؤ...... تو اچھا ہے...... ایک دو باتیں کہنی ہیں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''او کے...... میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے میں تمہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کرتا ہوں۔''

چند فقروں کے تبادلے کے بعد کال اختتام پذیر ہو گئی۔ سبک رفتار جدید ٹرین ہوا کے دوش پر تھی۔ اپنا موبائل فون گود میں رکھے شامیر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ ایک محقق صحافی تھا۔ جستجو کی صلاحیت اس میں فطری طور پر موجود تھی۔ زویا سے بات کر کے اس کے اندر ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے زویا اپنی زبان نہیں بول رہی۔

کیا وہ سچ مچ کسی مشکل میں گرفتار تھی؟ وہ اس سے کیا خاص بات کرنا چاہ رہی تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس نے شامیر کے حوالے سے اپنے رویّے پر نظرِ ثانی کی ہو...... یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے بدبخت شوہر کے حوالے سے ہی کوئی اہم بات کہنا چاہتی ہو؟ کئی طرح کے سوالات ذہن میں الجھ رہے تھے۔ بہرحال ایک بات تو واضح طور پر اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ اگر زویا نے اسے لیونا برگ میں بلایا تھا تو اسے ہر صورت اس کے پاس جانا تھا۔

شامیر جس ٹرین پر سوار ہوا تھا، وہ اسپیشل ہائی اسپیڈ ٹرین نکلی۔ اس کی رفتار تقریباً 220 کلومیٹر فی گھنٹا تھی۔ ایک فائدہ شامیر کو یہ بھی ہوا تھا کہ اسے راستے میں ٹرین بدلنا نہیں پڑی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ڈیڑھ گھنٹے کے بجائے صرف 45 منٹ میں واپس اسٹریٹ پولٹن پہنچ گیا۔ یہ رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ امو خالہ کو اعتماد میں لے کر ان سے گزارش کرے گا کہ واپسی کے پروگرام میں پھر تھوڑی سی تاخیر ہو جائے گی۔ اسے چھ سات گھنٹے کا سفر کر کے واپس لیونا برگ جانا پڑ رہا ہے۔ تاہم وہاں سے واپسی کے فوراً بعد وہ پاکستان روانہ ہو جائیں گے۔ خالہ کے ساتھ پھر سے خیر سگالی والی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ خالہ اور فارہ کو اس نئے پروگرام پر شاک تو پہنچنا تھا مگر اسے امید تھی کہ خالہ اسے اتنی رعایت دے دیں گی۔

وہ اندازے سے قریباً پون گھنٹا پہلے ہی گھر پہنچ گیا تھا۔ بیرونی دروازے کی چابی اس کے پاس موجود تھی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ اسے پتا تھا کہ کم از کم امو خالہ تو ابھی تک جاگ رہی ہوں گی۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ وہ گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوا تو ایک کمرے سے امو خالہ کی آواز آئی۔ وہ فارہ سے بات کر رہی تھیں۔ لہجہ کچھ جھلایا ہوا تھا لہٰذا آواز قدرے بلند تھی۔

''فارہ! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے اپنی غلطی کو محسوس کیا ہے...... وہ اب فوراً واپس جانے کی بات کر رہا ہے۔''

فارہ کی غصیلی آواز ابھری۔ ''مائی فٹ...... یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ خبیث اس کی نس نس میں گھسی ہوئی ہے۔ آپ جتنا مرضی زور لگالیں، وہ باہر نہیں نکلے گی......''

''دیکھو فارہ! یہ سب وقتی ابال ہے۔ وہ یہاں سے چلا جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کی مت بڑی حد تک ٹھکانے آ گئی ہے۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے وہ ہم وہاں جا کر پوری کر لیں گے۔ بس تُو اپنا موڈ ٹھیک کر۔ اب وہ ایک آدھ گھنٹے میں پہنچ جائے گا۔ ہمیں پیکنگ وغیرہ کی طرف دھیان دینا چاہیے۔''

چند لمحے کے توقف سے فارہ کی تلخ آواز ابھری۔ ''دیکھیں ماما! میں یہ سچویشن اب مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ ناٹ ایٹ آل۔ اس بے لگام کے گھوڑے کو اگر آپ نے لگام ڈالنی ہے تو ابھی ڈالیں...... بس دو تین ہفتے کے اندر...... پاکستان جاتے ہی اس سے انگیجمنٹ کی بات کریں اور پھر ایک مہینے کے اندر اس کام کو نمٹا دیں۔''

امو خالہ نے فارہ کو پچکارا۔ ''میری چندا! اب ایسا ہی ہوگا۔ میں بھی وہی سوچ رہی ہوں جو تُو سوچ رہی ہے۔ تو اب فکر نہ کر۔ پاکستان جاتے ہی اسے انشاء اللہ سیدھا کر دوں گی۔ چل شاباش۔ اب آنسو پونچھ اپنے۔ چل میری رانی۔''

شامیر کی سماعت جیسے سنسنا اٹھی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ اپنے کانوں سے سن رہا ہے۔ کچھ عرصے سے امو خالہ کے حوالے سے اسے ایک دو شکوے تو پیدا ہوئے تھے مگر وہ اپنے اندر اس طرح کی سوچ رکھتی ہیں، اس نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا اور کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم بستر پر لیٹا رہا اور اس لب و لہجے کو اور ان باتوں کو جھیلنے کی کوشش کرتا رہا جو وہ ابھی سن کر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے۔ ایک پرانا زخم بھی جیسے رسنے لگا تھا۔ چار سال پہلے امو خالہ نے کتنی سخت دلی کے ساتھ اس سے اس کی زندگی کا ایک دلکش ترین امکان چھینا تھا۔

وہ سر پکڑے بیٹھا رہا اور اس بے پناہ دکھ کو جھیلنے کی کوشش کرتا رہا۔ بتدریج یہ دکھ ایک طرح کے غم و غصے میں بدل گیا۔ اس نے ایک فیصلہ کیا۔ تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے الماری کی ایک دراز کھولی۔ اس میں سے امو خالہ اور فارہ کے پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ نکالے۔ انہیں ایک لفافے میں رکھا۔ اپنے کاغذات دوسرے لفافے میں رکھ کر اپنے بیگ میں رکھ لیے۔ تب اس نے کزن افشاں کو کال کی اور اس سے کہا کہ وہ کسی کو بتائے بغیر خاموشی سے اس کے کمرے میں چلی آئے۔

وہ حیران ہو کر بولی۔ ''خیریت تو ہے شامی بھائی۔ آپ کب پہنچے۔ ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا ہوں۔ تم کسی کو بھی بتائے بغیر میرے کمرے میں آؤ۔ تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

دو منٹ بعد شامیر والے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور افشاں اندر آ گئی۔ شامیر کا گمبھیر موڈ دیکھ کر وہ ذرا سا چونکی۔ شامیر نے خالہ اور فارہ کے کاغذات والا لفافہ سامنے تپائی پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ''افشاں! یہ خالہ اور فارہ کے پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ ہیں۔ میرے جانے کے بعد انہیں دے دینا اور بتا دینا کہ میں فی الحال نہیں جا سکتا۔ مجھے ایک بہت ضروری کام پڑ گیا ہے۔ میں لیونا برگ جا رہا ہوں۔''

افشاں کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''شامی بھائی! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ آپ کی کسی بات کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ شام کو آپ جانے کے لیے پوری طرح تیار نظر آ رہے تھے...... اور اب؟''

''افشاں! پلیز مجھ سے سوال جواب مت کرو۔ بس میری اتنی سی مدد کر دو۔ میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔''

شامیر کے تاثرات دیکھ کر افشاں کو چپ سی لگ گئی۔ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''پلیز! میرے جانے تک کسی کو بتانا مت......''

افشاں سے اقرار لینے کے بعد اس نے اپنا سفری بیگ تھاما اور جس طرح خاموشی سے آیا تھا، اسی طرح باہر نکل گیا۔ اس کا رخ مین اسٹیشن کی طرف تھا۔

☆☆☆

شامیر کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد افشاں نے امو خالہ کو سب کچھ بتا دیا۔ فارہ بھی پاس ہی موجود تھی۔ امو خالہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ یہ سب کیا ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ کل تک تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ ابھی کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے اس نے واپس پاکستان چلنے کا بھی کہہ دیا تھا۔ شدید پریشانی اور غصے کے عالم میں انہوں نے شامیر کا نمبر ملایا مگر اس کا فون بند جا رہا تھا۔ وہ سٹپٹا کر رہ گئیں۔ انہوں نے فارہ اور افشاں کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیوں کر رہا ہے اس طرح؟'' وہ جیسے چلا اٹھیں۔

ان کی بلند آواز سن کر افشاں کی والدہ اور پھر والد بھی پہنچ گئے۔ ''جب وہ نکلا تھا تو تم نے فوراً کیوں نہیں بتایا؟'' خالہ ثمینہ نے جھنجلا کر افشاں سے پوچھا۔

''انہوں نے قسم دے دی تھی مجھے۔ میں کیا کرتی؟''

افشاں کے والد نے بھی شامیر سے رابطے کی کوشش کی مگر اس کا فون ہی آف تھا۔ فارہ نے سب کچھ سن لیا تھا مگر

بول کچھ نہیں رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر غصے سے کھولتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اتنی بے عزتی، ایسی توہین...؟ وہ کچھ دیر پہلے یہاں آیا تھا اور اس نے ان سے بات تک کرنا گوارا نہیں کی تھی۔ بس پاسپورٹ وغیرہ دیے تھے اور اسی حرافہ کے پیچھے لپک گیا تھا جو اسے مسلسل اپنے جال میں جکڑے ہوئے تھی، ایک آسیب کی طرح اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔

چند روز پہلے کے اس واقعے نے فارہ پر انمٹ نقوش چھوڑے تھے جب وہ اپنی ساری نسوانیت کو ایک طرف رکھ کر شامیر کے بہت قریب چلی گئی تھی۔ اس کے بستر پر جا پہنچی تھی مگر وہ صرف چکنا گھڑا ہی نہیں تھا، بے حد ڈھیٹ اور بے حس بھی تھا۔ غنودگی اور ایک طرح کے خمار میں ہونے کے باوجود وہ اپنے خول کے اندر ہی رہا تھا...... اور تب اس نے ایک بار پھر فارہ کو دھتکار دیا تھا۔

فارہ کو لگا جیسے طیش کے عالم میں اس کا پورا جسم چیخ رہا ہے...... ''نیچ باپ کا نیچ بیٹا، بد دماغ...... باسٹرڈ...... پتا نہیں کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔'' وہ دل ہی دل میں جیسے چلّا اٹھی۔ اس کے اندر کئی مہینوں بلکہ برسوں سے دھیرے دھیرے پروان چڑھنے والی ضد اور ٹھکرائے جانے کی اذیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی...... ''میں اسے نہیں بخشوں گی...... میں اسے اس طرح اس حرامزادی کی بانہوں میں نہیں جانے دوں گی۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی۔ وہ مجھے ذلیل کرتا رہا ہے، میں بھی اسے بدترین ذلت دوں گی......'' وہ بہ زبانِ خاموشی پکار اٹھی۔

اسے بچانوے فیصد یقین تھا کہ وہ زویا کے پیچھے لیونا برگ ہی روانہ ہوا ہے۔ اگر وہ بائی ٹرین جا رہا تھا تو پھر مین اسٹیشن کی طرف ہی گیا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے سیل فون پر مقامی ٹرینوں کا ٹائم ٹیبل دیکھا۔ سب سے پہلے جو ٹرین بارڈر پار کر کے لیونا برگ کی طرف جا رہی تھی، اس کا ٹائم رات ایک بج کر دس منٹ تھا۔ ابھی اس کے روانہ ہونے میں تقریباً 40 منٹ باقی تھے۔ یہاں سے اسٹیشن کا فاصلہ 20 منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ افشاں جو چھوٹی ٹوسیٹر کار استعمال کرتی تھی، اس کی چابی سامنے ہی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی تھی۔ مصمم ارادے کے ساتھ فارہ نے وہ چابی اٹھائی۔ شولڈر بیگ لٹکایا اور کسی کو بتائے بغیر عقبی دروازے سے نکل کر اور چھوٹا گیٹ کھول کر باہر سڑک پر آگئی۔ حسبِ رواج یہاں گاڑیاں گھروں کے بجائے سڑک کے کناروں پر ہی پارک کی جاتی تھیں۔ افشاں والی ٹوسیٹر بھی گھر کے سامنے ہی پارک تھی۔ وہ ایک دو بار افشاں کی موجودگی میں یہ کار ڈرائیو بھی کر چکی تھی۔ گاڑی کو کھولنے اور اسے اسٹارٹ کرنے میں فارہ کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ چند ہی لمحے بعد وہ اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔

فارہ کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ اگر شامیر اسے کہیں سڑک پر جاتا ہوا مل جاتا تو شاید وہ اس پر گاڑی چڑھانے سے بھی نہ چوکتی...... لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اسے سڑک پر نہیں ملے گا۔ وہ اب تک اسٹیشن پر پہنچ چکا ہوگا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ رکے گا نہیں۔ اس کے بدن میں ایک الاؤ سا دہک رہا تھا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی، ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ کو اپنی گلابی شال کے نیچے گھسایا۔ وحشت کے عالم میں اس نے اپنی گردن اور گردن سے نیچے کندھوں پر ناخنوں کی گہری خراشیں ڈال دیں۔ یقیناً خون رسنے لگا ہوگا، یہ ایک اذیت ناک فعل تھا مگر اسے نہ ہونے کے برابر تکلیف ہوئی۔ اس نے اپنی کلائی کو دو تین بار بڑے زور سے ہینڈ بریک کے لیور پر مارا۔ کانچ کی چوڑیوں نے ٹوٹ کر اس کی کلائی کو لہولہان کر دیا۔ میٹل کے دو ٹکڑے ٹیڑھے میڑھے ہوگئے۔ اس نے گلے کی مالا توڑ دی اور اپنے گریبان کو بھی کسی حد تک ادھیڑنے میں کامیاب رہی۔ وہ تہیہ کر چکی تھی کہ پلیٹ فارم نمبر 4 پر پہنچ کر شامیر کو ہنگامی طور پر اپنی گاڑی میں لائے گی۔ اسے کہے گی کہ وہ صرف دو منٹ کے لیے اس کی بات سن لے۔ جونہی وہ گاڑی کے اندر پہنچتا، وہ شال اتار کر شور مچائے گی اور دہائی دے گی کہ اس کے ساتھی نے اس پر مجرمانہ حملے کی کوشش کی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں کے قوانین کتنے سخت ہیں اور کسی مرد پر لگنے والا اس طرح کا الزام اسے کن مصیبتوں سے دوچار کر سکتا ہے۔ وہ جنونی کیفیت میں تھی۔ ہر اندیشے اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ چکی تھی۔ اس کی مطلب پرست والدہ نے کئی برسوں میں جو قطرہ قطرہ زہر اس کے اندر بھرا تھا، وہ آج ایک دریا کی طرح اچھالے مار رہا تھا۔ وہ اس قدر غضب ناک تھی کہ اگر بالفرض شامیر اس کے کہنے پر گاڑی میں نہ بھی آتا تو وہ وہیں پلیٹ فارم پر شور مچا کر اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کا پکا انتظام کر سکتی تھی۔

اور وہ اپنے پلان کے مطابق بالکل درست سمت میں جا رہی تھی۔ تقریباً یہی وقت تھا، جب شامیر اپنا سفری بیگ کندھے سے لٹکائے پلیٹ فارم نمبر 4 پر بیٹھا لیونا برگ کو جانے والی ''کونیکٹڈ'' ٹرین کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے کچھ

معلوم نہیں تھا کہ کون، کس ارادے سے اس کی طرف آرہا ہے۔ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا...... کار میں اس کی طرف آتی ہوئی فارہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔ مگر جو ہونے والا تھا وہ نہ شامیر سوچ رہا تھا اور نہ فارہ سوچ رہی تھی۔ یہ تقدیر تھی جو لوحِ محفوظ کے مطابق طے شدہ وقت پر، طے شدہ جگہ پر، منتخب شدہ فرد کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ بے شک وہ بے حد مصروف ہو، اس کے پاس ایک لمحے کا وقت نہ ہو، مگر وہ ہونی کی زبان بولتی ہے۔ بے مروتی سے مسکراتی ہے اور کہتی ہے۔ بس، رک جاؤ۔ سارے پروگرام ایک طرف رکھ دو۔ تمہارے شیڈول میں وقت نہیں لیکن میرے شیڈول میں تمہارے پاس وقت ہی وقت ہے...... اور یہ تقدیر اس سڑک کے اگلے چوراہے پر کھڑی تھی جس پر فارہ اڑی جارہی تھی۔ وہ بری ڈرائیور نہیں تھی لیکن ایک تو وہ بہت عجلت میں تھی دوسرے یہاں ''رائٹ ہینڈ ڈرائیو'' تھی۔ وہ چوراہے سے بائیں جانب مڑنے لگی تو اسے زبردست ''دھچکا'' لگا۔ ایک بڑی کار کو بچاتے بچاتے اس نے اپنی تیز رفتار ٹوسیٹر، فٹ پاتھ پر چڑھا دی...... اور ایک مجسمے کی پتھریلی فاؤنڈیشن سے جا ٹکرائی...... کار کا اگلا حصہ چکنا چور ہو کر پچک گیا، گاڑی میں ائر بیگ موجود نہیں تھا۔ فارہ کا سر سامنے والے حصے سے بری طرح ٹکرایا۔ وہ شدید زخمی ہو کر بے ہوش ہوگئی اور مڑے تڑے اسٹیئرنگ پر جھک گئی۔ چند ہی لمحے بعد پولیس کاروں کے ہوٹر سنائی دینے لگے۔

☆☆☆

شامیر اب لیونا برگ جانے والی ٹرین میں تھا۔ ٹرین ہوا کے دوش پر اڑی جارہی تھی۔ اب دن کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ جس رفتار سے یہ جدید ٹرین حرکت کر رہی تھی، اس سے زیادہ رفتار کے ساتھ اس کا دماغ بھی حرکت میں تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہاں لیونا برگ میں زویا کسی مشکل میں ہے۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ایک بار پھر زویا کی دوست نومسلم حامدہ سے بات کرے اور ان سے کہے کہ وہ خود زویا کے فلیٹ پر جائیں اور اس کی خیریت دریافت کریں، مگر اس میں بھی خطرات پوشیدہ تھے۔ اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔

شامیر کا فون مسلسل بند تھا۔ پتا نہیں کیوں زندگی میں پہلی بار اسے لگا تھا کہ وہ امو خالہ کی آواز سننا نہیں چاہتا، ان کے متوقع سوالوں کے جواب بھی وہ ہرگز دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سے جیسے ایک پردہ سا اٹھ گیا تھا۔ اس پردے کے اٹھنے کے بعد اسے خالہ اور فارہ کی صورتیں صاف نظر آنے لگی تھیں اور یہ ان صورتوں سے بہت مختلف تھیں جو وہ دیکھتا آرہا تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے اپنا فون آن کیا اور آن ہوتے ہی زویا کا نمبر ملا دیا۔ فوراً ہی زویا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہیلو......''

''ہیلو زویا! میں روانہ ہوگیا ہوں۔ رابطہ ٹرین سے اتر کر اب لیونا برگ والی ٹرین میں ہوں۔ امید ہے کہ گیارہ بارہ بجے تک لیونا برگ پہنچ جاؤں گا۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ یہ ''آک ورڈ'' سی خاموشی تھی۔ تب زویا نے کہا۔ ''شومیر! مم...... میں بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''میں بہت الجھن میں ہوں زویا۔ مجھے کوئی اشارہ تو دو۔'' پھر جیسے اچانک شامیر کے دماغ میں خیال آیا۔ وہ بولا۔ ''زویا! ہم ویڈیو کال بھی تو کر سکتے ہیں۔ میں تمہیں اور تمہاری بچی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اس نے تھوڑا سا توقف کیا اور ہکلا کر بولی۔ ''میرے سیٹ کا کیمرا کام نہیں کر رہا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں...... تم...... اس بات کی پریشانی بالکل چھوڑ دو۔''

وہ جو بھی کہہ رہی تھی، بہت سنبھل کر کہہ رہی تھی مگر اس کا لہجہ اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ کیمرا کام نہ کرنے والی بات بھی شامیر کو بالکل غلط لگی تھی۔

''زویا پلیز، مجھے کچھ اشارہ تو دے دو...... کہ کس طرح کی بات ہے۔ ورنہ میرا یہ سفر بہت دشوار گزرے گا......''

''شومیر! کہا ہے نا کہ کوئی بہت خاص بات نہیں ہے۔ بس تم سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے، اپنے رویے پر افسوس بھی ہے۔ بس غصے میں تمہیں طمانچہ مار دیا۔ اس کی بھی معافی مانگنی ہے۔ بس تم آجاؤ نا۔''

''طمانچہ؟'' شامیر نے کہا۔

دوسری طرف خاموشی رہی۔ ایک دم شامیر کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ زویا سے تلخ کلامی تو ہوئی تھی لیکن طمانچہ؟ وہ جلدی سے بولا۔ ''اوہ زویا! اب ان باتوں کو مت چھیڑو...... جو ہوگیا سو ہوگیا...... چلو...... باقی باتیں پہنچ کر ہو جائیں گی...... میں آرہا ہوں۔'' وہ عجیب تذبذب میں بولا تھا۔

دو تین رسمی جملوں کے بعد شامیر نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نے زویا کو بتا دیا تھا کہ وہ اب بوجوہ اپنا فون آف کر رہا ہے۔ فون آف کرنے کے بعد وہ بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا اور دو رویہ نشستوں کے درمیانی خلا میں ٹہلنے لگا۔ اس کے دل و دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ زویا نے طمانچے

کی بات کی تھی اور اس نے کبھی طمانچہ نہیں مارا تھا۔ یہ واضح طور پر ایک اشارہ تھا...... وہ کسی مصیبت میں تھی۔ کسی بڑی مصیبت میں تھی۔ پچھلی کال کے دوران میں بھی پتا نہیں کیوں اسے یہ شک ہوا تھا کہ شاید زویا اپنی بچی کے ساتھ کمرے میں اکیلی نہیں ہے...... اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ پولیس کو انوالو کرنا چاہیے، یا کسی اور کی مدد طلب کرنا چاہیے؟ زویا نے خود کو اپنے جنونی شوہر سے بھی چھپا رکھا تھا اگر پولیس انوالو ہو جاتی تو پھر سب کچھ منظرِ عام پر آ جاتا...... عظمت سلطان صاحب مدد کر سکتے تھے اور وہ اس طرح کہ ایک دو بندوں کو مدد کے لیے اس کی طرف روانہ کر دیتے۔ شامیر کو یہ بھی کچھ مناسب نہیں لگا۔ پتا نہیں کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ زویا کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اس معاملے میں کسی دوسرے کو انوالو نہ کرے۔

اس میں شبہے کی گنجائش کم ہی تھی کہ جن لوگوں نے لیونا برگ کے اس فلیٹ میں زویا کو چھاپ رکھا ہے، وہ نمرسی سے تعلق رکھتے ہیں اور انہی میں سے کچھ لوگوں نے تین دن پہلے سفید وین میں اس کا اور مارگریٹ کا تعاقب کیا تھا۔ یہ خطرناک لوگ تھے۔ اگر وہ نمرسی کے لوگ نہیں تھے تو بھی ان کی خطرناکی میں کوئی شک نہیں تھا۔ تو کیا وہ خالی ہاتھ، تن تنہا ان لوگوں کے سامنے جا کر خم ٹھونکے گا؟

وہ کیا کرے؟ اس کا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنا فون پھر آن کیا۔ وہ عظمت سلطان صاحب کو کال ملانا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ہی ایک اور کال آ گئی۔ یہ مارگریٹ کی آڈیو کال تھی۔ اس نے کہا۔ ”شامیر صاحب! فادر سے بات ہوئی ہے۔ وہ اس وقت بھی لائن پر ہی ہیں۔ آپ ان سے بات کر سکتے ہیں۔“

چند لمحے بعد لائن پر فادر جوناتھن کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ وہ شستہ انگلش میں بولے۔ ”ہیلو شامیر! گریٹ جرنلسٹ...... تم کیسے ہو؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں فادر۔ عرصے بعد آپ کی آواز سن کر بڑا اچھا لگا۔“

”مجھے بھی بہت اچھا لگا۔ اس لڑکی مارگریٹ نے تمہاری بہت تعریفیں کی ہیں۔“

”یہ آپ کی بھی بہت تعریفیں کرتی ہے فادر...... اور صرف یہی نہیں، سب ہی آپ کی تعریف کرتے ہیں...... چند روز پہلے ہم دونوں آپ سے ملنے آپ کے پاس ”برج برگ“ آ رہے تھے...... مگر پھر آ نہ سکے۔“

”ہاں، مجھے مارگریٹ نے اس بارے میں بتایا ہے۔ یسوع نے تمہیں ان خطرناک لوگوں کے شر سے بچا لیا۔ وہ اپنے نیک بندوں کی ایسے ہی حفاظت کرتا ہے۔“

”ہمیں لگتا ہے فادر! وہ فرینکفرٹ کے بدنام شخص رونالڈ ونمرسی کے بندے تھے۔ شاید یہ لوگ اب تک اس ناجائز پراپرٹی والے معاملے کو بھولے نہیں۔“

”بالکل، ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ کینہ پرور ہوتے ہیں۔“

فادر نے مہربان لہجے میں مارگریٹ اور شامیر کو بہت سی دعائیں دیں اور بولے۔ ”خدا تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ حادثے ہماری زندگی میں قدم قدم پر گھات لگائے ہوتے ہیں۔ تمہیں پتا چلا ہی ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے ڈکیتی کی ایک واردات میں زویا کی والدہ سارہ جیم کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ بیچاری ابھی تک پوری طرح صحت مند نہیں ہے۔ اوپر سے اس کو گمشدہ زویا کا دکھ بھی ہے۔ اس لڑکی نے بڑی نادانی کی ہے کہ شوہر کا گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔“

فادر جوناتھن کی بات سے اندازہ ہوا کہ انہیں ابھی تک زویا کے حوالے سے نئی صورتِ حال کا علم نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مارگریٹ نے شامیر کی ہدایت کے عین مطابق کسی کو زویا کی بازیابی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ فادر کو بھی نہیں۔ یہ ٹھیک ہی تھا۔

زویا کی والدہ کے ذکر پر فادر کو غالباً چار سال پہلے کے واقعات یاد آ گئے تھے۔ وہ چند لمحے توقف کر کے بولے۔ ”ان دنوں جو کچھ ہوا، وہ خدا کی مرضی تھی اور ہمیں اس کی مرضی کے سامنے اپنے سر خوش دلی سے جھکا دینے چاہئیں۔ ان دنوں یہ بات بھی مشہور ہوئی تھی کہ شاید تم نے زویا کی والدہ پر ہاتھ اٹھایا تھا لیکن میرا ماننا یہی تھا اور اب بھی یہی ہے کہ قصور شاید دونوں طرف ہی تھا۔ باہمی تکرار میں بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے ناخوشگوار واقعات ہو جاتے ہیں......“

”فادر! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ......“

”پلیز شامیر! اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں...... پلیز......“

شامیر خاموش ہو گیا۔ اس موقعے پر اس ٹیلی فونک کانفرنس میں تھوڑی سی گفتگو مارگریٹ نے بھی کی۔

فادر جوناتھن نے اچانک پوچھا۔ ”تم اس وقت کہاں ہو شامیر؟“

شامیر نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ ”محترم فادر! فی الوقت کہیں بھی نہیں ہوں۔ ویانا سے چلنے والی ٹرین میں

سوار ہوں۔ یہاں جرمنی میں ایک ضروری کام تھا۔ میونخ کے قریب سے گزر رہا ہوں۔ ابھی پتا نہیں کہ کہاں رکنا ہے اور کہاں پہنچنا ہے۔ اگر لیونابرگ کی طرف آنا ہوا تو آپ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا۔''

''مجھے بہت خوشی ہوگی۔ چار سال پہلے بھی تم سے ملنا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ تم ان مسلم لوگوں میں سے ہو جو مذہبی شدت پسندی سے بہت دور ہوتے ہیں...... دوسروں کی بات تحمل اور توجہ سے سننے والے لوگ مجھے ہمیشہ سے بہت اچھے لگتے ہیں۔ دراصل یہ تنگ نظری اور تنگ ذہنی ہی ہے جس نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے.....'' پھر انہوں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''میرے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو مجھے ضرور یاد کرنا۔ میں برج برگ میں تمہارا اور مارگریٹ کا انتظار بھی کروں گا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ فادر۔'' شامیر نے تہِ دل سے کہا۔

مارگریٹ نے بھی شکریہ ادا کیا پھر یہ کال ختم ہوگئی۔

شامیر نے چینل کے کرتا دھرتا عظمت سلطان صاحب سے بات کرنے کے لیے فون آن کیا تھا کہ درمیان میں مارگریٹ کی کال آگئی۔ اب شامیر نے دوبارہ عظمت سلطان صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ رسمی کلمات کے بعد اس نے مختصر الفاظ میں تقریباً ساری صورتِ حال ان کے گوش گزار کردی۔ یہاں کے تشویش ناک حالات سن کر سلطان صاحب کے لب و لہجے سے تفکر جھلکنے لگا۔ وہ بولے۔ ''آخر وہی ہو رہا ہے نا، جس کا ڈر تھا۔ اسی لیے میں تمہیں کہہ رہا تھا کہ وہاں زیادہ دیر نہ رکو۔''

''آپ پریشان نہ ہوں جی۔ اگر مجھے کچھ کرنا ہی پڑا تو ہاتھ پاؤں بچا کر کروں گا۔ مجھے پتا ہے کہ میں پردیس میں ہوں اور کسی طرح کا بڑا پھڈا افورڈ نہیں کرسکتا۔ آپ بالکل بےفکر رہیں۔ بس میں چاہتا ہوں کہ احتیاطاً میرے پاس کوئی چھوٹا موٹا ہتھیار ہو۔ کوئی ایسی صورتِ حال بن ہی جائے تو اپنا دفاع کرسکوں۔''

''تو یہ ناجائز ہتھیار ہی ہوگا نا۔''

''جناب! یہاں اسلحے کے حوالے سے قوانین زیادہ سخت نہیں ہیں اور میں کون سا کوئی کلاشنکوف چاہ رہا ہوں۔ بس ایک چھوٹا سا پسٹل مل جائے جسے لباس میں آسانی سے چھپایا جاسکے۔''

وہ کچھ دیر تک شامیر کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے مگر جب انہیں یقین ہوگیا کہ وہ پیچھے نہیں ہٹے گا تو انہوں نے اس سے کہا کہ وہ سیدھا لیونابرگ جانے کے بجائے فرینکفرٹ میں ہی اتر جائے۔ چینل کی بےباک رپورٹر مارگریٹ بھی فرینکفرٹ میں ہی تھی۔ سلطان صاحب نے کہا۔ ''میں مارگریٹ سے رابطہ کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ تمہاری ضرورت پوری کرسکے۔ مگر یہ سارا رسک تمہارا اپنا ہوگا۔''

''آپ بالکل بےفکر رہیں۔'' شامیر نے کہا۔ ''آپ اور چینل اس سے بری الذمہ ہیں۔''

سلطان صاحب سے بات کر کے اس نے فون پھر بند کردیا۔ اس کا موڈ اتنا ابتر تھا کہ وہ اموخالہ یا فارہ کی کال سننا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے نشست سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ خود بھی اس ٹرین کے ذریعے سیدھا لیونابرگ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر نمرسی کے لوگ اسے ٹریپ کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ زویا کے فلیٹ میں ہی بیٹھ کر اس کی راہ تکتے رہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ لیونابرگ کے اسٹیشن پر پہنچتا اور وہ اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے وہاں موجود ہوتے۔ سلطان صاحب کے مشورے کے مطابق اس نے فرینکفرٹ میں ہی اترنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

جس وقت وہ فرینکفرٹ کے بڑے ریلوے اسٹیشن ''ہافٹ بانوف'' پر اترا، جولائی کی ایک چمکیلی سہ پہر نے اس شہرِ دل پذیر پر زندگی کی ساری رونقیں نچھاور کر رکھی تھیں۔ ہاں یہی جولائی تھا، یہی موسم تھا...... اور قریباً یہی وقت تھا جب وہ قریباً چار سال قبل، پہلی بار یہاں اترا تھا۔ فرینکفرٹ کی خوش رنگ فضاؤں میں بسنے والی زویا نے اسے خوش آمدید کہا تھا۔ اس کے گال کا ڈمپل، فرینکفرٹ کے ایک دلکش لینڈ مارک کی طرح محسوس ہوا تھا اور وہ بولی تھی۔ ''ہیلو سر! میرا نام زویا ہے۔ آپ یقیناً شومیر ہیں۔ میں آپ کو ریسیو کرنے آئی ہوں۔''

مگر آج اسے ریسیو کرنے کے لیے زویا نہیں مارگریٹ آئی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اسٹیشن سے نکل کر ایک قریبی ریستوران میں جا بیٹھے۔ مارگریٹ ابھی تک کچھ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ یہ چوٹ اسی واقعے کی نشانی تھی جب سفید وین والوں نے برج برگ کی سڑکوں پر شامیر اور مارگریٹ کا پیچھا کیا تھا۔ ریستوران کی دیوارگیر کھڑکیوں میں سے شامیر کو فرینکفرٹ کی بلندترین عمارت ''کامرس بینک ٹاور'' کی جھلک نظر آئی۔ کئی نہ بھولنے والے مناظر اس کے ذہن میں تازہ ہوئے اور دل کے درد کو بڑھا گئے۔ کامرس بینک کی چھت، جس پر موجودگی کے دوران میں اس نے اپنی زندگی کا سب

سے حسین تجربہ کیا تھا۔ زویا کا پیار کسی الہام کی طرح اس پر اترا تھا اور اس کے رگ و پے میں جذب ہو گیا تھا۔ وہ اس کے جسم و جاں کا جزولاینفک بن گیا تھا...... اور اب آس، انتظار اور تڑپ کی بھٹی میں تپ کر یہ پیار نہیں رہا تھا، کندن بن گیا تھا اور شاید اسی کندن کا دوسرا نام عشق ہے۔

ہاں، یہ عشق ہی تھا جو اس کو غیر معمولی طاقت بخش رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو وہ کرنے جارہا ہے، وہ آسان نہیں ہے۔ اس میں کئی خطرات ہیں، مگر اس نے سارے اندیشے بالائے طاق رکھ دیے تھے۔ یہ اندیشے بھی شاید اس نے خود بالائے طاق نہیں رکھے تھے، یہ عشق ہی تھا جو سب کچھ کر رہا تھا۔ اسے ایک بے خوف توانائی بخش رہا تھا۔ اس کا رویہ عظمت سلطان صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا تھا...... مارگریٹ کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا۔ مگر جو سمجھ میں آجائے وہ دیوانگی ہی کیا۔

اخبار کے کاغذ میں لپٹا ہوا بہت چھوٹا سا مگر طاقتور پسٹل ''کولٹ مستنگ'' مارگریٹ کے شولڈر بیگ میں موجود تھا۔ اس نے یہ پسٹل میز کے نیچے سے شامیر کو تھما دیا اور اس نے اسے سنبھال لیا۔

☆☆☆

ایکسیڈنٹ کے بعد فارہ کو مکمل بے ہوشی کی حالت میں نزدیکی اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچایا گیا تھا۔ وارڈ کے سامنے کہرام سا مچا ہوا تھا۔ خالہ ثمینہ چلّا رہی تھیں۔ اپنی رانیں پیٹ رہی تھیں۔ افشاں اور اس کے والدین انہیں سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فارہ کب گھر سے نکلی، اس نے کب گاڑی نکالی اور حادثے والی جگہ پر پہنچی۔ افشاں کو اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ہیجانی کیفیت میں یقیناً شامیر کے پیچھے اسٹیشن کی طرف ہی گئی تھی۔ یہ بات خالہ ثمینہ وغیرہ کی سمجھ میں بھی آچکی تھی۔ اسی دوران میں میڈیکل اسٹاف کی ایک لڑکی باہر آئی۔ افشاں کے والد اختر صاحب نے آگے بڑھ کر بے تابی سے پوچھا۔ ''بچی کی حالت کیسی ہے؟''

''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ سر کی چوٹ زیادہ شدید ہے۔ ٹیسٹ وغیرہ ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپریشن کی ضرورت بھی پڑے۔ والدہ کو سائن کرنے ہوں گے۔''

خالہ ثمینہ نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔ ان کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک سینئر ڈاکٹر بھی وہاں پہنچ گیا۔ یہ جرمن ڈاکٹر اختر صاحب کو ایک جانب لے گیا اور انگلش میں بولا۔ ''مریضہ آپ کی کیا لگتی ہیں؟''

''میری بھتیجی ہے۔'' اختر صاحب نے جواب دیا۔

''اس کے جسم پر کچھ ایسے نشان ہیں جن سے شک ہوتا ہے کہ شاید اس کی کسی سے لڑائی ہوئی ہے یا پھر...... اس سے زبردستی کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم نے پولیس کو بھی انفارم کیا ہے...... وہ لوگ ابھی آپ سے رابطہ کریں گے۔''

اختر صاحب حیران رہ گئے۔ یہ ڈاکٹر کیا بات کہہ رہا تھا۔ فارہ کی لڑائی کس سے ہونا تھی...... اور دوسری بات بھی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ گھر پر ہی موجود رہی تھی۔ اس حادثے سے تھوڑی دیر قبل شامیر گھر میں آیا تو تھا مگر وہ افشاں کے سوا کسی سے ملا نہیں تھا۔

یہ کیا معاملہ ہو سکتا تھا؟ وہ پُرتشویش انداز میں سوچنے لگے۔

دوسری طرف کونے میں کھڑی افشاں اندازاً بیسویں بار شامیر کے نمبر کو ٹرائی کر رہی تھی۔ پہلے فون بند جارہا تھا، پھر کچھ دیر کے لیے انگیج گیا تھا اور اب پھر بند ہو گیا تھا۔ وہ جھلّا کر رہ گئی۔

خالہ ثمینہ جانتی تھیں کہ وہ کس کو فون کر رہی ہے۔ وہ دہائی دینے والے انداز میں بولیں۔ ''وہ کیوں فون اٹھائے گا۔ وہ نہیں اٹھائے گا۔ میری بچی کو جان کے لالے ڈال کر وہ پھر دفعان ہو گیا ہے۔ پھر چلا گیا ہے اسی حرامزادی کے پیچھے۔'' وہ صدمے کے عالم میں اسے غائبانہ صلواتیں سنانا شروع ہو گئیں۔

ان کا رویہ افشاں اور اس کے گھر والوں کے لیے غیر متوقع تھا۔ افشاں کے والد ڈاکٹر سے بات کرنے کے بعد ایک گوشے میں گم صم کھڑے تھے۔

☆☆☆

آج تیسرا دن تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ ان تین دنوں کا ہر ہر پل زویا نے جیسے سولی پر لٹک کر گزارا تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی سامنے والے گیسٹ ہاؤس میں شفٹ ہو چکا تھا، مگر مائیکل اور ہیری وہیں تھے۔ رات کے سناٹے میں کسی وقت زویا کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دو خطرناک بھیڑیوں کے ساتھ ایک پنجرے میں بند ہے۔ وہ کسی بھی وقت حیوانیت پر اتر سکتے ہیں...... کسی وقت زویا کے خشک ہونٹ بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہلنے لگتے تھے اور وہ اپنی بچی کو کچھ اور بھی اپنے ساتھ پیوست کر لیتی تھی۔ کل رات وہ بات بھی ہو گئی تھی جس کا خوف اسے مسلسل ڈس رہا تھا۔ بالآخر شامیر سے کال مل گئی تھی اور ان بدمعاشوں کی ہدایت کے عین مطابق اس نے وہ سب کچھ بول دیا تھا جو وہ نہیں بولنا چاہتی تھی۔ بہرحال دوسری کال کے موقع پر اس نے تھوڑی سی ذہانت دکھائی تھی اور طمانچے والی بات کر کے شامیر کو اشارہ

دینے کی کوشش کی تھی۔ شامیر نے بھی ذرا سا ''لڑکھڑانے'' کے بعد فراست کا مظاہرہ کیا اور زویا کو یوں لگا تھا جیسے اس نے زویا کا دیا ہوا سگنل پک کر لیا ہے۔ پھر بھی ابھی یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اگر شامیر کو خطرے کا احساس ہو چکا ہے تو پھر وہ کیا کرے گا؟ وہ کس طرح سے اس کی مدد کی کوشش کرے گا؟ یہ سوال بار بار اس کے خوفزدہ ذہن میں ابھرتا تھا اور اس کی دھڑکنوں کو زیروزبر کرتا تھا۔ اس کا اکیلا یہاں چلے آنا تو بہت بڑی حماقت ہوتی...... بلکہ کسی وقت تو لگتا تھا کہ لیونا برگ کے اسٹیشن پر اترتے ساتھ ہی اسے خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔

ساتھ والے کمرے میں مائیکل اور ہیری کارڈز کھیل رہے تھے۔ الکحل اور تمباکو کے بھبکے بھی اس کمرے کی طرف سے اٹھ کر زویا کے نتھنوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس نے اپنا اسکارف، رومال کی طرح منہ کے آگے رکھ لیا۔ مائیکل اور ہیری وغیرہ یہاں شامیر کے استقبال کے لیے بالکل تیار نظر آتے تھے۔ باہر گرج چمک کے ساتھ ہلکی بارش جاری تھی۔ سرسبز لیونا برگ میں ٹھنڈ معمول سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

آنے والی گھڑیوں میں کیا ہونا ہے، یہ سوچ زویا کے لیے بڑی روح فرسا تھی۔ اتنے میں مائیکل لڑکھڑاتا ہوا سا کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ زویا، عینی کو سینے سے لگا کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے زویا کو پُرتپش نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''باس کے گرو کہتے ہیں کہ اتوار کے اتوار گرجے جاؤ...... پھر جو جی چاہے کرتے رہو۔''

''کیا مطلب؟'' زویا نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

مائیکل نے وال کلاک کی طرف دیکھا...... اور جلدی سے بات بدل کر بولا۔

''تیرے عاشق کی رونمائی نہیں ہوئی۔ جس ٹرین کا اس نے کہا تھا اس میں سے تو برآمد نہیں ہوا۔ اب کون سی شاہی سواری ہے جس پر تشریف لا رہا ہے؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' وہ منمنائی۔

مائیکل نے کھڑے کھڑے زویا کا فون اس کی طرف پھینکا جو اس کے پہلو پر لگا۔ وہ تحکم سے بولا۔ ''فون کرو اور پوچھو اس سے۔ کہیں کسی اور کے بستر میں تو نہیں گھس گیا۔''

چار و ناچار زویا اٹھی اور دھڑکتے دل کے ساتھ شامیر کا نمبر پریس کیا۔ دل سے یہی دعا نکل رہی تھی کہ وہ یہاں نہ آئے...... اور اکیلا تو بالکل ہی نہ آئے۔

فون بند جا رہا تھا۔ اسے اپنے سینے میں اطمینان کی لہر محسوس ہوئی۔ وہ اس کی پہلی اور آخری چاہ تھا۔ وہ اسے کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہ اسے کہاں کہاں یاد آتا ہے اور وہ ہر روز کتنی بار اس کے واسطے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہے۔ اس کے لیے تو وہ آج بھی فرینکفرٹ میں ٹرین نمبر 21 کے آخری اسٹیشن پر اس کے پہلو میں بیٹھا تھا، ان دونوں نے اپنے اوپر چھتری تان رکھی تھی اور بارش کی پھواروں سے آگے ڈیزی اور گلاب کے پھولوں کو دیکھتا ہوا وہ کسی داستان کا کردار لگتا تھا۔ وہ دور دیس سے آیا تھا، شاید روزِ ازل سے اس کا آنا ٹھہرا ہوا تھا اور شاید جانا بھی۔

تیری آنکھوں کے دریا کا اترنا بھی ضروری تھا
محبت بھی ضروری تھی، بچھڑنا بھی ضروری تھا

''کیا ہے؟'' مائیکل کی کرخت آواز نے زویا کو خیالوں سے چونکایا۔

اس نے جواب دینے کے بجائے فون مائیکل کی طرف بڑھا دیا جس کے اسپیکر میں سے آواز آ رہی تھی...... آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔

''اوہ شٹ۔'' مائیکل نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس ہوا میں اٹھایا جیسے اسے پٹخ کر توڑ دینا چاہتا ہو مگر پھر رک گیا۔ غالباً اس خیال سے رکا کہ عینی جاگ جائے گی۔ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کمرے میں ہی تھوڑا سا ٹہل کر عینی کی طرف جھکا اور نسبتاً نرم لہجے میں بولا۔ ''لگتا ہے کہ تمہاری بچونگڑی اب سو گئی ہے۔ اسے آرام سے کارٹ میں لٹا دو...... اور اٹھ کر تھوڑا سا کام کرو۔''

''کیا؟'' وہ ذرا چونک کر بولی۔

وہ مسکرایا۔ ''تمہارے یار کے انتظار میں بیٹھ بیٹھ کر کمر ہی اکڑ گئی ہے۔ اپنے ان گلابی گلابی نرم ہاتھوں سے تھوڑا سا مساج ہی کر دو۔''

''کیا بکواس ہے۔ دور رہو مجھ سے...... باہر نکل جاؤ کمرے سے۔'' وہ گرجی۔

''تمہاری بہن بھی اسی طرح تیز طرار تھی...... مگر پھر اس نے سمجھ داری اور تحمل کا ثبوت دیا تھا۔ لگتا ہے کہ تمہارے اندر یہ تیزی طراری والا ''فلیور'' تمہاری بہن سے کافی زیادہ ہے۔ ممکن ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ بھی تمہارا رویہ ایسا ہی ہوتا ہو...... دور رہو مجھ سے...... باہر نکل جاؤ کمرے سے...... جس بندے کے پاس تم جیسی گلبدن کے حقوق محفوظ ہوں، وہ دور تو نہیں رہ سکتا نا۔ شاید اسی وجہ سے تم دونوں میں ناچاقی

ہوئی اور پھر تم اس کی بچی کو لے کر یہاں بھاگ آئیں......
اب وہ دیوانوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ ہم یہاں سے ایک کال بھی کر دیں تو وہ اپنے سارے حقوق اور تمام غصے سمیت یہاں پہنچ جائے گا۔ تمہیں اس رازداری کے لیے ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے اور خاص طور سے میرا۔''

زویا کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی تیز دھار آلہ ہو اور وہ بے دریغ اس مکروہ شخص کے پیٹ میں گھونپ دے۔ بہرطور وہ کچھ بولی نہیں۔ بس غم و غصے کے عالم میں کانپتی رہی۔

وہ اسی طرح دونوں ہاتھ کمر پر رکھے رکھے پھر مسکرایا۔ ''تو مساج کے لیے لاؤں اولیو آئل؟''

''مجھ سے دور ہو جاؤ، ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی۔'' وہ پھر گرجی۔

اس کے تیور دیکھ کر مائیکل بلند آواز میں ہنسا۔ ''نہیں میری غصیلی حسینہ! میں مذاق کر رہا تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے ان گلابی گلابی ہاتھوں سے کچھ کلاسک ٹائپ کی ادرک والی چائے بنا دو۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے...... اور کچھ لیمن بھی نچوڑ لینا اس کے اندر۔''

''سب کچھ نچوڑ لوں گی...... مگر دودھ نہیں ہے۔'' وہ جلے بھنے انداز میں بولی۔ ''تمہیں شام کو بھی بتایا تھا۔'' اس نے اپنے غصے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''دودھ منگوا لیتے ہیں۔'' وہ بولا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اندرونی کمرے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ ''او ہیری! باہر آؤ بھئی، تھوڑی سی ہیلپ کرو اپنی خوبصورت میزبان کی۔ سامنے مارٹ سے دودھ پکڑ لاؤ۔''

ہیری کو بھی شاید اس خاص چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ وہ اپنی پتلون چڑھاتے ہوئے فوراً نکل آیا۔ مائیکل ڈسٹ بن کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''یہ بچونگڑی کے گندے ڈائپر بھی باہر پھینک آنا۔''

وہ دونوں جانتے نہیں تھے کہ جس نے یہاں پہنچنا تھا، وہ پہنچ چکا ہے اور ان دونوں سے زیادہ فاصلے پر بھی نہیں ہے۔ وہ شامیر تھا اور وہ فرینکفرٹ سے بذریعہ بس سروس یہاں پہنچا تھا۔ عین اس وقت وہ زویا کے فلیٹ والی بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر موجود تھا۔ زویا اور ٹام والے فلیٹ بھی اسی فلور پر موجود تھے۔ شامیر اس فلور کی لابی میں بیٹھا تھا۔ یہاں ٹی وی آن تھا اور دو تین بوڑھے جوڑے بیٹھے 1970ء کے زمانے کی فلم دیکھ رہے تھے۔ شامیر بھی ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے شام کا اخبار اپنے چہرے کے سامنے پھیلا رکھا تھا۔ وہ جس جگہ بیٹھا تھا، وہاں سے زویا والے فلیٹ کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ قریباً ایک گھنٹے سے اسی جگہ موجود تھا اور صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ چونکہ تھوڑی دیر پہلے تک بارش ہو رہی تھی اس لیے وہ ایک برساتی میں یہاں پہنچا تھا۔ یہ سستی برساتی اس نے بس ٹرمینل سے نکلتے ہی لے لی تھی۔ برساتی کے Hood (ٹوپی) کی وجہ سے اسے اپنا آپ چھپانے میں کافی مدد ملی تھی، درحقیقت ان گھڑیوں میں شامیر ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ ایک نامعلوم توانائی تھی جس نے اس کا ہر خوف دور کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بس زویا کی صورت بسی ہوئی تھی اور اس نے اس صورت کو بچانا تھا۔ آج تک اس نے بس سنا ہی تھا کہ سچی چاہت انسان میں ناممکنات کو ممکنات میں بدلنے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے، آج وہ عملاً خود پر یہ سب کچھ وارد ہوتے دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا۔

اس کے دل کی گواہی تھی کہ فلیٹ کے اندر ایک دو بندوں سے زائد نہیں ہیں...... اس کے دماغ میں کھلبلی تھی اور وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی کوئی آدھ گھنٹا پہلے، گہرے سرخ چہرے والا ایک بندہ دو دفعہ فلیٹ سے باہر آیا تھا اور واپس گیا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے ہاتھ میں سگریٹ کی دو ڈبیاں تھیں، دوسری مرتبہ وہ سوڈے کی دو بوتلیں اندر لے کر گیا تھا۔ دونوں مرتبہ اس نے واپس اندر جاتے ہوئے دروازے پر مدھم دستک دی تھی۔ یہ دستک اس نے ہاتھ کے بجائے اپنی کسی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی سے دی تھی۔ اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی یا ہاتھ میں پکڑی ہوئی چابی وغیرہ سے دستک دیتے ہیں۔ شامیر نے اس شخص کے دستک کے انداز کو عمومی انداز میں نوٹ کیا تھا۔

شامیر یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ گہرے سرخ چہرے والا یہ شخص تیسری مرتبہ باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا، اس لفافے میں غالباً استعمال شدہ ڈائپرز تھے۔ یہ ڈائپرز زویا کی بچی کے سوا اور کس کے ہو سکتے تھے۔ ڈائپرز کو سڑک والے کوڑے دان میں ڈالنے کے لیے وہ شخص سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ شامیر اٹھ کر کھڑکی تک گیا۔ اس نے دیکھا کہ درمیانے قد کاٹھ کا یہ پچیس تیس سالہ شخص، ڈائپرز کوڑے دان میں ڈالنے کے بعد ایک قریبی مارٹ کی طرف بڑھ گیا۔

شامیر کے دل نے ایک بار پھر گواہی دی کہ فلیٹ میں اب زویا کے علاوہ ایک ہی شخص ہے۔ اس کے جسم میں بجلی سی

کوندگئی۔ صرف تین چار سیکنڈ سوچنے کے بعد وہ فلیٹ کے دروازے کی طرف گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک انگوٹھی موجود تھی۔ اس انگوٹھی میں کچھ اور نہیں مقدر کا وہی موتی لگا... تھا جو ایک بار فرینکفرٹ کی ایک تفریح گاہ میں پری کا بھیس بدلنے والی لڑکی نے اسے اور زویا کو دیا تھا۔ یہ عام سا موتی شامیر کو کسی قیمتی نگینے سے بڑھ کر پیارا تھا۔ وہ تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ فلیٹ کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے سرخ چہرے والے کے انداز میں انگوٹھی سے دروازے پر مدھم دستک دی۔ دروازے کی دوسری جانب نسوانی قدموں کی چاپ ابھری۔ پھر دروازے میں حرکت پیدا ہوئی۔ ادھ کھلے دروازے کی دوسری جانب اسے زویا نظر آئی۔ غنودگی میں جھومتی ہوئی ننھی عینی اس کی بانہوں میں تھی۔ شامیر کے ذہن نے برق رفتاری سے فیصلہ کیا۔ زویا شدید حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچ سمجھ پاتی یا اسے کسی طرح کا ادراک ہوتا، شامیر نے ادھ کھلے دروازے کو مزید کھولا۔ زویا کو بچی سمیت باہر کھینچا اور دروازہ تیزی سے بند کر دیا۔ یہ سب کچھ بالکل غیر متوقع طور پر ایک یا دو سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ اندر سے کسی کی دہاڑ سنائی دی۔ دروازے کو باہر سے لاک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دروازے کو اسی حالت میں چھوڑ کر شامیر نے زویا کا بازو کھینچا اور اسے لیتا ہوا سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ زویا سکتہ زدہ تھی اور کسی معمول کی طرح شامیر کے ساتھ کھنچتی چلی جارہی تھی۔ بچی نے پوری طرح بیدار ہو کر رونا چلانا شروع کر دیا تھا۔

''وہ آ رہا ہے۔'' زویا چلائی۔

شامیر نے مڑ کر دیکھا۔ سیڑھیوں کے بالائی کنارے پر سیاہ گلاسز والے لمبے تڑنگے شخص کی جھلک نظر آرہی تھی۔ وہ کئی کئی زینے پھلانگتا ہوا آرہا تھا۔

شامیر اور زویا آخری زینوں پر تھے جب زویا بری طرح لڑکھڑائی۔ اس کے بازو پر سے شامیر کی گرفت ختم ہوگئی۔ وہ بچی سمیت لڑھکتی ہوئی فرش پر گری...... اس کے ٹکرانے سے شیشے کا ایک دروازہ ٹوٹ گیا۔ بچی پر بھی زویا کی پکڑ برقرار نہیں رہ سکی۔ وہ بھی دو تین پلٹیاں کھا کر ایک دیوار سے جاٹکرائی۔ سیاہ عینک والا ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ زویا پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو شامیر نے اس کے منہ پر بے دریغ گھونسا جڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے گیا۔ پھر اس کا داہنا ہاتھ بے ساختہ پتلون کی جیب کی طرف بڑھا۔ زویا جانتی تھی کہ اس جیب میں بھرا ہوا پسٹل موجود ہے۔ دو چار سیکنڈ کا جو وقت ملا تھا، اس میں زویا نے عینی کو اٹھانے کے بجائے شیشے کا ایک بڑا تکونی ٹکڑا اٹھالیا تھا۔ یہ آٹھ ایم ایم کا مضبوط وزنی شیشہ تھا۔ زویا دہاڑی اور قریباً دو فٹ لمبا ٹکڑا پوری طاقت سے گھما کر، کنارے کی طرف سے مائیکل کے منہ پر دے مارا۔ مائیکل کا سیاہ چشمہ اتر کر دور جاگرا...... زویا کی یہ ضرب معمولی نہیں تھی۔ اس ضرب کے پیچھے بے پناہ رنج وغم، نفرت اور طیش یکجا ہوگئے تھے۔ یہ کاری ضرب کئی سوالوں کا جواب تھی اور شاید اس درندگی کا جواب بھی تھی، جو قریباً ساڑھے تین برس پہلے اس کی بہن ڈاکٹر حولیہ کے ساتھ روا رکھی گئی تھی۔ مائیکل کے چہرے سے خون کا فوارہ سا ابلا اور وہ تیورا کر سب سے نچلی سیڑھی پر گرا۔ اس کی ''چیسٹ پاکٹ'' سے کچھ چیزیں اچھل کر فرش پر لڑھک گئیں۔ ان میں ایک چابی بھی تھی۔ جیسا کہ شامیر کو بعد میں معلوم ہوا، یہ زویا کی گاڑی کی چابی تھی جو باہر سڑک کے کنارے پارک تھی۔

زویا نے روتی چلاتی بچی کو اٹھالیا اور وہ دونوں پھر باہر کی طرف لپکے۔ سڑک پر پہنچنے میں انہیں سات آٹھ سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ زویا نے گاڑی کی چابی شامیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ نیلی گاڑی میری ہے۔ تم ڈرائیو کرو۔'' یہ بھی ایک کھلونا نما ٹوسیٹر کار تھی۔ وہ دونوں پھرتی سے سوار ہوگئے۔

''شامیر! نکلو یہاں سے۔'' زویا نے ہانپتی ہوئی گلوگیر آواز میں کہا۔

شامیر نے گاڑی کو اسٹارٹ کر کے یوٹرن دیا۔ یہی وقت تھا جب اسے سرخ چہرے والا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں شاپر تھا اور وہ دوڑتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا...... وہ ساتھ ساتھ کسی کو پکار بھی رہا تھا۔ پچاس ساٹھ میٹر آگے جانے کے بعد شامیر نے عقب نما آئینے میں دیکھا، سرخ چہرے والا اپنے ایک ساتھی کے ساتھ سیاہ رنگ کی ایک ٹویوٹا کار میں گھس رہا تھا۔ یقیناً وہ ان کے پیچھے آرہے تھے۔ خوف کے سبب زویا کا برا حال تھا۔ وہ بچی کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ خود بھی کانپ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ زخمی تھا۔ جس شیشے سے اس نے مائیکل کو کاری ضرب لگائی تھی وہ اس کے اپنے ہاتھ پر بھی کٹ لگا گیا تھا۔ خون روکنے کے لیے زویا نے اپنی مٹھی زور سے دبا رکھی تھی۔

اگلے پانچ دس منٹ بہت تہلکہ خیز تھے۔ وہ لیونا برگ سے نکل کر ہائی وے پر پہنچ گئے تھے۔ ہیڈ لائٹس سے

اندازہ ہوتا تھا کہ سیاہ گاڑی بڑی رفتار سے ان کے پیچھے آرہی ہے لیکن لیونا برگ کے آخری چوراہے پر شامیر اور زویا کو ایک فائدہ مل گیا۔ وہ سگنل کراس کر گئے مگر پیچھے آنے والوں کو سگنل بند ملا۔

دس پندرہ منٹ تک تو شامیر اور زویا اس خوش فہمی میں رہے کہ شاید وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن تب ایک بار پھر انہیں سیاہ ٹویوٹا کی ہیڈ لائٹس دکھائی دے گئیں۔ زویا ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ ''شومیر! یہاں سے دائیں مڑ جاؤ۔''

شامیر نے اس کی ہدایت پر عمل کیا...... اسے اندازہ ہوا کہ یہ وہی ہائی وے ہے جو برج برگ کی طرف جاتی ہے۔ یکایک ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا۔ فادر جوناتھن نے کہا تھا کہ اگر اسے کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو انہیں ضرور یاد کرے...... اس نے ٹوسیٹر گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ برج برگ کی آبادی میں تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھا۔ یہ رات قریباً گیارہ بجے کا عمل تھا۔ ایک ہلکے سے کہرے نے گرد و پیش کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سیاہ کار ایک بار پھر تیزی سے قریب آرہی تھی۔ یہ تقریباً ویسی ہی سچویشن تھی جو کہ چند روز پہلے یہاں بنی تھی۔ تب بھی رات کا وقت تھا اور سفید وین میں چار افراد نے ان کا تعاقب کیا تھا۔ آج ایک سیاہ کار میں دو بندے ان کے پیچھے آرہے تھے۔ بہرحال یہ عین ممکن تھا کہ ان کے ساتھی کسی دوسری گاڑی میں بھی آرہے ہوں۔

شامیر ایک منجھا ہوا ڈرائیور تھا۔ یہاں رائٹ ہینڈ ڈرائیونگ ہونے کے باوجود اس نے مشاقی سے گاڑی چلائی اور ٹاؤن کی پیچ در پیچ سڑکوں اور پتھریلی گلیوں میں سیاہ کار کو جل دینے کی کوشش کرتا رہا۔

''شومیر! لگتا ہے، وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔'' زویا لرزاں لہجے میں بولی۔ اس کی نگاہیں سائڈ کے عقب نما آئینے پر تھیں۔

''مگر زویا! یہ زیادہ بڑا ٹاؤن نہیں۔ وہ ہمیں پھر ٹریس کرلیں گے۔''

''تو پھر؟''

''ایک پناہ گاہ ذہن میں ہے۔'' شامیر نے کہا۔ اس کی نظر ٹاؤن کے بلند گرجے پر جمی ہوئی تھی۔

''میں سمجھی نہیں۔'' زویا نے خوفزدہ نظروں سے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' وہ بولا اور تیزی سے موڑ کاٹ کر ٹوسیٹر کا رخ گرجے کی عمارت کی طرف کر دیا۔ دو ہی منٹ بعد وہ گرجے کے اس گیٹ کے سامنے تھے جو پارکنگ لاٹ میں کھلتا تھا۔ زویا نے گاڑی سے اتر کر گیٹ کیپر سے ریکویسٹ کی اور اس نے چند لمحے تک تذبذب میں رہنے کے بعد گیٹ کھول دیا۔ شامیر سرعت سے گاڑی کو اندر لیتا چلا گیا۔

''آپ لوگوں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' گیٹ کیپر نے شامیر اور زویا سے ایک ساتھ پوچھا۔

''آپ مسئلہ بھی کہہ سکتے ہیں۔'' شامیر بولا۔ ''فادر جوناتھن ہمیں بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ ہمیں ان تک پہنچا دیں۔''

''مگر اس وقت تو وہ رہائشی حصے میں آرام فرما رہے ہوں گے۔''

''تو پھر آپ ہم پر بھروسا کریں۔ ہمیں اندر لے جائیں۔ وہ جونہی بیدار ہوں انہیں ہمارے بارے میں بتائیں۔'' زویا نے کہا۔

☆☆☆

گرجا کی اس عمارت میں پارکنگ لاٹ، لائبریری اور ایک بڑا رہائشی پورشن بھی شامل تھا۔ شامیر، زویا اور ننھی عینی اسی رہائشی حصے میں موجود تھے۔ قدیم طرزِ تعمیر کا یہ رہائشی پورشن بھی گرجے کا حصہ ہی لگتا تھا۔ جگہ جگہ مذہبی پینٹنگز آویزاں تھیں اور مجسمے استادہ تھے۔ جس کشادہ کمرے میں شامیر اور زویا موجود تھے، وہاں بھی ایک بڑے پیانو کے اوپر سونے کے خول والی لمبی صلیب آویزاں تھی۔ انہیں اس کمرے میں قریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا اور یہ وقت خیریت سے ہی گزر گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ پناہ گاہ مفید ثابت ہوئی تھی اور نمرسی کے ہرکاروں سے ان کا پیچھا چھوٹ گیا تھا۔

فادر جوناتھن بھی جاگ چکے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ پچھلے چار سال میں ان کے بال پہلے سے زیادہ سفید ہو گئے تھے اور بھوؤں میں بھی سفیدی چمکنے لگی تھی۔ بہرحال ان کی کمر بالکل سیدھی اور حرکات و سکنات میں توانائی تھی۔ وہ شامیر کے ساتھ زویا کو دیکھ کر ازحد حیران ہوئے تھے۔ انہیں جیسے اپنی نگاہوں پر بھروسا ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر انہوں نے زویا اور شامیر کو باری باری گلے سے لگایا تھا اور ڈھیروں دعائیں دی تھیں۔

زویا اور شامیر نے اپنی ساری روداد بے کم و کاست

فادر کے گوش گزار کردی تھی۔ خاص طور سے زویا کے حالات نے فادر کو ازحد حیران کیا۔ زویا کے شوہر کی ''دہری شخصیت'' کا سن کر وہ انگشت بدنداں ہوئے۔ بھرائے ہوئے دکھی لہجے میں بولے۔ ''ہلڈ برانڈ جیسے اونچے خاندان کا چشم و چراغ اور اس طرح کی فطرت...... شرم کا مقام ہے......'' پھر گفتگو کا رخ نمرسی اور اس کی کینہ پروری وعداوت کی طرف مڑ گیا۔ فادر بہت متفکر نظر آئے۔ بولے۔ ''قدرت نے تمہیں دوسری مرتبہ ان کی معاندانہ یلغار سے بچایا ہے۔ اصولی طور پر تو اس سلسلے میں قانون کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے مگر پتا نہیں کہ زویا بیٹی اور تم سب لوگ یہ چاہو گے یا نہیں۔''

اس موقع پر شامیر کا دل چاہا کہ وہ فادر جوناتھن پر یہ انکشاف بھی کر ڈالے کہ ساڑھے تین برس پہلے کی جس خوفناک واردات کو ڈکیتی کہا جارہا ہے، وہ ڈکیتی نہیں تھی، وہ اسی بدبخت نمرسی کی انتقامانہ کارروائی تھی۔ اس کارروائی میں نہایت سنگدلی کے ساتھ زویا کی بہن کو بے آبرو کیا گیا۔ اس کو بچے سے محروم کیا گیا اور ان کی والدہ سارہ جیم کو گولیوں سے چھلنی کر کے اپاہج بنایا گیا...... مگر جب زویا اور اس کی فیملی خود یہ سب کچھ صیغۂ راز میں رکھ رہی تھی تو شامیر کیسے بتا سکتا تھا۔

اسی دوران میں زویا کی نگاہ ساتھ والے کمرے میں رکھی ایک وھیل چیئر پر پڑی تو وہ کچھ چونک سی گئی۔ ''فادر! یہ چیئر کس کی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

وہ مسکرائے اور نرم لہجے میں بولے۔ ''تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔ میرے حساب سے تو یہ اچھی اطلاع ہی ہے۔ اب پتا نہیں کہ تم اسے کس طرح لیتی ہو......'' انہوں نے ذرا توقف کیا اور کہنے لگے۔ ''تمہاری ماما اور جولیہ بھی یہاں آئی ہوئی ہیں۔ ساتھ والے کمرے میں سوئی ہوئی ہیں۔''

شامیر نے دیکھا، زویا کے چہرے پر ایک رنگ سا گزر گیا۔ وہ چند سیکنڈ تک گم صم رہنے کے بعد بولی۔ ''یہ لوگ کب آئے فادر؟''

''پرسوں شام۔ تمہاری ماما کی طبیعت خراب ہے۔ وہ روحانی طور پر بھی بہت بے سکون ہے۔ چند دن اس مذہبی ماحول میں گزارنا چاہتی ہے۔ کچھ وظائف وغیرہ بھی کر رہی ہے۔ تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھی۔ دیکھو کہ خدا نے اس کی یہ دعا کس طرح قبول کی ہے۔ تم خود چل کر اس کے پاس آگئی ہو۔''

زویا روہانسی ہو کر بولی۔ ''فادر! وہ میری ماں ہیں

لیکن...... اب مجھے ان سے ڈر لگنے لگا ہے۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ میں ان کی سوتیلی بیٹی ہوں...... یا پھر ان کی بیٹی نہیں بہو ہوں اور وہ ظالم رابرٹ ان کا داماد نہیں بیٹا ہے۔ وہ اس کے خلاف کچھ نہیں سنتیں۔ سارا قصور میرا ہی گردانتی ہیں۔ وہ مجھے پھر رابرٹ کے حوالے کرنا چاہیں گی اور میری بچی کو بھی۔ پلیز فادر! ان کو نہ ہی پتا چلے تو اچھا ہے۔ اتفاقاً شومیر بھی میرے ساتھ ہیں۔ وہ اس قدر آگ بگولا ہوں گی کہ ہم سے سنبھالے نہیں سنبھلیں گی۔''

''تم گھبراؤ نہیں بیٹی۔ خدا نے مدد کی تو میں سب ٹھیک کرلوں گا۔'' فادر جوناتھن نے کہا۔ شاید وہ کچھ اور کہتے لیکن یہی وقت تھا جب ذرا کھٹ پٹ ہوئی اور پھر زویا کی بہن ڈاکٹر حولیہ دروازے پر آن کھڑی ہوئی۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھی اور بچی بچی نگاہوں کے ساتھ سب کو دیکھ رہی تھی۔ تب زویا اور شامیر کو دیکھ کر وہ بھونچکی رہ گئی۔ تیزی سے آگے آئی اور زویا کو گلے سے لگالیا۔ اسے جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ جس زویا کو وہ ایک سال سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو رہے ہیں، وہ اس کے سامنے کھڑی ہے۔

کتنی ہی دیر تک اس نے زویا کو گلے لگائے رکھا اور اس سے شکوے شکایت کرتی رہی۔ شامیر نے سن رکھا تھا کہ مجھلی بہن سے زویا کو گہری انسیت ہے، آج اس کا ثبوت بھی مل رہا تھا۔ حولیہ بھی جذباتی ہو رہی تھی۔ تب اس کی نگاہیں شامیر پر جم کر رہ گئیں۔ اس کے چہرے پر گریز اور کدورت کے تاثرات شامیر نے صاف محسوس کیے۔ فادر جوناتھن نے حولیہ کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''حالات بڑے مخدوش ہیں حولیہ۔ ہم سب کو بڑی فراست اور سمجھ بوجھ سے کام لینا ہوگا۔ تمہاری ماما کہاں ہیں؟''

ڈاکٹر حولیہ بولی۔ ''وہ جاگ گئی ہیں۔ انہوں نے ہی تو مجھے یہاں بھیجا ہے۔ کہہ رہی تھیں کہ مجھے لگتا ہے، زویا کی آواز آرہی ہے کہیں سے......''

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے سارہ جیم کی بھرائی ہوئی کرخت آواز ابھری۔ ''حولیہ! تم کہاں ہو؟ کون ہے یہاں؟''

شامیر سمجھ گیا کہ اب سارہ جیم سے کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں۔ وہ ہیجان کا شکار ہو چکی تھی اور وہیل چیئر کے بغیر ہی شاید فرش پر گھسٹتی ہوئی ان سب کی طرف آرہی تھی۔ اگلے دس منٹ بڑے سنسنی خیز تھے۔ سارہ جیم نے زویا کو دیکھ لیا تھا اور ساتھ ساتھ شامیر کو بھی۔ شامیر کو دیکھ کر وہ زویا سے ملنے کی راحت بھی فراموش کر گئی۔ اس کا ورم زدہ چہرہ طیش سے گہرا گندمی دکھائی دینے لگا۔ ہونٹ جیسے نیلے پڑ گئے۔ وہ شامیر پر چلّانے لگی۔ ''مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ تمہاری..... منحوس آمد یہاں ہمارے لیے اور نحوستیں لے کر آئے گی۔ تم لعنتی انڈین ہو۔ تم جونک بن کر چمٹ گئے ہو ہم سے۔ تم نے برباد کردیا ہم سب کو۔ اب بھی تمہیں چین نہیں ہے۔ اب بھی میری شادی شدہ بیٹی کا گھر تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے کروں گی......''

فادر جوناتھن درمیان میں آئے اور انہوں نے سارہ جیم کو سنبھالنے کی کوشش کی......وہ ان کی پروا بھی نہیں کر رہی تھی۔ وہ بولتی چلی گئی۔ ''تم کمینے لوگ اپنے ملک سے بھاگ کر یہاں آتے ہو۔ تمہاری لالچی نظر یہاں کی دولت پر ہوتی ہے، یہاں کی عورتوں پر ہوتی ہے۔ اپنی گندی خصلت کے مطابق یہاں جھوٹ بولتے ہو، دونمبریاں کرتے ہو، ہماری لڑکیوں کو اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھانستے ہو لیکن اپنی جوان لڑکیوں کو ادھر کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ تم لوگ خودغرض اور پرلے درجے کے حریص ہو۔'' طیش کے عالم میں اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

فادر جوناتھن نے اسے بمشکل سنبھالا اور وہیل چیئر پر بٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ حولیہ بھی لال بھبوکا چہرے کے ساتھ خاموش کھڑی تھی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زویا کیسے ملی اور اس کے ساتھ شامیر کیونکر نظر آرہا ہے؟ تب حولیہ کی نظر زویا کی زخمی ہتھیلی پر پڑی جہاں اس نے عارضی پٹی لپیٹ رکھی تھی۔ ''یہ کیا ہوا زویا؟'' اس نے پوچھا۔

''بڑی مشکل سچویشن سے نکل کر یہاں پہنچے ہیں حولیہ۔ تمہیں بعد میں تفصیل سے بتاؤں گی۔''

ڈاکٹر حولیہ نے زویا کی ہتھیلی کا کٹ دیکھا، پھر اپنا شولڈر بیگ لے آئی۔ اس میں فرسٹ ایڈ کا کچھ سامان موجود تھا۔ وہ زویا کی ہتھیلی کی بینڈیج کرنے لگی۔ وہ شامیر کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی جیسے اس کی طرف دیکھنا بھی اسے گراں ہو۔ کچھ دیر بعد فادر جوناتھن دوبارہ زویا اور شامیر کے پاس آگئے۔ کسی قریبی کمرے سے سارہ جیم کے واویلا کرنے کی مدھم آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔

فادر بولے۔ ''وہ ابھی اپنے حواس میں نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ فی الحال تم دونوں اس سے دور ہی رہو۔'' فادر کا اشارہ زویا اور شامیر کی طرف تھا۔

(جاری ہے)

فادر نے زویا کو سارہ جیم سے دور رہنے کا مشورہ دیا اور شامیر کے لیے بھی یہی حکم تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' زویا نے پژمردہ آواز میں کہا۔ اس کی بچی عینی اب جاگ گئی تھی اور تجسس سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ وہ شکل وصورت کے لحاظ سے بہت حد تک اپنی ماں پر گئی تھی۔ اپنے گال کا ننھا سا گڑھا بھی اس نے اپنی ماں سے ہی چرایا تھا۔

فادر جوناتھن نے وہ دروازہ لاک کر دیا جہاں سے گزر کر سارہ جیم اس کمرے میں پہنچی تھی۔ وہ بولے۔ ''اگر سارہ یہ دروازہ کھٹکھٹائے بھی تو تم لوگوں نے نہیں کھولنا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی چلی جائے گی۔ میں تم لوگوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرتا ہوں۔''

اب دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ زویا اور شامیر کو اپنی یہ پناہ گاہ ہر طرح سے محفوظ لگ رہی تھی۔ یہ ایک کشادہ کمرا تھا جہاں قدیم طرز کا ڈبل بیڈ اور آبنوسی طرز کے نقش ونگار والے صوفے موجود تھے۔ کھڑکیاں طویل تھیں اور ان میں آہنی سلاخوں والی گرلیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ کمرا گرجے کی عمارت سے ذرا ہٹ کر تھا پھر بھی گرجے میں پڑھی جانے والی دعاؤں کی مدھم آواز اس کمرے تک پہنچ رہی تھی۔ یہ اتوار کا دن تھا اور گرجے میں گہما گہمی محسوس ہوتی تھی۔

کچھ دیر بعد ایک ملازمہ پر تکلف ناشتا لے کر آ گئی۔ ناشتے کی ٹرے میں بچی کے لیے دودھ اور دلیا وغیرہ بھی موجود تھا۔ زویا کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک تعاقب کرنے والوں کے خوف سے نکل نہیں سکی۔ اس کا خیال یہی تھا کہ وہ لوگ ابھی تک اسی قصبے میں موجود ہوں گے اور انہیں کھوج رہے ہوں گے۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے شومیر۔'' وہ منمنائی۔

''اللہ کا شکر ادا کرو زویا۔ اس نے ہمیں سخت ترین مرحلے سے بحفاظت نکال دیا ہے۔ آگے بھی اچھا ہی ہوگا۔ پلیز! تم چند نوالے لے لو۔''

وہ عجیب نظروں سے شامیر کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ بھی تو نہیں۔'' اس نے شامیر کے چہرے سے نظریں پھیریں اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے بچی کو چوما۔

شامیر گہری سانس بھر کر بولا۔ ''زویا! میں جانتا ہوں، میں نے لیونا برگ جا کر اور تمہیں ڈھونڈ کر تمہاری مشکلوں میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ میرے خیال میں اس کے لیے معذرت کے الفاظ کافی نہیں ہیں۔''

''جو ہونا تھا وہ ہو گیا شومیر! اب آگے کا سوچنا چاہیے۔ میرا خیال تو اب بھی یہی ہے کہ تم یہاں سے نکل کر جلد از جلد پاکستان چلے جاؤ۔ اس سلسلے میں فادر جوناتھن تمہاری بہت مدد کر سکتے ہیں۔''

''اور تمہیں یہاں ان مہلک حالات میں چھوڑ جاؤں؟ ہم جس طرح فلیٹ سے نکلے ہیں اور جس طرح تم نے نمرسی کے خاص کارندے کو گھائل کیا ہے...... یہ لوگ تمہیں آسانی سے معاف نہیں کریں گے...... اور میں سمجھتا ہوں زویا کہ یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے۔''

''پلیز شومیر! اس طرح مت سوچو۔ مجھے مزید تکلیف مت دو۔ میں کسی نہ کسی طرح اس صورت حال کو ہینڈل کر لوں گی۔''

''کس طرح کرو گی ہینڈل؟ پہلے صرف ایک بندہ تمہارا دشمن تھا، تمہارا شوہر رابرٹ۔ اب یہ نمرسی اپنے ٹولے سمیت تمہارے پیچھے ہے......''

''شومیر! میں نے کہا ہے نا کہ میں کسی نہ کسی طرح ہینڈل کر لوں گی۔ میرا پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات میرے پاس آ چکے ہیں۔ میں عینی سمیت جرمنی سے نکل جاؤں گی۔ بہت جلد نکل جاؤں گی۔'' اس نے تھوڑا توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''شومیر! تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ ہماری یہ مختصر سی دو ملاقاتیں بھی ہمارے لیے کتنی خطرناک ثابت ہوئی ہیں۔ کیوں نہ ہم عہد کریں کہ ایک دوسرے کو معاف کر دیں گے۔ پھر کبھی نہیں ملیں گے۔ بس ایک دوسرے کو اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔''

عینی دلچسپی سے شامیر کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ اس کی گود میں چڑھ آئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ہموار ڈاڑھی میں انگلیاں چلانے لگی۔ شامیر نے اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ ہو بہو زویا کی تصویر تھی۔ شامیر کو لگا کہ اس کے وجود سے زویا کی مہک ہی پھوٹ رہی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹوں سے اس کے گال کے گڑھے کو چھوا۔ ایک معصوم مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

شامیر نے کھوئے کھوئے لہجے میں زویا کو مخاطب کر کے کہا۔ ''ایسا کیوں ہے زویا؟ جذبے سچے ہوتے ہیں پھر بھی محبتیں پروان کیوں نہیں چڑھتیں؟ کیوں محبت کرنے والوں کو آخر میں ایسے ہی گھسے پٹے فقرے دہرانے پڑتے ہیں...... ہم ایک دوسرے کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ ہم کیوں سچ کا سامنا نہیں کر پاتے؟''

''تم کس سچ کی بات کر رہے ہو؟'' زویا کے لہجے میں

ایک بار پھر بیگانگی اتر آئی، اس نے عینی کو شامیر کی گود سے واپس اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ رابرٹ سے تمہاری شادی، تمہاری مالی مجبوریوں کی وجہ سے ہوئی...... اور کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اس شخص نے تمہاری اور عینی کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے اور کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم ان حالات سے بچ کر جرمنی چھوڑ دینا چاہتی ہو، کسی اور ملک جانا چاہتی ہو؟"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو شومیر؟"

شامیر کی آنکھوں میں اچانک دنیا بھر کی التجائیں سمٹ آئیں۔ وہ بولا۔ "زویا! جب تم نے کسی اور ملک ہی جانا ہے تو پھر پاکستان کیوں نہیں؟ ایک بار تم نے کہا تھا نا کہ پاکستان کے شمالی علاقے تمہیں بے حد محبوب ہیں۔ تم انہیں لائیو دیکھنا چاہتی ہو...... وہ سارے علاقے...... وہ ساری وادیاں اور سارے راستے اپنی بانہیں کھولے کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں تمہیں بہت کچھ مل سکتا ہے زویا...... اور وہ تحفظ بھی جس کی تمہیں اور تمہاری بچی کو اشد ضرورت ہے......"

ایک لمحے کے لیے......صرف ایک لمحے کے لیے شامیر کو یوں لگا جیسے اس کے اندر کچھ پگھلا ہے اور وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے شومیر!" اس نے کہا اور بچی کا فیڈر واش کرنے لگی۔

......کل ایک ٹیلی فونک گفتگو میں زویا نے نمرسی کے کارندوں کو ڈاج دینے کے لیے شامیر سے کہا تھا کہ وہ اسے طمانچہ مارنے پر شرمندہ ہے۔ آج شامیر کو لگا جیسے اس نے واقعی طمانچہ مارا ہے اور اس کی طرف سے رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی ہے۔ بے مثل سرد مہری تھی۔

"سوری شومیر!" اس نے رخ پھیرے پھیرے کہا۔ "لیکن میں چاہتی ہوں کہ ہم اس موضوع پر بات نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے زویا، تم نہ کرو۔ میں بھی نہیں کروں گا......لیکن میں خود کو یہ سب کچھ سوچنے سے روک نہیں سکتا اور نہ کبھی روک پاؤں گا۔ بے شک کئی موسم گزر چکے ہیں لیکن میں آج بھی 21 نمبر کے آخری اسٹیشن پر لکڑی کی بینچ کے پاس ڈیزی کے انہی پھولوں میں کھڑا ہوں۔ ٹھیک اسی جگہ پر جہاں تم مجھے چھوڑ کر گئی تھیں......"

زویا کے چہرے پر ناگواری ابھری لیکن اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، دائیں طرف والے دروازے پر دستک ہوئی۔ سفید چولے اور سفید ٹوپی میں ملبوس فادر جوناتھن اندر آ گئے۔ انہوں نے اس بات پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ ناشتا ویسے کا ویسا ہی پڑا ہوا ہے۔

پھر انہوں نے کہا۔ "میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر لگتا یہی ہے کہ تمہارے پیچھے آنے والے لوگ ابھی ٹاؤن سے گئے نہیں ہیں۔ اگلے کم از کم چوبیس گھنٹے تک ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ تم دونوں نے کسی بھی وجہ سے اس رہائشی پورشن سے باہر نہیں نکلنا۔"

زویا اور شامیر نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولے۔ "سنڈے کی عبادت کے بعد مجھے چار پانچ گھنٹوں کے لیے ٹاؤن سے باہر جانا ہے، ایک ڈیوک کی شادی کی تقریب ہے۔ شام سے پہلے لوٹ آؤں گا۔"

زویا اور شامیر کو ضروری ہدایات دے کر وہ واپس چلے گئے۔

فادر نے اس امکان کا اظہار کیا تھا کہ شاید نمرسی کے لوگ ابھی تک ٹاؤن میں ہی ہیں۔ اس خبر نے زویا کے کملائے ہوئے چہرے کو کچھ اور کملا دیا تھا۔

کسی قریبی کمرے سے گاہے بگاہے سارہ جیم کے گرجنے برسنے کی مدھم آواز شامیر اور زویا کے کانوں تک پہنچی تھی۔ تعصب، نفرت اور طیش اس آواز کے اہم ترین عناصر تھے۔ شامیر نے آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی...... اسے یوں لگا کہ زویا سے اس کی جدائی میں دو کردار بہت اہم رہے ہیں۔ ایک زویا کی والدہ سارہ جیم اور دوسرے اس کی اپنی خالہ ثمینہ۔ دونوں پچھلی نسل کی عورتیں تھیں۔ شاید دونوں ہی اپنے اندر تعصب اور ضد رکھتی تھیں۔ دونوں دقیانوسی تھیں۔ دونوں نے ان کی راہوں میں کانٹے بوئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ سارہ جیم نے کھلے عام یہ سب کچھ کیا تھا اور امو خالہ پس پردہ رہ کر یہی کچھ کرتی رہی تھیں۔ ایک بار پھر وہ الفاظ شامیر کی سماعت میں زہر گھولنے لگے جو اختر انکل کا گھر چھوڑتے وقت اس نے سنے تھے۔ وہ الفاظ اور وہ لب ولہجہ بھی اس کے سان گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔ وہ اب دوبارہ یہ آوازیں سننا نہیں چاہ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا فون مسلسل بند تھا۔

گرجا کی سروس اب اختتام پذیر ہو چکی تھی کیونکہ دعائیہ کلمات کی آواز اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید فادر اپنے کام سے نکل چکے تھے۔ شامیر کے لیے یہ تصور بڑا جانکاہ تھا کہ نمرسی کے بپھرے ہوئے کارندے ابھی اسی ٹاؤن کی سڑکوں پر موجود ہیں۔

☆☆☆

لمبا چوڑا دبنگ نمرسی اپنے سکھ پارٹنر کے ساتھ میلانو

کے ایک لگژری بنگلے میں موجود تھا۔ اس کی شاید کوئی شب ہی ایسی ہوتی ہوگی جو شراب اور شباب کے بغیر گزرتی ہو۔ آج کی شب بھی اس نے ایک انڈین دوشیزہ کی سیاہ زلفوں کے سائے میں گزاری تھی۔ لڑکی نے ناتجربہ کار ہونے کے باوجود اسے اچھی کمپنی دی تھی، شاید اس کی ناتجربہ کاری ہی اس کی خوبی ثابت ہوئی تھی۔ وہ بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں تھا اور فرینکفرٹ جانے کے لیے تیار تھا۔ وہ بذریعہ یوریل ایک فرضی نام سے جرمنی میں داخل ہونے جارہا تھا..... پچھلے تین سال میں وہ فقط ایک مرتبہ اسی طرح فرضی شناخت کے ساتھ جرمنی گیا تھا۔

وہ کپڑے تبدیل کررہا تھا جب اسے فون پر ایک ایسی خبر ملی جس نے نہ صرف اس کا موڈ برباد کردیا بلکہ وہ مشتعل ہوکر چنگھاڑنا شروع ہوگیا۔ یہ خبر لیونا برگ میں موجود اس کے کارندے ہیری نے دی تھی..... اور یہ ٹی وی رپورٹر شامیر اور سابقہ رپورٹر زویا راشد کے بارے میں تھی۔ ہیری نے بتایا کہ شامیر، زویا کے فلیٹ تک پہنچا لیکن پھر وہ دونوں چکما دے کر نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ جاتے جاتے وہ مائیکل کو بھی شدید زخمی کرگئے تھے۔ زویا نے شیشے کے ایک بڑے ٹکڑے سے مائیکل کے چہرے پر وار کیا تھا۔ اس کا ایک گال، بائیں کان سے لے کر ہونٹوں تک بالکل چر کر رہ گیا تھا، دو دانت ٹوٹ گئے تھے اور خدشہ تھا کہ اس کی آنکھ بھی بچ نہیں سکے گی۔ وہ اسپتال میں تھا۔

نمرسی نے حسبِ عادت ہیری کو ماں بہن کی سنگین گالیاں دی تھیں اور ان تینوں کارندوں کی پچھلی کئی نسلوں سے نازیبا رشتے جوڑنے کے باوجود اس کا غصہ پوری طرح ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ آخر میں وہ گرجا۔ ''اب یہاں برج برگ میں کس ماں کی شادی کا ڈنر کرنے بیٹھے ہوئے ہو؟''

ہیری لرزاں آواز میں بولا۔ ''سر! آپ سے ہدایات لینے کے لیے ہی فون کیا تھا بلکہ میں نے تو رات کو بھی دو تین بار فون کیا مگر پی اے نے بتایا کہ آپ آرام کر رہے ہیں۔ دراصل جناب..... آج صبح تک ہمارا خیال یہی تھا کہ وہ دونوں اس قصبے سے نکلے نہیں مگر اب صورتِ حال مختلف محسوس ہورہی ہے.....''

''تمہاری محسوسیت پر تو میں ایسا ڈنڈا چلاؤں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔'' نمرسی دہاڑا اور فون بند کردیا۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہورہا تھا۔ وہ بے قراری سے اس وسیع لگژری کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نیٹ وسکی کا تین چوتھائی گلاس پی کر بھی اس کا سکون واپس نہیں آیا۔ زویا کی ماں کو زخمی اور بہن کو تاراج کرانے کے بعد وہ اس معاملے کو تقریباً بھول گیا تھا۔ شامیر کو سبق سکھانے کا خیال بھی آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے محو ہوگیا تھا مگر اس نے واپس یہاں آکر اور زویا سے مل کر سارے پرانے زخم تازہ کردیے تھے۔ ان غیر ملکی گھس پیٹھیوں کو اس نے اور اس کے گرو نے کبھی بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ لوگ دولت، عورت اور آسائشوں کے شکاری تھے۔

کمرے میں لمبے تڑنگے نمرسی کی بے قرار چہل قدمی ایک فون کال کی وجہ سے رک گئی۔ اس نے جھلائے ہوئے انداز میں فون اٹھایا مگر پھر قدرے نارمل ہوگیا۔ دوسری طرف پادری جوناتھن تھے۔ رسمی کلمات کے بعد انہوں نے کہا۔ ''رونالڈو! تمہارے لیے اچھی خبر ہے۔ جن کو ڈھونڈ رہے ہو، وہ خود چل کر تمہارے پاس پہنچ گئے ہیں۔''

''مم..... میں سمجھا نہیں فادر؟'' نمرسی ہکلایا۔

''کرامات کو سمجھنے کے لیے اور ان کو ظہور میں لانے کے لیے ایک علیحدہ قسم کی سمجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے رونالڈو۔ ہاں، زویا اور شامیر..... گناہ گاروں کی یہ جوڑی اس وقت برج برگ میں، میرے گھر میں ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں گرو، میں واقعی بے حد حیران ہوں۔''

''حیران ہونے میں زیادہ وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً اپنے بندوں کو بھیجو بلکہ بہتر ہے کہ خود بھی پہنچ جاؤ۔ تم نے کہا تھا نا کہ جرمنی آرہے ہو؟''

''جی ہاں..... وہ تو میں آہی رہا ہوں۔''

''لیکن یاد رہے۔ اس سارے معاملے میں کہیں بھی میرا نام نہیں آئے گا۔ تم جانتے ہی ہو، سارہ جیم سے میرے کتنے قریبی تعلقات ہیں۔ ویسے بھی ایک پادری کی حیثیت سے میں یہ سب کچھ افورڈ نہیں کرسکتا۔''

''آپ..... کو یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے فادر! آپ کا یہ خادم آپ کے کہے بغیر ہی آپ کی ہر منشا سمجھ جاتا ہے۔''

''اب کیا سلوک کرنا چاہتے ہو گناہ گاروں کی اس جوڑی سے؟'' فادر جوناتھن نے ایک توقف کے بعد پوچھا۔

''مناسب سزا تو یہی ہے کہ جان سے مار دیا جائے دونوں کو۔'' نمرسی کے لہجے میں سفاکی تھی۔

''نہیں..... میرے خیال میں سارہ کی بیٹی کے لیے یہ سزا کچھ زیادہ ہوگی۔ اسے زندہ رہنا چاہیے۔ میری تو رائے ہے کہ اسے اس کے خاوند رابرٹ کے حوالے کردیا

جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ اسے بھاگنے نہیں دے گا۔ میں اس کے ایک بھائی کو جانتا ہوں۔ اوپر سے یہ لوگ جیسے بھی ہوں لیکن ان کے اندر ایک پکی جرمن روح ہے۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو، ان کا سلسلۂ نسب ایڈولف ہٹلر سے جاملتا ہے۔ یہ نہ صرف بھاگ نہیں پائے گی بلکہ وہ اسے کسی ایسی جگہ لے جائے گا جہاں یہ خود بھی اپنا پتا نہ پاسکے گی۔ چند برسوں میں چھ سات بچے اس میں سے پیدا کرلے گا۔ پھر یہ کہیں نہیں جائے گی۔''

''آپ...... جیسا کہیں گے۔'' نمرسی نے مختصر جواب دیا۔ نمرسی اب جلدی میں نظر آتا تھا۔

فادر نے کہا۔ ''اور میرے خیال میں تو موت کی سزا کوئی سزا ہی نہیں ہے۔ یہ نامراد، جھوٹا عاشق شامیر بھی مرگیا تو کیا سزا پائی؟ اس کو بھی عبرت ناک سزا ملنی چاہیے اور ''جیتے جی'' ملنی چاہیے۔''

فادر جوناتھن نے تھوڑی سی گفتگو مزید کی اور چند ہدایات دے کر کال ختم کردی۔

نمرسی نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر ہیری سے رابطہ کیا...... اور اسے بتایا کہ دونوں بھگوڑے یعنی زویا اور شامیر کہاں ہیں۔ ان کو پکڑنے اور سنبھالنے کے حوالے سے ضروری ہدایات دے کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ اس کا فون آن تھا اور اس نے ہیری کو تاکید کی تھی کہ اسے ہر پل کی خبر دی جائے۔

وہ لباس تبدیل کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اس کے کانوں میں اپنے گرو فادر جوناتھن کے الفاظ گونج رہے تھے...... اسے عبرت ناک سزا ملنی چاہیے اور ''جیتے جی'' ملنی چاہیے۔ نمرسی ان کا یہ اشارہ بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ تین سال پہلے دوسری لنگن لڑکوں کو اسی طرح ''جیتے جی'' والی سزا دی گئی تھی۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے دو جرمن خواتین سے پیپر میرج کی مگر پھر ان سے جسمانی تعلق قائم کیا۔ ان جواں سال خواتین کا دعویٰ تھا کہ انہیں تصویروں کے ذریعے بلیک میل کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ نمرسی کا خیال تھا کہ وہ قانون کی گرفت سے بچ جائیں گے لہٰذا ان دونوں لڑکوں کو ایک ''روڈ ایکسیڈنٹ'' میں اس بری طرح زخمی کیا گیا تھا کہ ان میں سے ایک ہمیشہ کے لیے مکمل اپاہج ہوگیا تھا اور دوسرا دو ماہ موت اور زندگی کے درمیان لٹک کر اور اذیت جھیل کر راہیِ عدم ہوا تھا۔

☆☆☆

دن کے گیارہ بج گئے تھے۔ عینی، زویا کی گود میں پھر سوچکی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے چرچ کی ملازمہ نے بتایا تھا کہ فادر، شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے جاچکے ہیں۔ وہ شام تک لوٹ آئیں گے۔ جب تک فادر یہاں موجود تھے، زویا مطمئن نظر آتی تھی مگر اب اسے شاید عدم تحفظ کا احساس ہورہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ شام ابھی بہت دور تھی۔

اچانک وہ دروازہ دھڑا دھڑ بجنے لگا جس کو مقفل کیا گیا تھا تاکہ بپھری ہوئی سارہ جیم دوبارہ ادھر نہ آسکے۔ زویا اور شامیر بری طرح چونک گئے۔ ''کون؟'' شامیر نے بلند و بالا ساگوانی دروازے کے قریب جاکر پوچھا۔

''میں ڈاکٹر حولیہ...... پلیز دروازہ کھولو جلدی کرو۔''

حولیہ کی ہیجانی آواز سنائی دی۔

''کیا ہوا ہے؟'' شامیر نے دروازے کو کھولے بغیر پوچھا۔

''میں کہتی ہوں دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔'' حولیہ چلّائی اور اس کے ساتھ ہی اس نے پھر دروازے کو پیٹنا شروع کردیا۔

حولیہ کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ شامیر کو دروازہ کھولتے ہی بنی۔ حولیہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید تھا۔ وہ دہشت زدہ لہجے میں بولی۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا۔ تم لوگ ضرور کسی کو پیچھے لگا کر لائے ہو...... اور وہ پہنچ گئے ہیں۔ وہ نمرسی کے لوگ ہیں۔ مم...... میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' دہشت کے سبب حولیہ کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

''کہاں دیکھا تم نے انہیں؟'' شامیر نے پوچھا۔

''وہ کھڑکی سے نظر آرہے ہیں...... آؤ میرے ساتھ۔'' حولیہ نے کہا اور مختصر راہداری سے گزر کر اس کمرے کی طرف بھاگی جہاں وہ اور اس کی ماں سارہ جیم ٹھہری ہوئی تھیں۔ شامیر اور زویا بھی لپکتے ہوئے حولیہ کے پیچھے گئے۔ اس نے ایک بلند کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور سخت ہراس کے عالم میں بولی۔ ''وہ دیکھو...... وہ سفید وین...... دو بندے اب بھی اندر ہیں۔ باقی نیچے اتر چکے ہیں۔ وہ۔ بب...... براؤن شرٹ والا...... جس کا چہرہ سرخ ہے۔ مم...... میں اچھی طرح جانتی ہوں ان باسٹرڈز کو۔''

شامیر نے دیکھا، حولیہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس نے بھی ہیری اور اس کے تقریباً نصف درجن ساتھیوں کو پہچان لیا تھا۔ وہ شکلوں سے ہی خطرناک غنڈے لگتے تھے اور شاید انہی میں سے کچھ افراد تھے جنہوں نے تین چار سال پہلے سارہ جیم کے گھر میں گھس کر ڈاکٹر حولیہ کے ساتھ

بدترین سلوک کیا تھا۔ حولیہ کی جو حالت ہو رہی تھی، وہ اس امر کی تصدیق کر رہی تھی۔ حولیہ کو لگا کہ وہ چکرا کر گر جائے گی۔ زویا نے اسے سہارا دیا اور کھینچتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔ شامیر کے دماغ میں کھلبلی تھی...... وہ جس جگہ کو محفوظ پناہ گاہ تصور کر رہے تھے، وہ محفوظ نہیں تھی۔ غیر متوقع طور پر انہیں ڈھونڈ لیا گیا تھا۔ وہ چلّایا۔

''زویا! پورشن کے سارے دروازے اندر سے بند کر دو۔''

زویا دائیں جانب والے دروازے چیک کرنے کے لیے دوڑی۔ شامیر نے سامنے والے دروازے بولٹ کر دیے۔ اسی دوران میں ایک اور چھوٹی جیپ موقع پر پہنچ گئی۔ اس میں سے بھی تین چار افراد دندناتے ہوئے اترے اور رہائشی پورشن کے عقب میں چلے گئے۔ ان میں سے ایک بغلی دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ اس جگہ کو گھیر رہے ہیں۔ بظاہر وہ ابھی تک خالی ہاتھ نظر آ رہے تھے مگر وہ خالی ہاتھ یقیناً نہیں تھے۔ ان کے کپڑوں کے نیچے یقیناً آتشیں ہتھیار موجود رہے ہوں گے۔

دفعتاً سامنے والے مین دروازے پر دستک ہونے لگی۔

''کون ہے؟'' شامیر نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

''دروازہ کھولو۔ مہمان آئے ہیں۔'' کسی شخص نے شائستہ لہجے میں کہا۔

یقیناً یہ نمرسی کے کسی کارندے ہی کی آواز تھی۔ شاید انہیں معلوم نہیں تھا کہ کھڑکی میں سے انہیں اور ان کی گاڑیوں کو دیکھ لیا گیا ہے۔

زویا اور حولیہ کی ماما تو غالباً کسی ٹرنکولائزر کے زیر اثر سوئی پڑی تھی لہٰذا اس خطرناک صورتِ حال کے تناؤ سے محفوظ تھی مگر حولیہ اور زویا کی حالت بری ہونے لگی۔ خصوصاً حولیہ تو جیسے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ آج کئی برس بعد اسے وہ ایک دو چہرے پھر نظر آئے تھے جنہوں نے ایک انتقامی شب میں اس کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے تھے۔ وہ شرابی غنڈے جنہوں نے اسے نوچا کھسوٹا تھا۔ اس کی ہر منت سماجت رد کی تھی۔ اس کی ماں کو زخم زخم کیا تھا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے، تاہم فی الوقت وہ ایک دو کو ہی پہچان پا رہی تھی۔ باقیوں نے تب چہروں پر اسکائی ماسکس چڑھا رکھے تھے۔

''زویا! تم فادر کو فون کرو...... جلدی کرو۔''

زویا اس کے کہنے سے پہلے ہی فادر کا نمبر پریس کر چکی تھی۔ چند سیکنڈ بعد کپکپاتی آواز میں بولی۔ ''نہیں شومیر! ان کا فون بند ہے۔''

اب اس رہائشی پورشن کے دو تین دروازے دھڑا دھڑ بجائے جانے لگے تھے۔ چرچ کی دو ملازمائیں بھی اس حصار میں آ گئی تھیں۔ وہ بتائے بغیر ہی جان گئی تھیں کہ صورتِ حال خطرناک ہے۔ ان کے رنگ بھی فق ہو رہے تھے۔

چرچ کی عمارت میں چونکہ سروس ختم ہو چکی تھی، اس لیے اردگرد زیادہ لوگ موجود نہیں تھے۔ باہر سے کسی کو مدد کے لیے پکارنا بے فائدہ تھا۔ ہاں، پولیس کو فون کیا جا سکتا تھا۔ شاید اب اس کے بغیر گزارہ نہیں تھا۔ شامیر کے اشارے پر زویا نے ایک بار پھر فادر سے رابطہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ تب شامیر سے مشورے کے بعد وہ پولیس کو کال کرنے لگی۔ فوری طور پر رابطہ نہیں ہوا۔ لائنیں مصروف تھیں۔

یکایک کسی عقبی کمرے کی کھڑکی کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ شاید وہ لوگ کھڑکی کے راستے اندر آنے کی کوشش کر رہے تھے مگر کھڑکیوں میں قدیم طرز کی آہنی گرلز موجود تھیں۔ حولیہ کی حالت ابتر ہو گئی۔ اس کے ہونٹ بالکل سفید ہو کر بے جان نظر آنے لگے تھے۔ وہ بلک کر بولی۔ ''میں ان لوگوں کے ہتھے چڑھنے کے بجائے مر جانا پسند کروں گی۔ پلیز! فون کریں پولیس کو...... پلیز۔''

شامیر نے اسے پُرسکون کرنے کی کوشش کی......

''حولیہ! ممکن ہے کہ ان لوگوں کو تمہاری یہاں موجودگی کا پتا ہی نہ ہو...... وہ تمہارے پیچھے نہیں آئے ہیں۔''

''مگر وہ آئے تو ہیں نا اور جب وہ آ گئے ہیں تو پھر...... سب کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ بہت بُرے لوگ ہیں۔ مجھ سے بڑھ کر انہیں اور کون جانتا ہوگا۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

وہ ننھا پسٹل ابھی تک شامیر کے لباس میں تھا جو سلطان صاحب نے بذریعہ جینن اسے فراہم کیا تھا۔ اس پسٹل کی موجودگی اسے کچھ حوصلہ دے رہی تھی مگر اس کا اصل حوصلہ تو زویا تھی جو یہاں موجود تھی...... اور خطرے میں تھی۔

''دروازہ کھولو ورنہ توڑ دیں گے۔'' ایک گرجتی ہوئی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا کہ سامنے والے قدیم چوبی دروازے سے زور آزمائی کی جا رہی ہے۔

''زویا پھر پولیس کو ٹرائی کرو۔'' شامیر نے بلند آواز میں کہا۔ تب ہی اس کی نظر سیڑھیوں کی طرف گئی۔

یہ سیڑھیاں اس ہال کمرے کے اندر ہی ایک گیلری تک جاتی تھیں۔ ڈاکٹر حولیہ شاید کہیں چھپنے کے لیے ہی اس گیلری کی طرف گئی تھی۔ یہاں چرچ اور گھر کے استعمال کا

بہت سا سامان پڑا تھا۔ گیلری کے عین نیچے بی بی مریم کا ایک دھاتی مجسمہ تھا جس کے سامنے بہت سی شمعیں جل رہی تھیں۔ جب حولیہ نے سخت بدحواسی کے عالم میں کسی چیز کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی تو ایک سلنڈر اپنی جگہ سے لڑھکا اور گیلری سے نیچے ہال کمرے کے فرش پر آن گرا۔ زوردار آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی سلنڈر میں موجود گیس خارج ہونا شروع ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ زویا اور شامیر وغیرہ کچھ کرتے یا سمجھتے، گیس روشن موم بتیوں تک پہنچ گئی۔ ایک خوفناک پھنکار کے ساتھ گیس نے آگ پکڑ لی اور گیلری کے چوبی ستون دھڑا دھڑ جلنے لگے۔

ملازمائیں بُری طرح چلّائیں...... زویا اور شامیر بھی سکتہ زدہ سے رہ گئے تھے۔ یہ سب کچھ یوں آناً فاناً ہوا کہ کوئی کچھ بھی نہ کرسکا۔ اس رہائشی پورشن میں ستّر اسّی فیصد لکڑی ہی استعمال ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کھڑکیاں اور دروازے آگ کی زد میں آگئے۔

اب زویا کی ماما سارہ جیم بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اپنے اردگرد پھنکارتے شعلے دیکھ کر اس کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ اپنے بھاری جسم کو تیزی سے ہلکورے دے کر وھیل چیئر پر آن بیٹھی۔ بدحواس حولیہ آگ کی لپیٹ میں آنے سے بال بال بچی تھی اور لکڑی کے زینے پھلانگتی ہوئی نیچے اتر آئی تھی۔ دھواں پھیلتا جارہا تھا۔ شامیر بولا۔ ”زویا! تم عینی کو دیکھو، تمہاری ماما کو میں یہاں سے نکالتا ہوں۔“

وہ سارہ جیم کی کرسی کو دھکیلتا ہوا اور بری طرح کھانستا ہوا پہلے والے کمرے میں آگیا۔ زویا نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغلی دروازہ فوراً بند کردیا۔ یوں یہ کمرا عارضی طور پر شعلوں اور دھوئیں سے محفوظ ہوگیا۔ اب باہر بھی موت تھی اور اندر بھی۔ لیکن باہر والا خطرہ کم سنگین لگ رہا تھا۔ کمرے کی دیواریں گرم ہوتی جارہی تھیں اور سانس لینا دوبھر ہورہا تھا۔ سارہ جیم اس نازک حالت میں بھی شامیر کو کوسنے سے اور واویلا کرنے سے باز نہیں آرہی تھی۔

زویا نے دہشت زدہ نظروں سے شامیر کو دیکھا۔ اس نے روتی ہوئی بچی کو سینے سے چمٹا رکھا تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی۔ ”شومیر! اندر کا خطرہ باہر کے خطرے سے زیادہ جان لیوا ہے۔ ہمیں باہر نکلنا چاہیے۔“

شامیر دائیں جانب والا دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا تو اس پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ تیزی سے پھیلتی ہوئی آگ اس طرف بھی آگئی ہے۔ دروازے سے باہر شعلے خونی درندوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ ”اوہ میرے خدا!“ اس کے خشک لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

ان دیواروں سے باہر اب قیامت کا شور تھا۔ بہت سے لوگ جمع ہوچکے تھے۔ وہ دیوانہ وار چلّا رہے تھے اور آگ بجھانے کی اپنی سی کوششیں کررہے تھے۔ پھر اس بے پناہ شور میں فائر بریگیڈ اور پولیس کی گاڑیوں کے سائرن بھی شامل ہوگئے۔ اندازہ ہورہا تھا کہ آگ نے چرچ کے ایک حصے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

دونوں ملازمائیں ان کے ساتھ اس کمرے میں نہیں پہنچی تھیں۔ شاید انہوں نے کسی دوسری جانب سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ اب پتا نہیں کہ وہ کامیاب ہوئی تھیں یا نہیں۔

زویا پکاری۔ ”شومیر! مجھے لگتا ہے کہ پچھلے دروازے کی طرف آگ ابھی نہیں گئی۔“

شامیر کھانستا ہوا اس دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ بھی پیتل کی میخوں سے سجا ہوا مضبوط لکڑی کا بلند و بالا دروازہ تھا۔ مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ یہ اندر کے علاوہ باہر سے بھی بند تھا۔ اندر والا اسلائڈنگ بولٹ تو شامیر نے کھول دیا مگر اسے باہر سے کیسے کھولا جاسکتا تھا۔ زویا اور حولیہ بلند آواز میں مدد کے لیے پکارنے لگیں، دروازوں کو پیٹنے لگیں۔ اس شورِ محشر میں کسی نے ان کی فریاد پر توجہ نہیں دی۔

تو کیا یہ آخری لمحے ہیں؟

کیا اس کی زویا اپنی بچی سمیت اس کے سامنے جل مرے گی؟

کیا وہ سب یہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دیں گے؟

نہیں...... وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی اسے بچائے گا۔ وہ ثابت کرے گا کہ اس کی محبت ہوس نہیں تھی، خودغرضی نہیں تھی۔

وہ سب بُری طرح کھانس رہے تھے۔ اس کا اپنا سانس بھی سینے میں اٹک رہا تھا۔ حدت بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے چودہ پندرہ فٹ کی بلندی پر واقع روشندان کو دیکھا۔ وہ ایک الماری پر چڑھ کر اور ایک کارنس پر پاؤں جما کر روشندان تک پہنچ گیا۔ اس نے ایک دھاتی صلیب کی ضربوں سے روزن کا مستطیل شیشہ توڑا اور پھر اس میں سے رینگ کر اور اپنے جسم کو بل دے کر باہر کود گیا۔ تین اطراف میں پھنکارتے ہوئے شعلے تھے مگر یہ شعلے ابھی کمرے کے عقبی دروازے تک نہیں پہنچے تھے۔ اس نے باہر سے دروازے کا دہکتا ہوا آہنی بولٹ کھولا اور پٹ وا کردیے۔ دھوئیں کے مرغولوں میں اسے زویا کی شبیہ نظر آئی۔ وہ بُری طرح کھانس رہی تھی اور گھٹنوں کے بل گری ہوئی تھی۔ اس

حال میں بھی اس نے اپنی معصوم بچی کو چھاتی سے چمٹا رکھا تھا۔ شامیر اسے اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے کر باہر آیا۔ اب وہ عقبی برآمدے میں تھے، مگر یہاں پھر آگ کی ایک دیوار ان کے سامنے تھی۔

شامیر نے زویا اور بچی کو ایک ترپال نما شیٹ میں لپیٹا اور بھاگتا ہوا آگ کے اندر سے گزر گیا۔ ترپال نما شیٹ کے ایک حصے کو آگ لگی تھی جسے لوگوں نے پانی ڈال کر فوراً بجھا دیا۔ شامیر نے دیکھا، یہاں سیکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ چرچ کے تقریباً نصف حصے کو تیزی سے پھیلتی ہوئی آگ نے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فائر بریگیڈ کی زیادہ تر توجہ چرچ کی جانب ہی تھی۔ صرف ایک گاڑی رہائشی پورشن کی طرف موجود تھی اور لگتا تھا کہ اس کا پانی بھی ختم ہو رہا ہے۔ فائرمین بدحواس تھے۔

زویا دلدوز لہجے میں بولی۔ ''شومیر...... ماما...... حولیہ۔''

پھر وہ ہجوم کی طرف دیکھ کر پکاری۔ ''کوئی مدد کرو...... میری ماں اور بہن اندر ہیں۔ خدا کے لیے...... خدا کے لیے۔''

سیکڑوں مقامی لوگ موجود تھے۔ وہ اپنے طور پر آگ بجھانے کی کوششیں تو کر رہے تھے مگر اپنی جان خطرے میں ڈال کر اندر جانا کسی کے بس میں نہیں تھا۔ یہ بس اس شخص کے بس میں تھا جو دور دیس سے آیا تھا، جو کسی سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا...... جو سفید فام جرمن تو نہیں تھا مگر انسان تھا...... اور انسانیت کے سارے تقاضے بھی جانتا تھا۔

کسی دوسرے کا انتظار کیے بغیر شامیر نے پھر کینوس کی شیٹ اپنے گرد لپیٹی اور آگ میں گھس گیا۔ دھواں دھواں کمرے میں اس کی نگاہ زویا کی والدہ سارہ جیم پر پڑی۔ دہشت اور گھبراہٹ کے عالم میں اس نے اپنی وہیل چیئر الٹالی تھی اور اوندھی پڑی تھی۔ اس کا نچلا دھڑ آگ کی زد میں تھا۔ شامیر نے ترپال کی مدد سے اس آگ کو بجھانے کی جزوی کوشش کی پھر سارہ جیم کو کندھے پر لادا اور موت کے منہ سے نکال لایا۔ وہ کھانس رہی تھی، چلّا رہی تھی اور حیرت میں ڈوبی ہوئی دہشت زدہ نگاہوں سے شامیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لوگ اسے لے کر ایمبولینس کی طرف لپک گئے۔ پولیس کاروں سے بار بار اعلانات کیے جا رہے تھے اور لوگوں کو دور ہٹنے کا کہا جا رہا تھا۔ خدشہ تھا کہ رہائشی حصے کی عمارت کسی بھی وقت منہدم ہو جائے گی۔

مگر شامیر کا ابھی تھوڑا سا کام باقی تھا۔ زویا کے چلّانے کی دردناک آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کی بہن ابھی اندر تھی۔ اب برآمدے کو لگنے والی آگ کی دیوار بہت بلند ہو چکی تھی۔ وہ نم ترپال کو اپنے گرد لپیٹ کر پھر آگ کی طرف بڑھا تو زویا نے تڑپ کر اس کا بازو تھام لیا...... ''نہیں شومیر...... اب نہیں...... اب نہیں۔'' وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ وہ اب اندر گیا تو واپس نہیں آئے گا۔

دیگر لوگ بھی شاید یہی دیکھ رہے تھے مگر شامیر کو یہ گوارا نہیں تھا۔ حولیہ کے لیے اس کے دل میں ایک ترس آمیز ہمدردی ہمیشہ موجود رہی تھی۔ حولیہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا تعلق بالواسطہ خود شامیر سے بھی تو تھا۔ سہراب والی اسٹوری کی وجہ سے زویا، نمرسی کے نشانے پر آئی تھی اور پھر زویا کی جگہ حولیہ انتقام کی بھینٹ چڑھی تھی (اپنے بچے سمیت) زویا بہن کے لیے بھی نوحہ کناں تھی اور شامیر کے لیے بھی چلّا رہی تھی۔ آخری فیصلہ شامیر نے ہی کرنا تھا...... اور اس نے کیا۔ اس نے ایک دم اپنا بازو زویا کی گرفت سے چھڑایا اور آگ میں داخل ہو گیا...... اندر داخل ہوتے ہی اس کی ترپال کو آگ لگ گئی تھی مگر وہ رکا نہیں۔ بری طرح کھانستا ہوا وہ دھوئیں اور شعلوں میں گھرے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ حولیہ بے ہوش ہو چکی ہے۔ کمرے میں شعلوں کی پھنکار کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر ہاتھ چلانے لگا۔ ترپال اب مکمل طور پر آگ پکڑ چکی تھی۔ اس کا سانس رکنا شروع ہو گیا۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے

پتا نہیں کب اس نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے حولیہ کے بے حرکت جسم کو محسوس کیا...... کب اسے اٹھایا، کب ایک ادھ جلے غالیچے میں جزوی طور پر لپیٹا...... اور کب باہر کی طرف لپکا۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ ترپال نما شیٹ اس کے جسم سے علیحدہ ہو چکی ہے۔ وہ آگ کی لپیٹ میں آ چکا ہے، اس کے سینے کے بال چرمر ہو رہے ہیں۔ اس کا گوشت جل رہا ہے اور وہ بھاگ رہا ہے...... وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ ہاں، حولیہ کو اٹھاتے ہوئے اس نے عقلمندی کا ایک کام ضرور کیا تھا۔ اپنی شرٹ کے نیچے سے کولٹ مستنگ پسٹل نکال کر وہیں آگ میں پھینک دیا تھا۔

☆☆☆

رونالڈو نمرسی، یوریل کے فرسٹ کلاس اپارٹمنٹ میں لگژری کوچ پر بڑے ایزی اسٹائل میں بیٹھا تھا۔ آج کل اس نے فرنچ کٹ ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور بال بھی کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس نے بالوں کا رنگ بھی ہلکا سرخ کر لیا تھا۔ یہ حلیہ اس کے چار سال پہلے والے حلیے

سے بہت مختلف تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جرمنی میں آسانی سے پہچانا نہیں جاسکتا۔ وہ آرتھر کے فرضی نام سے سفر کررہا تھا۔ اس کا سکھ پارٹنر انوپ سنگھ بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ جرمنی کی حدود میں داخل ہوچکے تھے جب نمرسی کو ہیری کے ذریعے برج برگ کے چرچ میں خوفناک آتشزدگی کی خبر ملی۔ ہیری نے اسے بتایا کہ آگ پھیلتے ہی فائر بریگیڈ اور پولیس کی درجنوں گاڑیاں موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ پولیس کی موجودگی میں ہیری اور اس کے ساتھی تتر بتر ہوگئے۔

ہیری نے بتایا تھا کہ شامیر شدید زخمی ہوکر اسپتال پہنچ چکا تھا۔ زویا کی والدہ بھی جھلسنے سے زخمی ہوئی ہیں...... افراتفری اور ہجوم کا فائدہ اٹھا کر دونوں بہنیں یعنی زویا اور حولیہ موقع سے غائب ہوچکی تھیں۔

نمرسی نے ایک بار پھر ہیری پر گالیوں کی بارش کی تھی...... اور اسے الٹا ٹانگنے کے پختہ ارادے ظاہر کیے تھے۔ اب وہ بے حد طیش کے عالم میں تھا...... اسے یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ عین موقعے پر آگ کیسے اور کس طرح لگی ہے؟

اس نے فادر جوناتھن سے رابطہ کیا۔ گرجے کی تباہی نے فادر کو بدحواس و نیم جان کررکھا تھا۔ اس سانحے میں فادر کی دو خاص ملازماؤں کے علاوہ ایک لاڈلا لے پالک بھانجا بھی موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ رورو کر فادر کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ غمزدہ فادر ہی سے نمرسی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ شامیر کو نازک حالت میں لیونا برگ کے اسپتال میں پہنچایا گیا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اس کے جسم کا ستّر فیصد حصہ جل چکا ہے......

☆☆☆

زویا نے عقلمندی اور حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اپنی بچی اور بدحواس حولیہ سمیت وہاں سے نکل آئی تھی۔ اب وہ لیونا برگ کے ایک ہوٹل میں موجود تھی۔ اسے سب سے زیادہ تشویش شامیر کے حوالے سے ہی تھی۔ اسے بری حالت میں لیونا برگ کے مرکزی اسپتال میں پہنچایا گیا تھا۔ زویا کا دل رو رہا تھا۔ وہ شخص جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا، اس کی نگاہوں کے سامنے شعلوں میں گھرا تھا اور بے دم ہوا تھا اور یہ سانحہ اس نے خود منتخب کیا تھا...... زویا کی خاطر اور اس کے پیاروں کی خاطر۔

حولیہ کے ایک بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آج تو وہ

بھی شامیر کے لیے بہت پریشان نظر آتی تھی۔ اس نے ابھی ابھی اسپتال فون کر کے تازہ صورتِ حال معلوم کی تھی۔
زویا نے بے تابی سے پوچھا۔ ''کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟''
حولیہ دکھ بھری آواز میں بولی۔ ''وہ برن یونٹ میں ہے۔ ٹریٹمنٹ ہو رہی ہے...... اس نے بار بار تمہارا نام لیا ہے......اور تمہاری اور عینی کی خیریت کے بارے میں پوچھا ہے۔ یقیناً اسے اندیشہ ہے کہ نمرہی کے لوگ تم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔''
زویا نے ایک سسکی لی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ''ہم سے زیادہ خطرہ شاید اسے ہے حولیہ۔ وہ اسپتال میں ہے اور یہ بات بدمعاشوں کا وہ ٹولا بھی جانتا ہوگا۔''
پھر جیسے ایکدم زویا کے ذہن میں نیا خیال آیا۔ اس نے اپنے سیل فون سے ٹام کا نمبر ملایا۔ چھٹیاں گزارنے کے بعد ٹام اپنی بیوی سمیت لیونا برگ واپس آچکا تھا۔ میڈیا کے ذریعے اسے ساری صورتِ حال معلوم ہو چکی تھی۔ وہ زویا سے بہت سے سوال پوچھنا چاہتا تھا تاہم زویا نے اسے منع کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''ٹام! اس وقت صرف میری بات سنو۔ مجھے شامیر کی طرف سے بہت اندیشہ ہے۔ اسے اسپتال میں بھی نقصان پہنچانے کی کوشش ہو سکتی ہے۔ تم ابھی اسپتال چلے جاؤ اور شامیر کے اردگرد موجود رہو۔ اگر کوئی بھی مشکوک شخص یا سرگرمی نظر آئے تو پولیس کو انفارم کرو......''
ٹام کو پوری بات سمجھا کر اس نے کال ختم کر دی۔ پتا نہیں کیوں آج اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی تھی۔ وہ بس گرتے ہی چلے جا رہے تھے۔ اسے یاد تھا، اس نے آخری بار شامیر کو آگ میں جانے سے بہت منع کیا تھا...... دوسروں نے بھی روکا تھا۔ حتیٰ کہ فائر مین بھی فائر سوٹ کے بغیر آگے نہیں بڑھ پائے تھے مگر وہ تو جیسے حولیہ کی زندگی کے سوا ہر بات فراموش کر چکا تھا۔
عینی سو رہی تھی۔ زویا نے خود کو واش روم میں بند کیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہیں دکھوں اور اذیتوں کے سوا کچھ نہ دے سکی......'' وہ بہ زبانِ خاموشی پکارتی چلی گئی۔

☆☆☆

برن یونٹ میں شامیر کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ دواؤں کے زیرِ اثر وہ کسی وقت گہری غنودگی میں چلا جاتا تھا۔ اس کے حواس کچھ بحال ہوتے تو وہ زویا اور اس کے اہلِ خانہ کے بارے میں پوچھتا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ خیریت سے ہیں۔ اسے یہ بھی پتا چلا تھا کہ زویا کی ماما سارہ جیم بھی اسی اسپتال میں ہیں۔ اگلے روز دوپہر کے وقت جب اسے اپنی حالت قدرے بہتر محسوس ہوئی تو اس نے اپنے قریب زویا کے گٹارسٹ دوست ٹام کو کھڑے دیکھا۔ ٹام نے سرگوشیوں میں اسے بتایا کہ زویا اور حولیہ بالکل خیریت سے ہیں اور لیونا برگ میں ہی کسی محفوظ جگہ پر موجود ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر زویا سے اس کی بات بھی کرا دے گا۔
شامیر نے کہا۔ ''ٹام! میں ایک بار زویا کی ماما سے بھی بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ یہاں آسکتی ہیں وھیل چیئر پر۔''
''یہ بہت مشکل ہے شامیر بھائی۔''
''تو پھر مجھے ان کے پاس لے جاؤ۔''
''یہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ آپ آئسولیشن ٹینٹ میں ہیں۔ ڈاکٹر آپ کو یہاں سے ہلنے کی اجازت بھی نہیں دیں گے۔''
''تو پھر......فون پر ہی......'' شامیر کی بات ادھوری رہ گئی۔ سینے کی طرف سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ صرف ایک زیر جامہ پہنے ہوئے تھا جو کوارٹر پینٹ کی شکل میں تھا۔ اس کے دونوں پہلوؤں، سینے اور پیٹ کے بیشتر حصے پر ادویات کا لیپ تھا۔ اس کے چہرے پر بھی ادویات لگائی گئی تھیں مگر اسے لگتا تھا کہ چہرہ زیادہ جھلنے سے محفوظ رہا ہے۔ اسی طرح بائیں بازو کا تھوڑا سا حصہ بھی آگ سے محفوظ رہا تھا۔
ٹام نے کوشش کی اور تقریباً ایک گھنٹے بعد ویڈیو لنک کے ذریعے زویا کی ماما سارہ جیم سے اس کی بات کرا دی۔ سارہ جیم کی ٹانگوں اور ایک بازو پر آگ کے اثرات ہوئے تھے۔ دھوئیں میں رہنے کی وجہ سے انہیں سانس کی بھی شدید تکلیف ہو گئی تھی۔ بہرطور اب وہ بہتر تھیں اور بستر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھیں۔
''آپ کیسی ہیں آنٹی؟'' شامیر نے پوچھا۔
''میں ٹھیک ہوں اور تم؟'' انہوں نے مختصراً کہا۔
''میں آپ کے سامنے ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کریں۔''
سارہ جیم نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔
وہ بولا۔ ''اگر کبھی مجھ سے جانے انجانے میں کوئی غلطی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں نے ہمیشہ آپ کو عزت کے مقام پر جانا ہے۔''
پہلے لگا کہ وہ کچھ کہنے لگی ہیں، مگر پھر صرف کھنکھار کر اور گلا صاف کر کے رہ گئیں۔ شامیر کا خیال تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ تو بولیں گی مگر وہ اب دوسری جانب دیکھ رہی تھیں۔

وہ ہولے سے مسکرایا۔ ”چلیں...... اتنا تو کہہ دیں کہ میں اتنا مطلب پرست اور خودغرض نہیں ہوں جتنا آپ کو لگا کرتا تھا۔“

”تم نے جو کچھ کیا، اس کے لیے شکریہ۔“ سارہ جیم نے اس کی طرف دیکھے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔ چہرے پر نرمی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

کہنہ اقدار اور تعصبات کی برف بہت سخت تھی بلکہ ایسی برف شاید ”برف“ رہتی ہی نہیں، پتھر بن جاتی ہے اور پتھر کو کون پگھلا سکتا ہے۔

اسی دوران میں سارہ جیم کی طرف ڈاکٹرز کی آمد ہوگئی اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

☆☆☆

ٹام اسپتال کی لابی میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ وقتاً فوقتاً زویا سے اس کا ٹیلی فونک رابطہ ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار شامیر سے زویا کی بات کرا دے مگر برن یونٹ میں آمدورفت آسان نہیں تھی۔ خصوصی اجازت کے ساتھ اور بعض اوقات خاص گاؤن وغیرہ پہن کر اندر جانا ہوتا تھا۔ فی الوقت ویسے بھی ایک سینئر ڈاکٹر مسلسل یونٹ کے اندر تھا۔ زویا کی ہدایت کے مطابق ٹام نے قرب وجوار پر گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ زویا کی طرح ٹام کے ذہن میں بھی یہ اندیشہ موجود تھا کہ نمرسی ٹولے کے لوگ اسپتال کے اندر بھی شامیر کو کسی طرح کا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔

لابی میں موجود ٹی وی پر نیوز چل رہی تھیں۔ ان نیوز میں چرچ میں آتش زدگی والی خبر بھی موجود تھی۔ اس خبر سے جڑی ہوئی دو تین تصویریں بھی دکھائی گئی تھیں۔ ایک تصویر سابقہ ٹی وی رپورٹر زویا کی تھی۔ دوسری باہمت شامیر کی تھی جس نے خود کو شدید خطرے میں ڈال کر چند افراد کی جان بچائی تھی۔ اس کے اقدام کو Heroic قرار دیا جا رہا تھا۔

ٹام نے ٹی وی سے نظر ہٹا کر سامنے دیکھا اور اچانک بے طرح چونک گیا۔ بالآخر اسے ایک مشکوک شخص لابی میں نظر آ گیا مگر غیر متوقع طور پر اس شخص کا تعلق نمرسی کے ٹولے سے نہیں تھا۔ اس شخص کو ٹام بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ زویا کا شوہر رابرٹ تھا۔ وہی شریف صورت لیکن بدباطن شخص جس نے زویا کی زندگی کو اپنے بے بنیاد شبہات کی وجہ سے عذاب بنا دیا تھا۔ وہ ایک آسیب کی طرح اس کی زندگی کو جکڑ چکا تھا۔ یہاں یقیناً وہ شامیر سے ملنے ہی آیا تھا۔ وہ بہت شریفانہ لباس پینٹ کوٹ اور ٹائی میں تھا۔

یہی وقت تھا جب رابرٹ کی نگاہ بھی ٹام پر پڑ گئی۔

وہ چند سیکنڈ کے لیے مبہوت کھڑا رہ گیا۔ پھر اس کے تیکھے نقوش کے اوپر طیش کا سرخ رنگ غالب آتا چلا گیا...... آنکھوں کے اندر شعلے رقص کرنے لگے۔ یہ رابرٹ کا وہی دوسرا روپ تھا جس کا ذکر زویا اکثر ڈرے ڈرے انداز میں کیا کرتی تھی۔

اپنے پتلے پتلے ہونٹ بھینچ کر وہ سیدھا ٹام کی طرف آیا اور بلاتردد اس کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ جرمنی میں پھنکارا۔ ”باسٹرڈ گوئیے! تو نے میری زندگی تباہ کر دی ہے۔ میں تیری جان لے لوں گا۔ تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اس نے جنونی کیفیت میں ٹام کو گھما کر کرسیوں پر دے مارا۔ کرسیوں پر موجود لوگ خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ رابرٹ پھر چنگھاڑا۔ ”تو نے میری بیوی کو...... میری بچی کو اغوا کیا۔ انہیں اپنے قبضے میں رکھا اور اب تیری اتنی جرأت ہوگئی ہے کہ میری چاردیواری پامال کرتا ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے دو زوردار گھونسے ٹام کے چہرے پر رسید کیے۔ اب ٹام سنبھل چکا تھا۔ اس نے اپنے دفاع میں ٹانگ چلائی۔ دبلا پتلا دراز قد رابرٹ اڑتا ہوا سا کئی قدم دور ایک میل نرس کے پاؤں میں جا گرا۔ ایک لمحے میں اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا تھا۔ وحشت کے عالم میں وہ ایک میڈیکل ٹرالی پر جھپٹا۔ ٹرالی کے نچلے پورشن میں سرجری کے کچھ آلات پڑے تھے۔ اس نے ایک تیز دھار نشتر نکالا اور بے دریغ ٹام کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ دوسرا وار اس نے ٹام کی گردن پر کیا جو اچٹتا ہوا اس کے کندھے پر لگا۔ وہ ایک دم جیسے وحشی بن گیا۔ تیسری مرتبہ اس نے پھر ٹام کے پیٹ کو نشانہ بنانا چاہا۔ جان بچانے کے فطری عمل کے تحت ٹام نے اس کی کلائی تھام لی۔ رابرٹ اسے وحشت کے عالم میں دھکیلتا ہوا ایک کونے میں لے گیا۔ دو پولیس والے اس کی طرف جھپٹے۔ انہوں نے اپنے سروس پسٹل نکال لیے تھے۔ ”رک جاؤ...... رک جاؤ۔“ وہ گرجے۔

پھر ایک تنومند پولیس والے نے رابرٹ کی گردن میں بازو ڈال کر اسے ٹام سے پیچھے ہٹانا چاہا۔ وہ جیسے اندھا ہو گیا تھا۔ وہ چنگھاڑتے ہوئے پلٹا اور پولیس مین پر بھی وار کیا۔ افقی رخ پر حرکت کرتا ہوا تیز دھار نشتر پولیس مین کی گردن پر کاری زخم لگا گیا۔ تب ایک فائر کی زوردار آواز آئی۔ دوسرے پولیس مین نے رابرٹ کے پاؤں پر گولی ماری تھی پھر اسے دبوچ لیا گیا۔ ٹام نے اپنا خون آلود پیٹ دونوں ہاتھوں سے دبا رکھا تھا۔ زخم سنگین تو تھا مگر بہت زیادہ

نہیں۔ وہ خود ہی دوڑتا ہوا ایمرجنسی وارڈ میں پہنچ گیا۔ زخمی گردن والا اہلکار فرش بوس ہو چکا تھا۔ اس کے لیے ''اسٹریچر...... اسٹریچر'' کی آوازیں بلند ہوئیں اور لوگ بھاگ دوڑ کرنے لگے۔

☆☆☆

اور یہ منظر تھا، ویانا کے اس اسپتال کا جہاں فارہ ایڈمٹ تھی۔ ایکسیڈنٹ کے بعد سے وہ تقریباً مسلسل بے ہوش تھی۔ اس کے سر کا ایک آپریشن ہو چکا تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے...... لیکن اس کے جسم کے کچھ اعضا پوری طرح کام نہیں کر رہے ہیں۔

دوسرے روز شام کے وقت فارہ کی والدہ ثمینہ کو افشاں کی والدہ سے وہ خبر ملی جس نے اسے سرتاپا ہلا دیا۔ افشاں کی والدہ نے انہیں ان شکوک کے بارے میں بتایا تھا جو ڈاکٹروں نے اور پھر پولیس والوں نے ظاہر کیے تھے۔ ابتدائی اندازے کے مطابق حادثے سے تھوڑی دیر قبل کسی نے فارہ کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ غالباً اس سے زیادتی کی کوشش کی گئی تھی۔ بہرحال حتمی رائے میڈیکل رپورٹ کے بعد دی جاسکتی تھی۔ خالہ ثمینہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ بیس گھنٹے گزرنے کے باوجود یہ بات پوری طرح ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ فارہ ایکدم اٹھ کر شامیر کے پیچھے کیوں دوڑ گئی تھی۔ اب یہ کڑی مل گئی تھی۔ اس خبیث بدذات نے فارہ کو بے آبرو کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر شاید اسے کمرے میں بے ہوش چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی تھی۔ انہوں نے خود ہی سارا تانا بانا بُن ڈالا۔

ایک نیلی آگ سی خالہ ثمینہ کے اندر روشن ہوگئی۔ انہوں نے اسپتال میں ہی واویلا شروع کر دیا۔ اپنی رانیں پیٹیں اور تب ایک بار پھر شامیر سے رابطے کی کوشش کی۔ یہ وہی وقت تھا جب لیونا برگ میں شامیر نے زویا کی کال کے انتظار میں اپنا موبائل آن کیا ہوا تھا۔

''ہیلو کون؟'' خالہ ثمینہ کے کانوں میں اس کی مدھم کمزور آواز ابھری۔

''کمینے...... بے فیض...... بدبخت...... حرامزادے......'' وہ چھوٹتے ہی اس پر پھٹ پڑیں۔ ''اس دن کے لیے تجھ پر ترس کھایا تھا...... اس دن کے لیے تیری یتیمی پر رحم کیا تھا۔ بے غیرت! تجھے ذرا شرم نہ آئی۔ جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔ میری کومل سی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا...... تو اسی وقت زمین میں کیوں غرق نہ ہوگیا۔''

دوسری طرف شامیر جیسے سناٹے میں تھا۔ اس کی حالت پہلے ہی ابتر تھی۔ خالہ ثمینہ کی اس اچانک یلغار نے اسے ادھ موا سا کر دیا۔ وہ کراہ کر بولا۔ ''خالہ...... خالہ! آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ میں شامیر بول رہا ہوں۔''

''مجھے پتا ہے تو کون بول رہا ہے۔ تو بدبخت باپ کا بدذات بیٹا ہے...... کسی بڑی گندی نسل کا خون مل گیا ہے ہماری نسل میں...... کمینے...... تیری وجہ سے میری فارہ زخموں سے چُور ہو کر اسپتال میں پڑی ہے۔ پتا نہیں کہ بچتی ہے یا مرتی ہے۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو میں تجھے چھوڑوں گی نہیں۔ تجھے پھانسی لگواؤں گی......'' وہ بولتی چلی جارہی تھیں۔

دوسری طرف شامیر نے کراہتے ہوئے انداز میں کچھ کہا، پھر جیسے گھبراہٹ میں فون بند کر دیا تھا۔

''ہیلو...... ہیلو۔'' خالہ ثمینہ فون کو ہونٹوں سے لگا کر دہاڑیں۔ تب انہوں نے فون صوفے پر پٹخ دیا۔

افشاں کی والدہ انہیں تسلی دینے کی ناکام کوششیں کرنے لگی۔ یہی وقت تھا جب افشاں کے والد اختر صاحب کچھ کاغذات لیے ایک کمرے سے نکلے اور تیز قدموں سے ثمینہ اور اپنی وائف کی طرف آئے۔ انہوں نے کاغذات پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''رپورٹ آگئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا اندیشہ غلط نکلا ہے۔ فارہ سے زیادتی یا زیادتی کی کوشش نہیں ہوئی۔ یہ مکمل رپورٹ ہے۔''

خالہ ثمینہ آنکھیں نکال کر بولیں۔ ''تو پھر کس نے کپڑے پھاڑے اس کے؟ کس نے زخم زخم کیا؟ اس رپورٹ میں کوئی گھپلا ہوگا۔ وہ کیوں اس طرح بھاگی، اس کے پیچھے اسٹیشن کی طرف؟ وہ صحافی ہے، اس نے رپورٹ میں ضرور کوئی ہیرا پھیری کرائی ہوگی۔''

''نہیں آپا'' اختر صاحب نے تحمل سے کہا۔ ''یہ آسٹریا ہے، یہاں اس طرح کے گھپلے نہیں ہوسکتے۔ یہ بالکل درست رپورٹ ہے۔ میں نے پڑھا ہے اسے۔ ہمیں تو شکر کرنا چاہیے۔''

''مگر یہ سب کیوں ہوا؟ وہ خبیث کیوں ایک دم بغیر بتائے بھاگا؟''

اختر صاحب نے ثمینہ کے اس سوال کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے ایک صفحے پر نگاہ جمائی۔ ''یہ دیکھیں آپا! یہاں لکھا ہے فارہ کے ناخنوں میں سے جو گوشت نکلا ہے، وہ اس کا اپنا ہی ہے۔ اس نے خود ہی اپنے جسم پر خراشیں ڈالیں، خود ہی اپنے کپڑے پھاڑے، اس کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بھی کسی کمرے سے نہیں افشاں کی کار کے اندر سے ہی ملی ہیں......'' وہ رپورٹ کے قابلِ ذکر حصوں کا ترجمہ

کر کے سنانے لگے۔

خالہ ثمینہ کا بے پناہ غیظ و غضب ماند تو پڑ گیا مگر وہ ابھی تک حقیقت کو پوری طرح تسلیم نہیں کر رہی تھیں۔ نہ ہی انہیں اس امر کا کوئی افسوس تھا کہ چند ہی منٹ پہلے انہوں نے شامیر سے کس طرح کی بدزبانی کی تھی۔ وہ بس ایک ہی بات کہتی جا رہی تھیں۔ ''آخر کچھ نہ کچھ تو ہوا ہے نامیری فارہ کے ساتھ...... اور جو کچھ بھی ہوا ہے اس نے کیا ہے۔''

وہ جانتی نہیں تھیں کہ جو کچھ کیا ہے انہوں نے خود کیا ہے۔ یہ وہی تھیں جنہوں نے اپنے ذہن میں اس بات کی تنگی پروان چڑھائی تھی کہ شامیر کے خاندان والے لڑکیاں دے تو دیتے ہیں لیکن اپنی برادری سے لڑکیاں لیتے نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک خواہش کو اپنی ضد بنایا...... اس ضد کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے طویل پلاننگ کی۔ کچے ذہن کی فارہ کے اندر دھیرے دھیرے اپنے اٹل خیالات کو ''انجیکٹ'' کیا۔ بتدریج اسے بھی ہٹ دھرمی کی منزل تک پہنچا دیا...... اور پھر وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

☆☆☆

زویا کو سب سے پہلے ٹام کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی تھی اور پھر یہ پتا چلا تھا کہ اسپتال میں اس کی کسی کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ شاید وہاں نمرسی کا کوئی ہرکارہ پہنچا ہے اور اس نے شامیر تک پہنچنے کی کوشش کی ہے...... مگر پھر ٹام کی بیوی کرسٹینا کی زبانی ایک بالکل دوسری ہی طرح کی اطلاع پہنچی اور اس نے زویا اور حولیہ کو ششدر کر دیا۔ جس کے ساتھ ٹام کا جھگڑا ہوا، وہ کوئی اور نہیں زویا کا شوہر رابرٹ تھا۔ وہ وہاں شامیر سے ملنے گیا تھا اور ٹام کو وہاں دیکھ کر اس پر جھپٹ پڑا۔

کرسٹینا اسپتال میں ہی تھی۔ اس کی زبانی یہ جان کر کہ ٹام کو ٹریٹمنٹ دے دی گئی ہے اور اب اس کے لیے خطرے والی کوئی بات نہیں، اسے تسلی ہوئی۔ پھر اسے کرسٹینا ہی کے ذریعے اس واقعے کی کچھ اور تفصیلات معلوم ہوئیں۔ پتا چلا کہ رابرٹ طیش میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ اسی وحشت کے عالم میں اس نے ایک باوردی پولیس اہلکار پر بھی حملہ کر دیا اور تیز دھار نشتر سے اس کو شدید نقصان پہنچایا۔ پولیس اہلکار اسپتال میں ایڈمٹ تھا اور اس کی حالت مخدوش تھی۔ رابرٹ کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

وہ ساری رات زویا نے سوتے جاگتے میں ہی گزاری۔ وہ اسپتال جانا چاہتی تھی ٹام کو دیکھنا چاہتی تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ شامیر کو دیکھنا چاہتی تھی۔ شامیر جس نے اپنی جان داؤ پر لگا کر اس کی زندگی بچائی تھی اور اس کے اہلِ خانہ کو یقینی موت کے منہ سے نکالا تھا۔

اس کے اندر ایک عجیب سا ابال پیدا ہو رہا تھا۔ ایک نامعلوم توانائی تھی جو اس کے ہر اندیشے کو پس منظر میں دھکیل رہی تھی۔ وہ شامیر کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ دوپہر تک وہ تقریباً یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسپتال جائے گی۔

یکایک حولیہ کی آوازوں نے اسے چونکایا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں اسے پکار رہی تھی۔ ''دیکھو زویا...... یہ دیکھو کیا ہو رہا ہے...... جلدی آؤ۔''

عینی کو گود میں اٹھائے، زویا لپکتی ہوئی حولیہ کے پاس پہنچی۔ ٹی وی پر ایک لائیو کرائم سین چل رہا تھا۔ ایک سیاہ رنگ کی لگژری کار ٹریفک کے قوانین کو روندتی ہوئی بڑی رفتار سے سڑک پر جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیٹرولنگ پولیس کی گاڑیاں تھیں اور ان کے سائرنوں سے فضا گونج رہی تھی۔ ایک ہیلی کاپٹر بھی سیاہ کار کے اوپر پرواز کر رہا تھا اور اس تعاقب کا فضائی منظر اسکرین پر پیش کر رہا تھا۔ کمنٹری کرنے والا دہائی دے رہا تھا...... ''اب تقریباً پندرہ منٹ ہونے کو آئے ہیں۔ ملزم ہار ماننے کو تیار نہیں۔ اب تک وہ درجن بھر گاڑیوں کو نقصان پہنچا چکا ہے۔ کم از کم دو راہ گیروں کو اس نے بے دردی سے کچلا ہے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو مزید جانی نقصان ہو سکتا ہے......''

حولیہ نے چینل تبدیل کیا۔ وہاں بھی اس سنگین تعاقب کو براہِ راست دکھایا جا رہا تھا۔ اس چینل کا کمنٹیٹر کہہ رہا تھا۔ ''اب یہ بات تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ یہ مفرور ملزم رونالڈ و نمرسی ہی ہے۔ کئی برسوں سے وہ انٹرپول کے علاوہ جرمن اتھارٹیز کو بھی شدت سے مطلوب تھا۔ اس کے زیادہ تر جرائم کا تعلق جرمنی سے ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تین چار سال تک جرمنی سے دور ہی رہا ہے۔ اس کا یہاں نظر آنا بالکل غیر متوقع تھا اور شاید اب بھی ہے مگر اب یہ تقریباً ثابت ہی ہے کہ یہ نمرسی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اس گاڑی میں ایک بندہ اور بھی سوار ہے، یقیناً یہ نمرسی کا کوئی قریبی ساتھی ہو سکتا ہے۔''

دفعتاً ایک پولیس کار نے سیاہ کار کو اوورٹیک کیا اور سائڈ مار کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ سیاہ کار بری طرح لہرائی اور پھر ایک بغلی سڑک پر مڑ کر ہائی وے پر آ گئی۔ تیز رفتار تعاقب ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ یہ لیونا برگ کی

سڑکیں تھیں۔

حولیہ اور زویا دونوں کے رنگ فق تھے۔ زویا نے کہا۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ خبیث یہاں پہنچے گا...... اور پہنچا ہے۔''

حولیہ نے حیران نظروں سے زویا کو دیکھ کر کہا۔ ''کیا...... تم...... یہ کہنا چاہتی ہو کہ نمرسی، شامیر کے لیے یہاں پہنچا ہے؟''

''شاید اسے یہاں کوئی اور کام بھی تھا، مگر وہ شامیر کے لیے اپنے اندر بہت کینہ رکھتا ہے۔ مجھے اور شامیر کو ایک ساتھ دیکھنے کے بعد اس کی نفرت اور بڑھی تھی۔''

پولیس کاریں گائیڈڈ میزائلوں کی طرح سیاہ کار کے پیچھے تھیں۔ زویا نے کہیں پڑھا تھا کہ جب چیونٹی کی موت آتی ہے تو اس کے پر نکل آتے ہیں...... اور جب گیدڑ نے مرنا ہوتا ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ شاید نمرسی کی شامت اعمال بھی اسے گھیر کر اس خوبصورت قصبے لیونا برگ تک لے آئی تھی...... اور اب یہ خوبصورت قصبہ اس کے لیے مکڑی کا جالا بن گیا تھا...... اس کا تعاقب اس اسپتال کے قریب سے ہی شروع ہوا تھا جہاں شامیر موجود تھا۔

ایک تبصرہ نگار جوشیلے لہجے میں بتا رہا تھا کہ کس طرح قریباً نصف گھنٹا پہلے اس سیاہ کار کو ایک چیکنگ اسپاٹ پر روکا گیا اور پھر کس طرح نمرسی کی شناخت ہوئی اور کس طرح وہ موقع سے فرار ہوا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ اب یہ تعاقب زیادہ طول نہیں پکڑے گا۔ تعاقب کرنے والی پولیس کاروں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی تھی۔ اب وہ جارحانہ انداز اختیار کر رہے تھے۔ پھر ایک مناسب جگہ دیکھ کر اگلی دو پولیس کاروں نے سیاہ کار کو سائڈ کی طرف دھکیلا۔ بہتر یہ تھا کہ وہ اپنی رفتار کم کر لیتا مگر اس نے اندھا دھند پولیس کار کو جوابی ٹکر رسید کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی گاڑی خطرناک طریقے سے لہرائی اور پھر کئی قلابازیاں کھا گئی۔ اس کے پچھلے حصے میں آگ لگ گئی تھی۔ گاڑی کی حالت دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ سواروں کی حالت کیا ہوئی ہوگی۔ ان کے بچنے کے امکان نظر نہیں آ رہے تھے۔ نیوز کاسٹر اور کمنٹیٹر ہیجانی انداز میں چلا رہے تھے۔ زویا نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

☆☆☆

اسپتال میں شامیر کی طبیعت سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ یہاں بہترین طبی سہولتیں موجود تھیں...... شامیر کے اپنے اندر بھی زبردست ''ول پاور'' موجود تھی مگر اس کے جسم کا تقریباً ساٹھ فیصد حصہ آگ سے متاثر ہو چکا تھا۔ سینہ، پیٹ، ایک پہلو اور ٹانگوں کے نچلے حصوں کو زیادہ نقصان پہنچا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کا چہرہ محفوظ رہا تھا۔ کسی وقت وہ سوچتا اگر اس کا چہرہ بھی جل جاتا اور اسے پلاسٹک سرجری وغیرہ کا سہارا لے کر زندہ رہنا پڑتا تو اس کی زندگی میں کس طرح کے خلا پیدا ہو جاتے۔ بہرطور وہ اپنی طرف سے زیادہ پُرامید بھی نہیں تھا۔ اسے پتا تھا کہ جب جسم کا 50 فیصد سے زیادہ حصہ آگ سے متاثر ہو جائے تو پھر بندے کی حالت نازک ہی تصور کی جاتی ہے۔ وہ موت سے ڈرتا نہیں تھا۔ وہ کسی اور بات سے ڈرتا تھا۔ اگر اسے مرنے کی ''زحمت'' اٹھانا ہی پڑی تو کیا وہ یہ جانے بغیر مر جائے گا کہ اب زویا کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ ہے یا نہیں؟ کیا واقعی اب اس کے دل میں عہد رفتہ کی ساری یادیں دھندلا چکی تھیں؟ کیا وہ پیار جو ایک روز ٹرین نمبر 21 کے آخری اسٹیشن پر کھو گیا تھا، اب اپنی اصلی حالت میں کبھی واپس نہیں ملے گا؟

تیز دواؤں کے زیر اثر وہ غنودگی کے عالم میں سوچتا، وہ کب آئے گی؟ اسے کم از کم ایک بار تو آنا ہی تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ اس سے کہنے کے لیے کہ اس نے اس کے اور اس کے اہلِ خانہ کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالی۔ بہت بہت شکریہ۔ وہ اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

مگر کیا یہ کافی تھا؟ کیا یہ جملے اس گہرے زخم کا مداوا ہو سکتے تھے جو وہ کئی برسوں سے اپنے سینے میں لیے لیے پھرتا تھا...... اور جس زخم کو چند روز پہلے زویا نے مزید گہرا کر کے ایک گھاؤ بنا دیا تھا۔ فل مون ریسٹورنٹ میں اس نے شامیر کو صاف سیدھے لہجے میں بتا دیا تھا کہ اب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ اب وہ ماضی کو تقریباً بھول چکی ہے۔

اور پھر ایک روز وہ واقعی اسپتال میں آ گئی۔ شامیر کی حالت بہتر تھی۔ رات کا وقت تھا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر میز پر سر رکھے رکھے سو گئی تھی۔ وہ خود کو سنبھال کر آہستہ سے اٹھا اور کھڑکی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ گارڈن لائٹ میں، لیونا برگ کی بالکونیوں اور کیاریوں میں دہکنے والے ٹیولپ کے خوبصورت ترین پھول کچھ گملوں میں نظر آ رہے تھے۔ دھیمی بارش انہیں ہولے ہولے تھرکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ یکایک اسے اپنے عقب میں مدھم آہٹ محسوس ہوئی...... اور پھر کسی نے بڑی ہی آہستگی، بڑی ہی نرمی کے ساتھ اسے عقب سے تھام لیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے ساتھ لگ گیا اور وہ جانتا

تھا کہ وہ کون ہے؟ یہ وہی تھی...... یہ وہی گداز تھا اور یہ وہی خوشبو تھی اور یہ وہی دلربا انداز تھا۔

"یقین نہیں آرہا کہ یہ تم ہو۔" وہ اسی طرح کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے لرزیدہ آواز میں بولا۔

اس نے اپنے مخصوص دلنشین لہجے میں کہا۔ "شومیر! ہام کو بھی یقین ناہیں آرہا کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو۔ لگتا ہے کہ دعائیں رنگ لے آئی ہیں۔ شومیر! یوڈونٹ نو۔ ان ڈنوں میں (دنوں میں) ہام نے بہت یاڈ کیا ہے توم کو۔"

"صرف یاد ہی کیا ہے؟"

"ابھی تو گئی۔ اب...... توم سے پوچھنا ہے...... کہ تم...... کیا چاہتا ہوئیں گا۔"

"عینی کہاں ہے زویا؟"

"وہ ساتھ ناہیں آئی۔ توم نے اسے باہر تو نکال لیا تھا۔ پر وہ آگ سے ناہیں بچ سکی...... وہ گزر گئی ہے۔"

اچانک شامیر کو شدید دھچکا محسوس ہوا...... اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں پوری کھول دیں۔ وہاں نہ کھڑکی تھی...... نہ زویا تھی، نہ اس کا خوشبودار گداز تھا۔ وہ اسی طرح سفید بستر پر چت لیٹا تھا...... اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ابھی غنودگی کی حالت میں اس کے تصور نے اسے ایک ایسا منظر دکھایا تھا جو شاید اس کے دل کے نہاں خانوں میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی جاگ گئی۔ برن یونٹ کی سرمئی چھت، دواؤں کی بو، میڈیکل اسٹاف کی مدھم آوازیں، سب کچھ وہی تھا جو وہ پچھلے چھ سات روز سے دیکھ رہا تھا اور محسوس کررہا تھا۔

"کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" نرس نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لاکر مدھم آواز میں کہا۔

اس کا دل ایک بار پھر دھڑک اٹھا...... شاید وہی آئی ہو؟

مگر دو منٹ بعد جو اس کے بستر کے قریب آکر بیٹھا وہ کوئی اور تھا۔ وہ افشاں کے والد، مہربان چہرے والے انکل اختر تھے۔ ان کا چہرہ غم کی تصویر تھا...... اور یہ غم یقیناً شامیر کی حالت کے حوالے سے ہی تھا۔

انہوں نے شامیر کا بایاں ہاتھ تھام لیا اور دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ تسلی تشفی کی باتیں، اس کی صحت یابی اور بحالی کی باتیں۔ انہوں نے کہا۔ "شامیر! تم نے بڑی ہمت کا کام کیا ہے۔ یہ گورے آسانی سے کسی کی تعریف نہیں کرتے لیکن یہ تمہارے حوصلے کی داد دے رہے ہیں۔ اب بھی اسپتال کی مین لابی میں تین چار فوٹوگرافرز اور صحافی بیٹھے ہیں۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں مگر انتظامیہ کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہے۔ میں بھی بمشکل پہنچ پایا ہوں۔"

پھر انہوں نے اپنے اسمارٹ فون سے اتاری گئی ایک تازہ تصویر شامیر کے سامنے کی۔ "یہ دیکھو...... لیونا برگ اور برج برگ کے لوگ تمہیں کتنی محبت دے رہے ہیں۔"

شامیر نے دیکھا...... ایک بڑی مستطیل میز پر کئی درجن گلدستے رکھے تھے۔ "یہ سب تمہارے لیے ہیں۔ تمام اخباروں میں تمہاری تصویریں شائع ہوئی ہیں۔"

شامیر نے فون کی اسکرین سے نظریں ہٹاتے ہوئے نحیف آواز میں کہا۔ "انکل! خالہ اور فارہ کا کیا حال ہے؟ میں ان کے لیے بڑا پریشان ہوں۔"

انکل اختر نے ایک طویل سانس کھینچی اور بولے۔ "شکر ہے کہ وہ خیریت سے ہیں۔ فارہ کی حالت کو بھی اب خطرے سے باہر کہا جاسکتا ہے۔"

"لیکن ہوا کیا؟ مجھے تو کچھ پتا نہیں...... کچھ بھی پتا نہیں۔ میں جب آپ کے گھر سے نکلا تو فارہ بھی بالکل ٹھیک تھی۔" وہ جیسے کراہ اٹھا۔

جواب میں انکل اختر نے مختصر الفاظ میں سب کچھ اس کے گوش گزار کردیا۔ اسے بتادیا کہ اس کے نکلنے کے بعد وہ بے حد جذباتی ہوگئی۔ افشاں کی کار لے کر نکلی اور ایکسیڈنٹ کرابیٹھی۔

"اب وہ کہاں ہے؟" شامیر نے بے تابی سے پوچھا۔

"ابھی تو یہیں ہے مگر آپا ثمینہ اسے لے کر پرسوں واپس پاکستان جارہی ہیں۔ میں نے بہت کہا ہے کہ وہ اپنا ویزا بڑھوا لیں۔ یہاں فارہ کا علاج بہتر طریقے سے ہوسکتا ہے مگر وہ بہت ڈری ہوئی ہیں۔ جلد از جلد واپس جانا چاہتی ہیں۔"

"آ...... آپ کہہ رہے ہیں کہ فارہ اب ٹھیک ہے...... مگر علاج......؟"

انکل اختر چند لمحے کے لیے گم صم ہوگئے، تب دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔ "میں تمہاری مزاج پرسی کے لیے آیا ہوں، تمہیں پریشان کرنے کے لیے نہیں۔ یہ باتیں پھر کسی دن۔"

"نہیں انکل...... اس طرح میں مزید پریشان ہوجاؤں گا۔ تین چار دن پہلے مجھے خالہ ثمینہ کی طرف سے ایک کال ملی تھی۔ وہ کال میرے دماغ میں کھب کررہ گئی ہے...... میری تکلیف میں اضافہ کررہی ہے۔"

پھر شامیر نے اختصار کے ساتھ اس کال کے بارے میں بھی انکل اختر کو بتادیا۔

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر ٹھہری ہوئی آواز میں

بولے۔ ''فارہ کی جان تو بچ گئی ہے، مگر سر کی چوٹ بہت شدید تھی۔ اس کے جسم کا دایاں حصہ مکمل مفلوج ہوگیا ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اس کے لیے طویل علاج معالجے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی فارہ مکمل طور پر کبھی بھی ٹھیک نہیں ہوسکے گی۔''

شامیر کو جیسے چپ سی لگ گئی۔ انکل اختر نے چند لمحے کے توقف سے کہا۔ ''اور جس کال کا تم نے ذکر کیا ہے، وہ آپا ثمینہ کی غلط فہمی کا نتیجہ تھی بلکہ میں اسے ان کی بے وقوفی ہی کہوں گا...... فارہ کی مکمل رپورٹ آنے کے بعد یہ قیافہ بالکل غلط ثابت ہوا کہ شاید کسی نے اس پر دست درازی کی ہے...... اس نے اپنے ساتھ جو کچھ بھی کیا، اپنی ہی ہیجانی کیفیت کے زیرِ اثر کیا۔''

شامیر اور انکل اختر کے درمیان کتنی ہی دیر تک ایک بوجھل خاموشی طاری رہی۔ لگتا تھا کہ انکل وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں جو شامیر زبان پر نہیں لا رہا تھا پھر شامیر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''انکل! میری طرف سے خالہ کا دل صاف کرنے کی کوشش کیجیے گا۔''

☆☆☆

ناشتے کے بس دو تین نوالے بمشکل لے کر زویا نے پلیٹ ایک طرف کھسکا دی اور اخبار پر نظر دوڑانے لگی۔ اندرونی صفحے پر ایک خبر نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ اس شخص کے بارے میں تھی جس نے ازدواجی حقوق کی آڑ میں تین سال تک اس کا استحصال کیا تھا...... اس کی زندگی کو عذاب بنائے رکھا تھا...... وہ اب آہنی سلاخوں کے پیچھے تھا۔ خبر میں لکھا تھا کہ شہری پر قاتلانہ حملے کے جرم میں اور باوردی پولیس اہلکار کو شدید زخمی کرنے کے جرم میں اسے مجموعی طور پر کم از کم آٹھ سال اور زیادہ سے زیادہ تیرہ سال سزا کا ہونا یقینی نظر آتا ہے۔

وہ اطمینان کی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ آخر مکافاتِ عمل نے ایک بے لگام شخص کو نہایت سخت لگام ڈال ہی دی تھی۔

زویا اپنی بچی اور بہن خولیہ کے ساتھ اسی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ابھی وہ چند دن مزید منظرِ عام پر آنا نہیں چاہتی تھی مگر اب اسپتال سے دور رہنے کے حوالے سے تو اس کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ شامیر کا چہرہ ہر وقت نگاہوں میں گھومتا تھا۔ اسپتال میں اس کی حالت بدستور خراب تھی۔ وہ ہر صورت اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا ہر پل جیسے انگاروں پر گزر رہا تھا۔ عینی کو ڈائپر وغیرہ لگا کر اور اس کے فیڈرز تیار کر کے اس نے اسے خولیہ کے حوالے کر دیا اور حجاب اوڑھ کر اسپتال جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

اسپتال پہنچنے کے بعد بھی اسے شامیر تک پہنچنے کے لیے مزید دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ ''کئی ''فارمیلٹیز'' سے گزر کر اور اینٹی بیکٹیریال اسپرے وغیرہ کے بعد بالآخر وہ اس مختصر وارڈ میں داخل ہوئی جہاں شامیر زخم زخم حالت میں موجود تھا۔ اسے بستر پر اس حالت میں دیکھ کر زویا کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس نے خود کو بمشکل سنبھالا اور پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے پاس رکھی کرسی پر جا بیٹھی۔ شامیر کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے جسم سے تین چار ڈرپس ٹیوبز لگی ہوئی تھیں۔ اس کا دل رونے لگا۔ اس نے چند ہی سیکنڈ میں اسے سرتاپا دیکھ لیا۔ یوں لگتا تھا کہ شامیر کا بایاں ہاتھ کہیں سے بچنے جلنے سے محفوظ رہا ہے۔

زویا نے ہولے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''شومیر......'' وہ نرمی سے بولی۔

شامیر کو یہی لگتا تھا جیسے اس کا تصور اسے پھر بھٹکا رہا ہے۔ اس کی سماعت اسے ایک ایسی آواز سنا رہی ہے جس کا وجود ہی نہیں۔ مگر جب آواز دوبارہ اس کے کانوں میں پڑی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ سچ مچ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ ایک براؤن شال اس کے کندھوں پر تھی۔ اپنے کریم کلر حجاب کو اب اس نے دوپٹے کی شکل دے دی تھی۔ اس کے گھنے ریشمی بال چہرے پر ڈھلک کر ایک ''دلکش گڑھے'' کو نظروں سے اوجھل کر رہے تھے۔ وہ مسکرایا۔ ''میرے بازو پر چٹکی کاٹو تا کہ مجھے یقین ہو سکے کہ تم واقعی میرے سامنے بیٹھی ہو۔''

وہ آزردہ لہجے میں بولی۔ ''شومیر! اب کیسی ہے طبیعت؟''

''ایک دو منٹ پہلے تک تو زیادہ اچھی نہیں تھی۔'' وہ بھی انگلش میں بولا۔

''تم ٹھیک ہوجاؤ گے۔ انشاء اللہ چند دن تک سب کچھ اچھا ہوجائے گا۔ میں نے ابھی سینئر ڈاکٹر تھامسن سے بھی بات کی ہے۔''

وہ چند لمحے تک خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مژگاں پر چند ستارے اٹکے ہوئے تھے۔

''شکریہ ادا کرنے آئی ہو؟''

''جو کچھ تم نے کیا شومیر! وہ شکریے سے بہت آگے کی چیز ہے۔ اس کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اور نہ کبھی ہوسکیں گے۔'' وہ بمشکل بول پائی پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''مجھے بہت افسوس ہے کہ میں اتنے دن یہاں نہ

آسکی۔ تمہیں دیکھ سکی نہ ٹام کو اور نہ ماما کو۔ تم جانتے ہی ہو شومیر! حالات کیسے تھے۔''

رابرٹ کے بارے میں تو شامیر کو ٹام کی زبانی سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ نمرسی کے انجام کے بارے میں اسے بس اڑتی اڑتی سی بات معلوم ہوئی تھی۔ زویا نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ کس طرح جرمن پولیس کے ہتھے چڑھا ہے۔ وہ اب پولیس کسٹڈی میں تھا اور فرینکفرٹ کے اسپتال میں اس کی جان بچانے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔

نرس کی آمد ہوئی اور چند منٹ کے لیے زویا اور شامیر کی گفتگو کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد زویا نے کہا۔ ''شومیر! عینی کو حولیہ کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں، ورنہ حولیہ بھی یہاں آنا چاہتی تھی۔ وہ تمہارے لیے بہت فکرمند ہے۔''

شامیر کے خشک ہونٹوں پر پھر ایک موہوم سی مسکراہٹ ابھری۔ ''اور کون کون فکرمند ہے میرے لیے؟''

''میں ...... جانتی ہوں شومیر! تم صرف میرے اور عینی کے لیے دوبارہ لیونا برگ آئے تھے۔ تم نے مجھے ان حیوان نما انسانوں کے شکنجے سے نکالا مگر قسمت میں یہ سب کچھ بھی لکھا تھا جو ہوا ہے۔ میں سمجھتی ہوں میری اور میرے گھر والوں کی زندگی تمہاری مرہونِ منت ہے۔ کاش...... میں تمہاری یہ ساری تکلیف خود لے کر تمہاری جگہ اس بستر پر لیٹ سکتی۔''

''تم بس میرے لیے دعا کروزویا۔ میرے لیے جو دعا تم کرو گی، مجھے یقین ہے وہ میرے لیے کارگر ہوگی۔''

زویا نے شامیر سے اس کی خالہ اور کزن فارہ کا حال احوال پوچھا۔ اس نے مختصراً بتایا کہ وہ پاکستان واپس چلی گئی ہیں۔ (خالہ اور فارہ کے جرمنی ساتھ آنے والی بات، شامیر نے زویا کو برج برگ میں بتائی تھی)

وہ زیادہ دیر اس کے پاس نہیں بیٹھ سکتی تھی...... ملاقات کے لیے ایک مخصوص وقت تھا۔ بہرطور وہ جتنی دیر بھی رہی، شامیر کا حوصلہ بڑھاتی رہی اور امید افزا باتیں کرتی رہی۔ اس نے اسے اپنے ہاتھ سے سوپ پلایا اور دوا بھی کھلائی۔ وہ جانے لگی تو وہ ایکدم اداس ہو گیا۔ زویا نے وعدہ کیا کہ وہ پرسوں پھر آئے گی اور وہ جب تک یہاں رہے گا، وہ وقتاً فوقتاً آتی رہے گی۔ شامیر نے کہا۔ ''میری طرف سے عینی کو پیار دینا۔''

زویا کے جانے کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے تو خیریت سے گزرے تب پھر شامیر کے زخموں میں تکلیف بڑھ گئی۔ اس کی ٹانگوں پر سے بہت سی ناکارہ جلد کاٹی جا چکی تھی۔ ابھی اس طرح کی شاید مزید سرجری بھی ہونا تھی۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور نالج رکھنے والا شخص تھا۔ میڈیکل کے حوالے سے بھی اسے کافی معلومات حاصل تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح جھلس جانا کوئی معمولی حادثہ نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی داؤ پر لگ چکی تھی۔ اسے اپنی تکلیف سے لڑنے کے لیے اپنے اندر قوتِ مزاحمت پیدا کرنا تھی اور طویل علاج کے لیے بھی تیار رہنا تھا۔

☆☆☆

کار الٹتے وقت زیادہ چوٹ نمرسی کے سر پر آئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بازو میں فریکچر ہوا تھا اور گھٹنوں پر زخم آئے تھے۔ شروع میں اس کی حالت مخدوش نظر آئی تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایکسیڈنٹ کے وقت وہ گہرے نشے میں تھا۔ اسپتال میں چوتھے روز وہ ہوش میں آ گیا۔ اس کے بازو پر کہنی سے نیچے پلاستر چڑھا دیا گیا تھا اور باقی زخموں کو بھی ٹریٹ کیا گیا تھا۔ اس علاج معالجے کے دوران میں وہ پولیس کے سخت محاصرے میں رہا تھا۔ وہ کوئی عام مجرم نہیں تھا۔ ایک وقت تھا کہ جرمنی میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ بے شک اب اس کا گروہ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور وہ خود بھی جرمنی میں شاذونادر ہی قدم رکھتا تھا، مگر اس کی دہشت تو اب بھی برقرار تھی۔ وہ دو روز مزید ٹرنکولائزرز کے اثر میں رہا۔ اسی دوران میں اسے فرینکفرٹ سے دوبارہ برج ٹاؤن میں منتقل کر دیا گیا۔ قانونی معاملات کے لیے یہ ضروری تھا۔ جیل کے اندر ایک ''سیل'' میں اسے بڑی حفاظت کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا قریبی دوست انوپ سنگھ موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ بے شک یہ بھی نمرسی کے لیے ایک بڑا صدمہ تھا مگر جو اصل آگ نمرسی کے سینے میں بھڑک رہی تھی، اس کا تعلق زویا سے تھا...... اور اس کے پاکستانی ''عاشق'' شامیر سے تھا۔ وہ ان دونوں کے خون کی پیاس اپنے اندر اتنی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ گلے میں کانٹے سے پڑ گئے تھے۔ اب بھی وہ لاک اپ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس آگ کے شعلوں سے نبرد آزما تھا۔ وہ جانتا تھا، اب ان دونوں تک پہنچنا اس کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ وہ قانون کے شکنجے میں کسا گیا تھا اور اب نکلنا آسان نہیں تھا۔ یہاں جرمنی میں اب اس کے چند گنے چنے ساتھی ہی تھے اور ان سے رابطہ بھی ناممکن تھا۔

ایک بھاری آواز نے اسے چونکایا۔ یہ پولیس آفیسر ڈیوڈ تھا۔ ''اٹھو نمرسی ...... کورٹ میں تمہاری پیشی ہے۔''

نمرسی نے اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے اسے یوں گھورا جیسے کچا چبا جائے گا۔ شاید ان کے درمیان آہنی سلاخیں نہ ہوتیں تو وہ پولیس آفیسر پر جھپٹ ہی پڑتا۔

''تمہارے پاس تیار ہونے کے لیے بیس منٹ ہیں۔'' آفیسر نے دوبارہ کہا...... اور نمرسی کے کسی غصیلے فقرے سے بچنے کے لیے جلد واپس چلا گیا۔

وہ برج برگ ٹاؤن کا ایک بارشی دن تھا۔ ہوا بھی چل رہی تھی مگر ظاہر ہے کہ کورٹ کچہری کے کام تو رکنے والے نہیں ہوتے۔ دن گیارہ بجے کے لگ بھگ نمرسی کو کڑے پہرے میں پولیس وین تک پہنچایا گیا۔ سفر کے وقت قیدیوں کے ہاتھ اکثر پشت پر جکڑ دیے جاتے ہیں، مگر نمرسی کے ایک بازو پر چونکہ پلاسٹر چڑھا ہوا تھا لہٰذا اس کی ایک کلائی میں ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ اس ہتھکڑی کو وین کے اندر لگے ہوئے ایک آہنی کڑے کے ساتھ منسلک کر دیا گیا تھا۔ وین میں چار پولیس اہلکار تھے جن میں سے تین مسلح تھے۔ ڈرائیور اس کے علاوہ تھا۔ یہ لوگ جانتے نہیں تھے کہ آج، جیل سے کورٹ تک کا سفر ان کی زندگی کا کٹھن ترین سفر ثابت ہونے والا ہے۔ جو کچھ ہوا قطعی غیر متوقع تھا۔ جرمنی کے اکثر شہروں اور قصبوں کی طرح برج برگ میں بھی سی سی ٹی وی کیمروں کی بھرمار تھی۔ یہ ہر طرح سے ایک سیف ٹاؤن تھا، جرائم کی شرح بھی بہت کم تھی مگر اس ''شرح'' کو تہ و بالا کرنے والا ایک شخص اس ٹاؤن میں موجود تھا اور وہ ماضی کا خطرناک گینگسٹر رونالڈ ونمرسی تھا۔

سخت سردی، بارش اور دھند کی شدت کے سبب شاید نگرانی ونگہبانی کا ''لیول'' وہ نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ پولیس کی وین ایک نسبتاً کم آباد ایریا سے گزر رہی تھی۔ دھند کی وجہ سے رفتار بھی زیادہ نہیں تھی۔ سڑک کی دونوں جانب درخت تھے۔ جونہی وین ایک موڑ کاٹنے کے لیے آہستہ ہوئی، درختوں کے اندر سے چند ہیولے نمودار ہوئے۔ ان کے چہروں پر اسکائی ماسک تھے اور ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ سب سے پہلے انہوں نے وین کی دائیں جانب والے دونوں ٹائر ہی برسٹ کیے۔ وین لہرا کر ایک فون بوتھ سے جا ٹکرائی۔ پولیس آفیسر ڈیوڈ نے اپنا سروس پسٹل نکالا اور ساتھیوں سے مخاطب ہو کر چلایا۔ ''جوابی فائر کرو۔'' اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی فائر کرنے لگا۔

اس نے ایک نقاب پوش کو عین اس کے سینے میں گولی ماری، مگر اگلے ہی لمحے وہ خود بھی ہٹ ہو گیا۔ مخالف سمت سے آنے والی گولی سیدھی ڈیوڈ کے سر میں لگی۔ وہ اوندھے منہ نمرسی کے اوپر گرا، اس کا پسٹل نمرسی کے پاؤں سے ٹکرایا۔

دونوں طرف سے اندھا دھند گولیاں چلیں۔ کم از کم تین پولیس اہلکار نشانہ بن کر گاڑی کے اندر ہی لڑھک گئے۔ ڈرائیور بھی نشست پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ نقاب پوشوں کی تعداد پانچ کے قریب تھی۔ وہ حاوی نظر آ رہے تھے۔ تاہم اسی دوران میں ایک اور پولیس کار شور مچاتی موقع پر پہنچ گئی۔ اس کار سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ سخت ابتری کا فائدہ اٹھا کر نمرسی نے ڈیوڈ کے پسٹل سے اپنی ہتھکڑی کی زنجیر پر دو تین فائر کیے۔ زنجیر ٹوٹتے ہی وہ وین میں سے نکلا اور درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ بارش اور دھند کی چادر نے اسے اپنے اندر چھپا لیا تھا۔

☆☆☆

فادر جوناتھن بھی برج برگ میں ہی تھا۔ چند روز پہلے ہونے والی آتش زدگی میں اس کی رہائش گاہ تو تقریباً ساری ہی جل گئی تھی، چرچ کا ایک تہائی حصہ بھی نذرِ آتش ہو گیا تھا۔ رہائشی حصے میں دو سسٹرز لقمۂ اجل بنی تھیں اور کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔ اب چرچ کے متاثرہ حصے سے ملبا وغیرہ ہٹائے جانے کا کام ہو رہا تھا۔ فادر جوناتھن غم سے نڈھال تھا۔ یہ غم دو طرح کا تھا۔

ایک تو چرچ میں ہونے والی آتش زدگی کے سبب اس کا لاڈلا بھانجا چل بسا تھا۔ اس کی عمر فقط دس سال تھی۔ ایک اور بڑا نقصان فادر کا یہ ہوا تھا کہ اس کی جمع پونجی کا ایک بڑا حصہ خاکستر ہو گیا تھا۔ یہ پونجی کرنسی نوٹوں کی شکل میں تھی، کم از کم ایک لاکھ یورو تھے۔ یہ وہ خطیر رقم تھی جو فادر نے چرچ کی آمدن اور چندے وغیرہ میں سے مختلف طریقوں سے بچائی تھی۔ اکثر قدامت پسند لوگوں کی طرح فادر جوناتھن بھی بینک کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ یہ رقم اس نے اسی عمارت میں چھپا رکھی تھی جو چرچ سے ملحقہ تھی اور فادر کی رہائش کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ چرچ اور رہائشی حصے کے نیچے ایک وسیع تہ خانہ موجود تھا۔ یہیں پر لکڑی کے ایک چھوٹے سائز کے خالی تابوت میں یہ یورو رکھے گئے تھے۔ آتش زدگی کے بعد جب فادر اپنی اس جمع پونجی تک پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا تھا کہ وہاں اب نوٹوں کی راکھ اور کچھ ادھ جلے نوٹوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ فادر کا دل جیسے اس کے سینے میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگا تھا۔ قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہی ہو جاتا مگر پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا تہ خانے سے باہر نکلا تھا اور اس کے مددگار اسے طبی امداد کے

لیے اسپتال لے گئے تھے۔
اب ان واقعات کو آٹھ دس روز گزر چکے تھے مگر فادر کے دل کی دھڑکن اور سانسوں کی روانی دوبارہ، پوری طرح بحال نہیں ہوسکی تھی۔ ہارٹ کا مریض وہ پہلے ہی تھا، اب بھانجے کی موت اور جمع پونجی کی بربادی نے اسے موت کے مزید قریب کردیا تھا۔ یوں تو وہ چل پھر رہا تھا، مددگاروں کے ذریعے چرچ کی بحالی کا کام بھی کروا رہا تھا مگر اس کی سانسیں بحال نہیں تھیں۔ وہ کھینچ کر سانس لیتا تھا اور ہر سانس کے ساتھ ایک آوازسی پیدا ہوتی تھی۔
اب بھی وہ چرچ کے ایک نیم تاریک گوشے میں لکڑی کی ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ایک درمیانی عمر کی ''نن'' نیم گرم پانی سے اس کے پاؤں دھو رہی تھی، اچانک اس کے فون کی بیل بجی۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسکرین دیکھی اور چونک گیا۔ کوئی نیا نمبر تھا۔ پہلے تو وہ سوچ میں پڑ گیا پھر ہاتھ کے اشارے سے اس نے نن کو باہر جانے کا کہا اور کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے نمرسی کی بھاری بھرکم لیکن کراہتی ہوئی سی آواز آئی۔
''فادر! میں پولیس کی حراست سے نکل آیا ہوں، لیکن مشکل میں ہوں۔ وہ باسٹرڈ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ مجھے فوری پناہ کی ضرورت ہے...... اور اس وقت آپ سے بڑھ کر مجھے کون پناہ دے سکتا ہے۔''
پادری جوناتھن کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا مگر پھر فوراً ہی اس کی گدلی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہوئی۔ وہ بولا۔ ''تم ...... کہاں ہو... رونالڈو اور یہ فون کس کا ہے؟''
''یہ فون اسی پولیس مین کا ہے جو میرے ایک ساتھی کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ میں نے اسی کا فون اور پسٹل لے لیا تھا اور میں چرچ سے قریباً ایک کلومیٹر دور ہوں۔ یہاں ایک ناکارہ ٹرک میں چھپا ہوا ہوں۔ یہاں اندھیرا ہے، اسٹریٹ لائٹ بھی کچھ فاصلے پر ہے۔ اس لیے ابھی تک ان کمینوں کی نظر سے بچا ہوا ہوں۔ میں یہ فون بھی پھینک دوں گا ابھی۔''
فادر نے رونالڈو نمرسی سے کچھ مزید معلومات حاصل کیں پھر اس سے کہا کہ وہ اپنے ایک کارندے کو گاڑی کے ساتھ بھیج رہا ہے۔
قریباً آدھ گھنٹے بعد نمرسی، فادر کے ساتھ چرچ کے بیسمنٹ میں موجود تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سفید پلاستر میں جکڑا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی اور ہتھکڑی کے ساتھ اسٹیل کی چمکیلی زنجیر کا کوئی ایک فٹ لمبا ٹکڑا تھا۔ فرار کے دوران میں بھی کچھ تازہ چوٹیں اور خراشیں نمرسی کے چوڑے چکلے جسم پر آئی تھیں مگر اسے ان کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ وہ فادر کو اپنے بچ نکلنے کے واقعے کے متعلق تفصیل سے بتا چکا تھا۔ کچھ تفصیل ٹی وی کے ذریعے بھی منظرِ عام پر آچکی تھی۔ تین پولیس اہلکار ہلاک اور دو شدید زخمی ہوئے تھے جبکہ نمرسی کو بچانے کے لیے پولیس وین پر حملہ کرنے والے پانچوں افراد موقع پر ہلاک کردیے گئے تھے۔ نمرسی کے علاوہ صرف ایک حملہ آور کے بارے میں شبہے کا اظہار کیا جارہا تھا کہ وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوا ہے۔
زخموں کی مرہم پٹی کے بعد نمرسی اب چرچ میں موجود قدیم شراب کی چسکیاں لے رہا تھا اور فادر سے کچھ روز پہلے ہونے والی آتش زدگی کے بارے میں بات کررہا تھا (اپنے پانچ بندوں کی ہلاکت کا، اس کے دل و دماغ پر کچھ زیادہ اثر محسوس نہیں ہوتا تھا)
''فادر! مجھے آپ کے بھانجے کی موت کا بہت افسوس ہے۔ اس کے علاوہ بھی جو نقصانات ہوئے ہیں، وہ بہت زیادہ ہیں۔ میں اس حرامزادی رپورٹر کو چھوڑوں گا نہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ وہ بھاگ کر یہاں چرچ میں چھپتی، نہ آپ مجھے اس کے بارے میں اطلاع دیتے...... نہ میرے بندے یہاں پہنچتے اور یہ آگ والا واقعہ بھی نہ ہوتا۔'' نمرسی کی آنکھوں میں جیسے شعلے پھنکار رہے تھے۔
فادر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''رونالڈو! جو ہونا ہوتا ہے وہ اپنے مقررہ وقت پر ہوجاتا ہے لیکن تمہاری یہ بات بالکل درست ہے کہ ان سارے نقصانات کا اصل سبب وہ زویا ہی بنی ہے۔''
''وہ...... اور اس کا وہ پاکستانی عاشق بھی۔'' نمرسی نے لقمہ دیا۔
''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ لڑکی خدا اور یسوع کی بنائی ہوئی ساری حدوں کو عبور کررہی ہے۔ اپنے باپ کے مذہب سے ابھی تک چمٹی ہوئی ہے۔ اپنے شوہر سے بے وفائی بلکہ غداری کی اس نے...... ایک مسلمان سے ناجائز تعلق قائم کیے۔ اپنی بوڑھی والدہ کی علی الاعلان نافرمانیاں کیں...... بلکہ دوسری بہنوں کو بھی اس کی ترغیب دیتی رہی ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے شاید جن کی اصلاح ممکن نہیں ہوتی اور توبہ کا دروازہ بھی جن کے لیے بند ہوچکا ہوتا ہے......'' فادر جوناتھن بات کرتے ہوئے کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔

آنکھوں میں طیش کی چنگاریاں تھیں۔

اپنے ''گرو'' کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر نمرسی کے غیظ وغضب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے آتشیں لہجے میں بولا۔ ''میں نے اس کو چھوڑنا نہیں ہے فادر...... اور نہ اس کے عاشق کو۔ میں اسپتال میں اسی عاشق نامراد کی طرف گیا تھا مگر پولیس سے سامنا ہو گیا اور پھر گرفتاری ہو گئی......''

''مگر اب وہاں بہت پہرا ہے۔'' فادر نے اس کی بات کاٹی۔ ''شاید تمہیں پتا چل ہی چکا ہو۔ زویا کا شوہر رابرٹ اس پاکستانی سے ملنے اسپتال گیا تھا۔ وہیں پر زویا کے دوسرے بوائے فرینڈ ٹام سے اس کا سامنا ہو گیا۔''

''ہاں فادر! یہ نیوز میں بھی سن چکا ہوں لیکن اس لعنتی زویا کے گرد تو پہرا نہیں ہے نا۔ اس تک تو پہنچا جا ہی سکتا ہے۔''

''مگر وہ اب لیونا برگ میں نہیں ہے۔ آگ لگنے کے بعد سے اس کا اور حولیہ کا کچھ پتا نہیں۔ نہ ہی ان کی طرف سے کوئی رابطہ ہوا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دونوں بچی سمیت یہاں کہیں برج برگ میں ہی ہوں......'' یکایک فادر جوناتھن کی گفتگو کو بریک لگ گیا۔ فادر اور نمرسی نے کہیں قریب ہی ایک آہٹ سنی تھی جیسے کوئی چیز فرش پر گری ہو۔ ''ایک سیکنڈ...... میں ذرا دیکھوں۔'' فادر نے کہا پھر گھٹنوں پر زور دے کر کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔ یہ اس تہ خانے کا خاص الخاص حصہ تھا۔ کسی ملازم، نن یا سسٹر کو اس جانب آنے کی اجازت نہیں تھی۔ پھر یہ آہٹ کیسی تھی؟ فادر نے کمرے سے باہر نکل کر دائیں اور بائیں والی مختصر راہداری میں نگاہ دوڑائی۔ اسے ایک ہیولا سا راہداری کے خم کے پاس اوجھل ہوتا نظر آیا۔

''کون؟'' فادر نے پکار کر پوچھا۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ اپنی حالت کے پیش نظر فادر کے لیے تیز چلنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے چار پانچ قدم تیزی سے اٹھائے، پھر رک گیا۔ واپس کمرے کی طرف پلٹا تو اسے ایک طاق میں رکھے شمع دان میں سے ایک موم بتی گری ہوئی نظر آئی۔ دیگر موم بتیوں کی طرح یہ بھی بجھی ہوئی تھی۔ وہ الجھن سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ کچھ دیر پہلے کوئی یقیناً یہاں موجود تھا۔

☆☆☆

زویا وہیں ہوٹل کے کمرے میں تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے ٹام کو فون کر کے اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ زویا کے غصیلے شوہر رابرٹ نے ٹام کو جو زخم دیا تھا، وہ تیزی سے ٹھیک ہو رہا تھا۔ بچی عینی، سویٹ کے ساتھ والے کمرے میں حولیہ کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ زویا بستر کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے کل والے مناظر گھوم رہے تھے۔ کل وہ اسپتال میں شامیر سے مل کر آئی تھی، تب سے اس کا دل مسلسل غم کے گھیرے میں تھا۔ کل کی ملاقات میں اس نے گاہے بگاہے شامیر کی آنکھوں میں ایک سوال تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کئی بار زویا سے پوچھا تھا...... زویا! کیا اب واقعی کچھ بھی باقی نہیں۔ کیا واقعی تمہاری محبت میں وہ شدت نہیں تھی جو میری محبت میں تھی؟ پلیز زویا! ایک بار، صرف ایک بار کہہ دو کہ اس رات تم نے لیونا برگ کے ریستوران میں جو کچھ کہا، وہ غلط تھا......

زویا سسک اٹھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکایا۔ سارے دن کی بارش اور دھند کے بعد رات کا آسمان بالکل صاف تھا۔ شاہ بلوط اور پائن کے اونچے پیڑوں کے اوپر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ انہی بلند پیڑوں کے پیچھے، تین چار کلومیٹر کی دوری پر وہ اسپتال تھا جہاں شامیر برن یونٹ میں پڑا تھا۔

زویا اسے کیسے بتاتی کہ پچھلے چار سال میں اس کے دل پر کیا بیتتی رہی ہے۔ اس نے کیسے کیسے خود کو تھاما ہے اور سنبھالا ہے۔ اس کا جذبہ سمندر سے گہرا اور وسیع تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کبھی کھل کر شامیر سے اپنے اس جذبے کا اظہار نہ کر سکی۔ مغربی معاشرے میں پروان چڑھنے کے باوجود وہ ایک مختلف لڑکی تھی۔ جذبات کے اظہار کے لیے زبان کو ذریعہ بنانا اس کے لیے ہمیشہ ہی مشکل رہا تھا اور یہ تو پھر محبت کے جذبات تھے۔ چار سال پہلے کے ان سنہرے دنوں میں اس نے جب بھی شامیر کے کسی محبت بھرے سوال کا جواب دینا ہوتا تھا، وہ اس کے عقب میں چلی جاتی تھی۔ اس کی کمر یا کندھے پر اپنی انگلی سے کوئی لفظ لکھ دیتی تھی۔ ایسے میں اس کے گال شرم سے دہک اٹھتے تھے۔ اپنی اس کیفیت پر اس کا کوئی بس نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اس کی لبنانی سہیلی خشامہ کہا کرتی تھی۔ ''تم رہتی فرینکفرٹ میں ہو مگر تمہاری ساری جڑیں انڈیا اور پاکستان میں ہیں۔''

وہیں بیٹھے بیٹھے وہ سوچنے لگی کہ اس نے سب سے پہلے شامیر کی محبت کا اقرار کب اور کس طرح کیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس وقت بھی اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تھا۔

بس ایک خوبصورت اشارہ تھا جس نے ان دونوں کو ایک دم اظہار اور اقرار کے مرحلے سے گزار دیا تھا۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔ بچپن سے کسی کو اپنا جھوٹا کھلاتی تھی اور نہ کسی کا کھاتی تھی لیکن اس روز اس نے تفریحی پارک میں شامیر کی چھوڑی ہوئی کولڈ ڈرنک تھامی تھی اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر ایک گھونٹ بھرا تھا...... اور اس ایک گھونٹ میں وہ سب کچھ سما گیا تھا جو شاید سیکڑوں جملوں میں بھی نہ سما سکتا۔ یکایک حولیہ کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔

''کیا سوچ رہی ہو زویا؟'' وہ پتا نہیں کب کمرے سے نکل کر اس کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔

''کک...... کچھ نہیں...... ویسے ہی۔'' وہ گڑبڑا گئی۔

حولیہ اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''زویا! وہ تمہیں بھول نہیں پایا اور شاید نہ کبھی بھول پائے گا۔''

زویا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی کلائی کے بینگل کو گھماتی رہی۔

''زویا! اس نے ہمارے لیے بڑی قربانی دی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ کوئی کسی کے لیے خود کو اس طرح خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ یہ اس کی غیر معمولی محبت کا ثبوت ہے۔ میں، جو ہمیشہ اس کے لیے منفی انداز میں سوچتی رہی ہوں، اب اس کے لیے بہت دکھی ہو رہی ہوں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''میں جانتی ہوں حولیہ۔''

''وہ بہت تکلیف میں ہوگا زویا۔ اسے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ تمہاری محبت کی ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں تم نے لیونا برگ میں اس سے بڑا سخت رویّہ اپنایا تھا۔ اس رویّے کے زخم بھی اس کی تکلیف میں اضافہ کر رہے ہوں گے۔''

''یہ رویّہ اپنانے میں جو تکلیف مجھے ہوئی ہے، تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو حولیہ۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا...... اور سوچو تو اب بھی کوئی چارہ نہیں۔ کیا تم گمان بھی کر سکتی ہو کہ ماما، شامیر کے حوالے سے کبھی اپنی سوچ بدلیں گی؟ وہ زمین آسمان ایک کر دیں گی، اپنی جان دے دیں گی۔ جس کو تم شامیر کی قربانی کہہ رہی ہو، وہ کتنی بھی بڑی ہو، ماما کی ضد اور نفرت سے بڑی نہیں ہو سکتی اور پھر...... وہ بے رحم جانور نمرسی۔ وہ گرفتار ہی ہوا ہے نا...... مرا تو نہیں۔ میں جانتی ہوں اسے شامیر سے پرانی عداوت ہے۔ وہ اس کے خون کا پیاسا ہے۔ شامیر اور اس کے گھر والوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو، وہ جرمنی سے نکل جائیں۔''

حولیہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''زویا! ابھی تو یہ دعا کرنی چاہیے کہ اس کی حالت بہتر ہو اور وہ اپنے زخموں سے ابھر سکے۔''

زویا کے لب بے ساختہ ''آمین'' کہنے والے انداز میں ہلے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے کناروں سے نمی پونچھی۔ حولیہ کا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ میں بھی یہاں برج برگ میں زیادہ دیر سلامتی سے رہ سکوں گی۔ مجھے دو چار ہفتوں میں ہی کہیں نہ کہیں نکلنا پڑے گا۔''

حولیہ نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''زویا! اگر تم نے نکلنا ہی ہے تو پھر...... پاکستان کیوں نہیں نکل جاتیں؟''

بڑی بہن کی بات سمجھتے ہوئے زویا کے چہرے پر کرب کے سائے پھیل گئے۔ اس نے بے حد بے قراری میں دائیں بائیں سر ہلایا۔ ''نہیں حولیہ! تم کچھ نہیں سمجھتی ہو۔ جس طرح یہاں ہماری ماما موجود ہیں، وہاں پاکستان میں بھی ایک ماما موجود ہیں۔ میں انہیں امو خالہ کے نام سے جانتی ہوں۔ انہوں نے......''

فون کی بیل نے زویا کو فقرہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ اس نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا۔ دراصل آتش زدگی والے واقعے کے بعد اس نے اپنی ''فون سم'' بدل دی تھی۔ حولیہ نے بھی فون بند رکھا ہوا تھا۔ اس نئی سم کا نمبر زویا کی قریبی دوست نومسلم مسز حامدہ کے سوا اور کسی کے پاس نہیں تھا۔ لیونا برگ سے یہ حامدہ ہی کی کال تھی۔

وہ چھوٹتے ہی جرمن زبان میں بولیں۔ ''شکر ہے اللہ کا، تمہاری آواز تو سننے کو ملی۔ میں بہت زیادہ پریشان تھی تمہارے لیے...... میری جان! کہاں ہو تم؟''

زویا نے کہا۔ ''فی الحال آپ یہ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔ جونہی حالات ذرا ٹھیک ہوئے میں خود آپ سے ملنے آؤں گی۔''

حامدہ کو چرچ کی آتش زدگی کے بارے میں سب معلوم تھا اور یہ بھی اندازہ تھا کہ اس سانحے کے پیچھے ان لوگوں کا عمل دخل ہے جنہوں نے لیونا برگ میں زویا اور اس کی بچی کو کئی روز یرغمال بنائے رکھا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''زویا! نیوز میں اور تبصروں میں پاکستانی شامیر کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ اس نے واقعی بڑی ہمت کا کام کیا ہے۔ بغیر فائر سوٹ کے وہ آگ میں گھسا اور جانیں

بچائیں۔ اللہ پاک اس کو صحت دے۔''

''بس دعا کیجیے۔'' زویا اتنا ہی کہہ سکی۔

حامدہ نے کہا۔ ''فادر جوناتھن کے حوالے سے بھی بڑا دکھ ہوا ہے۔ سنا ہے کہ رہائشی پورشن کے علاوہ چرچ کا ایک حصہ بھی جل گیا ہے...... اور پھر فادر کا دس سالہ بھانجا۔ انسانی جان کا تو کوئی بدل ہی نہیں ہوتا۔ فادر سے بات ہوئی ہے تمہاری؟''

''نہیں حامدہ! ابھی تک تو کوئی بات نہیں ہوئی لیکن اب سوچ رہی ہوں۔ کم از کم ان کے بھانجے کی بے وقت موت کا افسوس تو کرنا چاہیے۔''

''ضرور زویا! فادر سے لازمی رابطہ کرو۔ ویسے بھی علاقے میں ان کا اثر رسوخ ہے۔ اگر کچھ لوگ تمہارے اور شامیر کے درپے ہیں تو فادر اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔''

زویا نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی حامدہ سے یہ درخواست بھی کی کہ فی الحال وہ اس کا یہ فون نمبر کسی کو بھی نہیں دیں گی۔

حامدہ سے گفتگو ختم کرنے کے بعد اس نے فادر جوناتھن سے رابطہ کرنے کا سوچا، وہ ہر طرح سے ان پر اعتماد کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ انہیں اپنے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں بتا بھی دے گی تو اس میں کوئی خطرہ نہیں ہوگا، بلکہ بہتری کی شکل ہی نکلے گی۔ وہ ان سے یہ درخواست بھی کر سکتی تھی کہ وہ ماما کی خیریت کی طرف سے باخبر رہیں۔ اس کی ماما اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد اپنی بڑی بیٹی ایمہ کے پاس ''برلن'' جا چکی تھیں۔

اس نے فادر کا نمبر پریس کرنے کے لیے موبائل فون ہاتھ میں لیا مگر پھر کچھ سوچ کر واپس رکھ دیا۔ رات کے دس بج چکے تھے اور وہ جانتی تھی کہ فادر جلدی سونے کے عادی ہیں۔

☆☆☆

زویا کی لبنانی سہیلی خشامہ نے پچھلے ڈھائی تین سال میں اپنی ایک الگ دنیا ہی بسائے رکھی تھی۔ وہ پہلے روشن خیال بنی تھی، پھر آزاد خیال اور پھر مادر پدر آزاد...... وہ بڑے ٹھسّے سے خود کو سیکس ورکر کہتی تھی...... اور اپنے اس ''ورک'' کے لیے پورے فرینکفرٹ میں دندناتی پھرتی تھی۔

پانی جب نشیب کی طرف بہتا ہے تو پھر اس کی رفتار میں تیزی آتی چلی جاتی ہے۔ خشامہ کی بے راہ روی بھی ہر گزرنے والے دن کے ساتھ رفتار پکڑتی گئی تھی۔ نائٹ کلب، پب، ڈانس، شراب، منشیات، کون سی برائی تھی جو اس کی من مانیوں کے ریلے میں شامل نہیں ہوئی تھی۔ اپنے سارے پرانے رشتے ناتے اس نے توڑ دیے تھے۔ اس کا ناتا اجنبی مردوں کی خرمستیوں، پھنکارتی سانسوں اور آتش ناکیوں سے یوں استوار ہوا تھا کہ باقی سب کچھ ناقابلِ ذکر ہو گیا تھا۔ انہی ناقابلِ ذکر چیزوں میں زویا بھی شامل تھی۔

ہاں، نشیب کا سفر تیز رفتار ہوتا ہے۔ خشامہ بھی پست سے پست تر ہوتی گئی۔ ایک موقع پر اس کے ایک شرابی عاشق نے اس پر تیزاب پھینکنے کی ناکام کوشش کی جس سے اس کا کندھا جل گیا تھا۔ ایک مرتبہ خود اس نے نشے میں دھت ہو کر اپنے ایک دلال کا جبڑا توڑ دیا اور دو ماہ جیل میں کاٹے اور تین چار ماہ پہلے تو حد ہی ہو گئی تھی۔ ایک آئرش پھڈے باز نے اسے بغیر معاوضے کے مسلسل اپنی ''خدمات'' پر مجبور کیا تو وہ طیش سے پھٹ پڑی۔ ان میں جھگڑا ہوا۔ خشامہ نے اسے ایسا زوردار دھکا دیا کہ وہ پانچویں منزل کی کھڑکی توڑتا ہوا نیچے سڑک پر گرا۔ اس کے بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ خشامہ وہاں سے بھاگ گئی۔ اس کی خوش قسمتی کہ بعدازاں پولیس تفتیش کا رخ کسی اور طرف ہو گیا اور وہ صاف بچ گئی۔

اور پھر یکایک خشامہ میں ایک تبدیلی آئی تھی...... ایک حیران کن تبدیلی۔ اس کا دل اپنی تمام تر مصروفیات سے ایکدم اچاٹ ہو گیا۔ اپنے ماحول سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ پہلے تو اس کے دل میں آئی کہ خود اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے مگر پھر خیالات کا دھارا، روحانی سہارے کی طرف چل پڑا۔ ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سب چھوڑ کر چرچ سے وابستہ ہو جائے گی اور باقی زندگی اسی ڈھنگ سے گزارے گی۔ زویا اور آنٹی سارہ کے حوالے سے وہ فادر جوناتھن کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے فادر کا پتا چلایا۔ پھر وہ فرینکفرٹ کے رنگا رنگ شہر سے نکلی اور سیدھی برج برگ کے اس خوبصورت، پُرسکون قصبے میں پہنچ گئی۔ اب پچھلے قریباً ایک ماہ سے وہ یہیں چرچ میں فادر جوناتھن کے ساتھ بطور ''نن'' موجود تھی۔ اس نے باہر کی دنیا سے اپنا ناتا بالکل توڑ لیا تھا۔ فادر نے بھی اس کی کیفیات کو محسوس کرتے ہوئے اسے چرچ کے تہ خانے تک ہی محدود کر دیا تھا۔ وہ وہیں دو دوسری ننوں کے ساتھ رہتی تھی...... چند روز پہلے جب چرچ میں ہنگامہ ہوا اور آتش زدگی والا واقعہ پیش آیا، تب بھی وہ چرچ کے تہ خانوں میں ہی تھی۔ خوش قسمتی سے تہ

خانوں کا وہ حصہ آگ اور دھوئیں سے محفوظ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ آتش زدگی کے اثرات وہاں تک پہنچتے، فائر فائٹرز نے چرچ کے اس حصے کو ''آئسولیٹ'' کر دیا تھا۔

کل تک یہاں خشامہ کے لیے سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ وہ سنڈے کی سروس میں شریک ہونے کے لیے دس پندرہ منٹ کے لیے بیسمنٹ سے باہر بھی نکلی تھی...... اور ہمیشہ کی طرح فادر کی اسپیچ سے متاثر بھی ہوئی تھی، مگر کل رات ایک عجیب واقعہ ہوا جس کی پیدا کی ہوئی ہلچل ابھی تک اس کے دل و دماغ میں موجود تھی۔ جس کمرے میں خشامہ مقیم تھی، اس کا بلب ٹمٹمانا شروع ہو گیا۔ اندازہ یہی تھا کہ وہ ابھی فیوز ہو جائے گا۔ خشامہ نے مقدس انجیل ایک طرف رکھی اور موم بتی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ کہیں نہیں ملی۔ وہ مجبوراً تہ خانوں کے اس حصے کی طرف بڑھی جہاں جانے کی پابندی تھی۔ سینئر سسٹر بھی خاص حالات میں ہی اس طرف جا سکتی تھی۔ خشامہ لکڑی کے فرش پر دبے پاؤں چلتی ہوئی ایک راہداری میں داخل ہوئی۔ یہاں چرچ کی مخصوص خوشبو کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔

اچانک کچھ مدھم آوازوں نے خشامہ کے قدم پکڑ لیے۔ تجسس سے مجبور ہو کر اس نے ایک کھڑکی کی جھری سے اندر جھانکا اور...... پھر...... دم بخود رہ گئی۔ ایک بلب کی روشنی میں...... اس نے جس خطرناک صورت شخص کو فادر کے ساتھ بیٹھے دیکھا وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ کسی وقت جرمنی میں انڈر ورلڈ کے ایک خطرناک گروہ کا باس رہا تھا۔ اب بھی اس کی دہشت کچھ کم نہیں تھی۔ یہ شخص یہاں فادر کے ساتھ کیوں موجود تھا؟ اندر الیکٹرک ہیٹر روشن تھا۔ وہاں ہونے والی گفتگو کی مدھم آواز خشامہ کے کانوں تک بھی پہنچی۔

مدقوق چہرہ فادر جوناتھن نے کھینچ کھینچ کر سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ ان لوگوں میں سے ہے شاید، جن کی اصلاح ممکن نہیں ہوتی اور...... توبہ کا دروازہ بھی جن کے لیے بند ہو چکا ہوتا ہے۔''

رونالڈو نمرسی...... ہاں، وہ رونالڈو نمرسی ہی تھا۔ وہ طیش میں پھنکارا۔ ''میں نے اس کو چھوڑنا نہیں ہے فادر!...... اور نہ اس کے عاشق کو۔ میں اسپتال میں اسی عاشق نامراد کی طرف گیا تھا مگر پولیس سے سامنا ہو گیا اور پھر گرفتاری ہو گئی......''

''مگر اب وہاں سخت پہرا ہے۔'' فادر نے اس کی بات کاٹی۔ ''شاید تمہیں پتا چل ہی گیا ہو گا۔ زویا کا شوہر اس پاکستانی سے ملنے اسپتال گیا تھا، وہیں پر......''

فادر اپنی ہانپی ہوئی سانسوں کے ساتھ کھانسنے لگا۔ باقی کے الفاظ خشامہ کی سمجھ میں نہیں آئے۔ نمرسی کے ایک بازو پر سفید پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ کلائی میں اسٹیل کی چھوٹی سی زنجیر چمک رہی تھی، جو یقیناً ہینڈ کف کی تھی۔ خشامہ کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی تھی۔ اس نے زویا کا نام سنا تھا اور اس کے شوہر رابرٹ کا بھی۔ یہ کس زویا اور رابرٹ کی بات ہو رہی تھی اور یہ کس پاکستانی کا ذکر تھا؟ اس کی نگاہوں کے سامنے دراز قد، وجیہہ شامیر کا چہرہ گھوم گیا۔ کچھ ہی ہفتے پہلے فرینکفرٹ میں اس سے خشامہ کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں خشامہ نے زویا کی محبت کی جوت جلتے دیکھی تھی۔ وہ اسی کے لیے پھر یہاں آیا تھا...... اور اب...... نمرسی جیسا خطرناک قاتل اس کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ کیا گورکھ دھندا تھا؟

مزید وضاحت سے سننے کے لیے خشامہ نے اپنا کان کھڑکی سے لگانا چاہا تو اس کے گلے میں جھولتی ہوئی دھاتی صلیب کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹکرائی۔ ہلکی سی آہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے اندر کمرے میں نمرسی اور فادر کو چونکتے دیکھا۔ پھر فادر گھٹنوں پر زور دے کر اٹھے۔ خشامہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے قریب ہی موجود شمع دان میں سے ایک شمع لی اور تیزی سے واپس آ گئی۔

اب وہ کل سے شدید الجھن میں تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ فادر پر جو اندھا دھند اعتماد وہ کر رہی تھی، وہ بھی ڈانوں ڈول سا ہو گیا ہے۔ زویا اور شامیر کا تصور بار بار اس کے ذہن کو اتھل پتھل کر دیتا تھا۔

اچانک ایک آواز پر وہ چونکی۔ یہ کراہتی ہوئی آواز فادر کی تھی۔ وہ اسے بلا رہے تھے۔ شاید سینئر سسٹر اور خدمت گار آگا تہ خانے میں موجود نہیں تھی۔ (آگا تھا چونکہ باقاعدہ نن نہیں تھی، اس لیے وہ چرچ سے باہر بھی چلی جاتی تھی) خشامہ جلدی سے فادر کی آرام گاہ میں پہنچی۔ ان کی سانس بے حد الجھی ہوئی تھی۔ ہر سانس کے ساتھ ایک تکلیف دہ آواز کمرے میں گونجتی تھی۔ انہوں نے لرزاں ہاتھ سے دواؤں والے پلاسٹک بیگ کے لیے اشارہ کیا۔ خشامہ نے بیگ کے لیے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ فادر نے ہاتھ سے چھوٹے بغلی کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس کمرے میں پہنچی۔ فادر کے ذاتی استعمال کی اکثر اشیاء یہیں ایک منقش الماری میں رکھی رہتی تھیں۔ اس نے ایک دراز کھولی تو اس میں ریگزین کا ایک

تھیلا نظر آیا۔ اس میں بہت سے کرنسی نوٹوں کے ادھ جلے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ ہزاروں ہی یورو ہوں گے جو جل کر بیکار ہو چکے تھے۔ یہ آتش زدگی کے مختلف اثرات ہی تھے جنہوں نے فادر کو اس قابلِ رحم حالت تک پہنچایا تھا۔ ایک دراز میں سے اسے دواؤں والا چھوٹا پلاسٹک بیگ مل گیا۔ اس نے فادر کو دوا دی۔ ان ہیلر وغیرہ استعمال کرایا۔ چار پانچ منٹ بعد طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ خشامہ نے اپنا سفید لبادہ سمیٹا اور پلنگ کی پائینتی کی طرف بیٹھ کر فادر کی ٹانگیں دبانے لگی۔ پتا نہیں کیوں اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ فادر سے زویا وغیرہ کے بارے میں کچھ پوچھے اور اپنے شبہات رفع کرے۔ نمرسی کے حوالے سے کچھ پوچھنا تو اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

اچانک فادر کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ فادر نے لرزتے ہاتھوں سے فون اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے جو آواز کانوں میں پڑی، اس نے فادر کے مدقوق چہرے پر ہیجانی کیفیت پیدا کردی۔ ”تت...... تم...... کہاں تھی زویا...... تمہارا نمبر بھی بند جارہا تھا...... میں...... بہت پریشان تھا۔“

خشامہ کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اسی دوران میں فادر کو اپنے پاس خشامہ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے خشامہ کو باہر نکلنے کا کہا۔ وہ فوراً باہر آگئی اور دروازہ بند کردیا۔ اس نے ابھی فادر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھرتے دیکھی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی چھٹی حس اعلان کر رہی تھی کہ فادر جوناتھن وہ نہیں ہیں، جو وہ اب تک انہیں سمجھتی رہی ہے...... اور فادر ہی کی وجہ سے زویا کو کوئی شدید قسم کا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔

کمرے سے نکل کر اس نے دروازے سے کان لگانے کی کوشش کی مگر باقی دونوں NUNS بھی آس پاس موجود تھیں۔ یہ کوشش خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آگئی۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ دھڑکن میں اس اضافے کی ایک وجہ یہاں ماضی کے خطرناک ڈان رونالڈو نمرسی کی موجودگی بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ چار سال پہلے میونخ میں زویا کی فیملی جس سنگین واردات کا شکار ہوئی، اس کے پیچھے رونالڈو کا ہاتھ ہی تھا۔ کیا فادر جوناتھن اور رونالڈو نمرسی، بے چاری زویا کو اس بات کی سزا دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنے باپ کے مذہب سے جڑی رہی...... اور اس نے ایک مسلمان نوجوان سے محبت کی؟

جب سے خشامہ کی کایا کلپ ہوئی تھی، اس کا زاویۂ نگاہ بھی پوری طرح بدل گیا تھا۔ جن لوگوں کے بارے میں وہ بہت منفی انداز میں سوچتی تھی، ان کے بارے میں مثبت انداز میں سوچنے لگی تھی۔ اب اکثر اسے زویا کی یاد بھی آتی تھی۔ اس کی وہ ساری اچھی باتیں اور عادتیں جو ایک ”روم میٹ“ کے طور پر اس نے دیکھی اور سنی تھیں۔ زویا کی سحر انگیز شخصیت، اس کا ایثار، قربانی اور خدمات کا جذبہ، اس کا بے مثال تحمل اور پیار۔ باطنی کے علاوہ وہ ظاہری خوبیوں کے حوالے سے بھی منفرد تھی۔ دل میں اترتی ہوئی اس کی مسکراہٹ سب سے جدا تھی۔ اس مسکراہٹ کو اس کے گال میں پڑنے والا دلکش گڑھا اور حسین بنا دیتا تھا اور پھر بات کرتے ہوئے اس کا اپنے نچلے ہونٹ کو ہولے سے دانتوں میں دبانا اور چھوڑنا، شرمگیں لمحوں میں اس کے عارض کا سرخ ہونا اور حیا کے رنگ چہرے پر بکھرنا...... اسے سب کچھ یاد آنے لگا...... تو کیا وہی زویا، نمرسی کی وحشت کا شکار ہونے تو نہیں جارہی تھی؟ وہ کانپ گئی۔

☆☆☆

کل شام کے بعد زویا نے فادر جوناتھن کو فون کرکے اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا تھا اور ان کے بھانجے کی حادثاتی موت پر دلی افسوس کا اظہار بھی کیا تھا۔ حولیہ نے بھی فادر سے مختصراً بات کی تھی...... اور فادر کو بتایا تھا کہ حملہ آوروں کے خوف کی وجہ سے وہ دونوں، آتش زدگی کے بعد فوراً روپوش ہوگئیں۔

فادر جوناتھن نے دونوں بہنوں کو تسلی دی اور کہا کہ نمرسی اور زویا کا شوہر رابرٹ دونوں گرفتار ہوچکے ہیں پھر پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟ زویا نے فادر کو اس ہوٹل کا بتانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا تھا، تاہم اتنی گزارش کی تھی کہ وہ ابھی دو چار دن یہیں پر رہنا چاہتی ہیں اور کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتیں۔

کہنے کو تو زویا نے فادر سے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ ابھی کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شامیر سے دور کیسے رہے۔ اسے اسپتال گئے دو روز ہوچکے تھے، وہ اب پھر جانا چاہ رہی تھی۔ شامیر کی حالت کا خیال کرکے اس کا دل کسی بے کل پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگتا تھا۔

”کہاں کھوگئی ہو؟“ بڑی بہن ڈاکٹر حولیہ نے اپنے زخمی بازو کی بینڈیج خود ہی کرتے ہوئے کہا۔

زویا نے کھڑکیوں سے باہر دور تک پھیلے ہوئے برج

برگ ٹاؤن کو دیکھا۔ کل کے صاف موسم کے بعد آج پھر دھند اتر آئی تھی، سردی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ برج برگ کی خوبصورت سڑکوں پر ٹریفک ویسے ہی کم ہوتا تھا اور ابر آلود موسم میں مزید کم ہو جاتا تھا۔ دھندلی شام تیزی سے رات کی طرف بڑھ رہی تھی۔ روشنیاں، آن ہو کر دھند سے نبرد آزما ہوگئی تھیں۔

زویا کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''حولیہ! ہم کیوں کچھ لمحوں کی اہمیت کو نہیں سمجھ پاتے۔ وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں...... اور پچھتاوے دے جاتے ہیں۔ چار سال پہلے ماما نے میرے اور شامیر کے درمیان ایک غلط فہمی کو جنم دیا اور وہ غلط فہمی بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھی کہ سب کچھ ہی نگل گئی۔ وہ یقین دلاتا رہا کہ اس نے ماما پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا اور میں مان کر بھی نہ مان سکی۔''

''محبت کی قسمت ایسی ہی ہے زویا! اور اس کی کہانی بھی تقریباً ایک ہی ہے...... محبت نے ''محبت کرنے والوں'' کا خون پینا ہی پینا ہوتا ہے۔ کوئی اداس دوپہر یا شام ایسی آنی ہی آنی ہوتی ہے جس میں بہتے آنسوؤں کے ساتھ الوداعی کلمے کہنا پڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دعاؤں میں یاد رکھنے کا وعدہ کرنا پڑتا ہے۔ ایک دوسرے کی نشانیاں واپس کی جاتی ہیں اور نشانیاں بھی تو بس ملتی جلتی ہی ہوتی ہیں۔ کچھ کرسمس یا عید کارڈ...... ایک دوسرے کو دیے ہوئے Ring، کچھ تفریح گاہوں میں اتاری ہوئی تصویریں، کچھ ٹوٹے ہوئے بٹن اور کچھ چاکلیٹوں کے سنبھالے ہوئے ریپر......''

''اچھا چپ کرو حولیہ!'' زویا نے جزبز ہو کر کہا۔ ''ایسی باتوں سے دل گھبرانا شروع ہو جاتا ہے۔ تم ذرا عینی کو دیکھ لو۔ میں اسپتال فون کر کے شامیر کی خیریت پوچھ لوں۔''

''کہتی ہو تو آج میں اسپتال کا چکر لگا لیتی ہوں۔ حجاب کی سہولت تو ہے ہی۔''

''نہیں حولیہ، کل چلی جانا۔'' زویا نے کہا اور فون کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆☆☆

رات بہت سرد تھی۔ تہ خانے میں تو پتا نہیں چلتا تھا تاہم سسٹر اگاتھا نے بتایا تھا کہ مطلع ابر آلود ہے اور دھند بھی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ دس بجے کا عمل تھا۔ نجانے آج کیوں خشامہ کی چھٹی حس خبردار کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے...... کچھ ایسا جو نہیں ہونا چاہیے...... ہرگز نہیں۔

وہ ابھی تک جاگ رہی تھی اور اپنے کمرے میں چکرا رہی تھی۔ چرچ کے گھنٹے نے ایک بار ''ٹن'' کی گونج دار آواز پیدا کی۔ اس کا مطلب تھا کہ ساڑھے دس بجے ہیں۔ چرچ کے ان تہ خانوں میں مکمل خاموشی تھی۔ سارا دن اٹھک پٹخ کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ یہ آوازیں اس تعمیری کام کا نتیجہ تھیں جو چرچ کی بحالی کے لیے کیا جا رہا تھا، اب ان آوازوں کی غیر موجودگی میں یہاں کا سناٹا اور بھی گمبھیر محسوس ہوتا تھا۔ ایک قریبی کمرے سے سینئر سسٹر اگاتھا کے خراٹوں کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ خشامہ کی ساتھی نن بھی سو چکی تھی۔

دل کی بے چینی سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ خشامہ کی نگاہوں کے سامنے بار بار وہ عجیب چمک آ جاتی تھی جو اس نے کل فادر جوناتھن کی آنکھوں میں کوندتے ہوئے دیکھی تھی۔ بالآخر خشامہ بستر کی حرارت کو ایک طرف دھکیل کر اٹھی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی بیسمنٹ کے ممنوعہ حصے کی طرف بڑھ گئی۔ آہستگی سے ایک آبنوسی دروازہ کھول کر وہ ایک نیم روشن راہداری میں آگے بڑھی۔ بی بی مریم کے مجسموں کے پاس سے گزر کر وہ اس کمرے تک پہنچی جہاں اس نے دو دن پہلے نمرسی کو دیکھا تھا۔ یکایک ایک آواز خشامہ کے کانوں تک پہنچی۔ یہ دبنگ آواز یقیناً نمرسی ہی کی تھی۔ ''آؤ...... آؤ خوش آمدید۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

خشامہ سرتاپا لرز گئی لیکن پھر اس پر یہ کھلا کہ یہ ''ویلکم'' کے الفاظ کسی اور کے لیے کہے گئے ہیں۔ کوئی ایسا شخص جو ابھی ابھی ایمرجنسی والے زینوں سے اس تہ خانے میں اترا ہے۔ ''معاف کرنا باس! تھوڑی دیر ہوگئی۔ دھند بہت تھی۔'' نووارد کی آواز ابھری۔

''کوئی بات نہیں۔ ابھی کافی وقت ہے۔'' نمرسی نے کہا، وہ نشے میں لگتا تھا۔

خشامہ اندر جھانکنے کی سعی کرنے لگی، مگر کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا۔ وہ گھوم کر دوسری طرف گئی اور یہاں ایک کی ہول نے اس کی کچھ نہ کچھ مدد کر دی۔

اس نے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ چوڑے چکلے رونالڈو نمرسی کی پشت نظر آئی۔ وہ سیاہ جیکٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے سامنے جیکٹ میں ہی ملبوس ایک اور شخص کھڑا تھا۔ یہ بھی جرمن ہی تھا۔ یہ دراز قد شخص غالباً موٹر سائیکل پر یہاں پہنچا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہیلمٹ تھا۔ اس شخص کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز، چند روز پہلے کے زخم کا ایک بدنما نشان تھا۔ اس نشان نے نہ صرف اس کی ایک آنکھ کو بے

طرح متاثر کیا تھا بلکہ کنپٹی سے لے کر ہونٹوں تک ایک گال کو بھی چیر کر رکھ دیا تھا۔ غالباً آنکھ والی بدنمائی کو چھپانے کے لیے ہی اس نے گہرے شیشوں والی عینک بھی پہن رکھی تھی۔

وہ نمرسی کے سامنے مؤدب کھڑا تھا۔ نمرسی طیش آمیز تاسف کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ ''......لعنت ہے، وہ ایک لڑکی سنبھالی نہ گئی تم سے؟ تھوبڑے کا ستیاناس کرالیا تم نے۔''

''بس باس! جو کچھ ہوا بالکل غیر متوقع طور پر ہوا......''

''کوئی بات نہیں، اب بھی جو کچھ ہوگا، غیر متوقع طور پر ہی ہوگا۔'' نمرسی کے لہجے میں زہریلے ناگ پھنکار رہے تھے۔

یہی لمحے تھے جب خشامہ نے پہلی بار دیکھا کہ گرانڈیل نمرسی کے ایک کان کے ساتھ، اونچا سنانے والا آلہ چپکا ہوا تھا۔ شاید ماضیِ قریب میں اسے کوئی چوٹ لگی تھی جس سے اس کی سماعت متاثر ہوگئی۔ اس خیال کو یوں بھی تقویت ملتی تھی کہ نمرسی کے سر کے پچھلے حصے پر کانوں کے آس پاس ایک پرانی چوٹ کا نشان دکھائی دیتا تھا۔ نمرسی جیسے جرائم پیشہ افراد کے لیے ''مار دھاڑ'' ایک معمول کا کام ہوتی ہے۔ شاید یہ زخم اور سماعت کا یہ نقص بھی کسی ایسی ہی معرکہ آرائی کا نتیجہ تھا۔

''کیا آج ہی رات جانا ہے؟'' نووارد نے مؤدب انداز میں پوچھا۔

''آج ہی رات...... بلکہ ابھی تھوڑی دیر میں۔'' نمرسی نے نیٹ وھسکی کے دو بڑے گھونٹ گلے میں اتارتے ہوئے کہا۔

''وہ ہے کہاں سر؟''

''اسی قصبے میں...... یہیں ایک ہوٹل کے کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔ بہن بھی ساتھ ہے۔ وہی جس کا ذائقہ تین چار سال پہلے بھی چکھ چکے ہو تم...... ڈاکٹر جولیہ۔''

نووارد کی آنکھوں میں ایک کمینی سی گرسنہ چمک نظر آنے لگی تھی۔

نمرسی نے فرش پر تھوکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کہا تھا حرامزادیوں سے، دوبارہ میرے راستے میں نہ آنا...... کبھی نہ آنا...... اسی شرط پر جاں بخشی ہوئی تھی ان کی۔ انہوں نے معاہدے کو توڑا۔ اس لعنتی ٹی وی رپورٹر نے پھر اپنے مسلمان عاشق کی راتیں گرمانے کے لیے اسے یہاں بلایا۔ اپنے جرمن خون میں ایک بار پھر گندی ملاوٹ کرنے کی کوشش کی۔ نہیں، اب معافی نہیں ملے گی...... اب نہیں...... کم از کم اس زویا کو تو ہرگز نہیں۔''

''یعنی...... فنش؟'' نووارد نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''فنش اور یادگار فنش۔'' نمرسی نشے میں پھنکارا...... یقیناً یہ ایک بے رحم قاتل کا لہجہ تھا۔

''فادر کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا...... مم...... میرا مطلب ہے، ان لڑکیوں کی ماں، فادر کے عقیدت مندوں میں سے ہے۔''

''مائیکل! جی چاہتا ہے کھینچ کر تیرے منہ پر جوتا دے ماروں...... لگتا ہے تیرے دماغ میں بھس بھرا گیا ہے...... یہ لڑکیاں اپنی ماں کے بس میں کہاں ہیں؟ خاص طور سے وہ باسٹرڈ زویا۔ وہ تو ہر حد سے گزری ہوئی ہے...... اس کا جانا اب ٹھہر گیا ہے اور یہ بات، فادر ہم سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں......''

پھر اچانک جیسے ادھیڑ عمر نمرسی کو کچھ یاد آیا۔ وہ کچھ بڑبڑایا جس کی آواز خشامہ کی سماعت تک نہیں پہنچ سکی۔ نمرسی نے اپنے کان کو چھوا اور مائیکل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''نیائی وی ایئر لے کر آئے ہو؟''

''یس باس...... یس!'' مائیکل نے مستعدی سے کہا اور اپنی جیکٹ کی جیب میں سے ایک نیا آلۂ سماعت نکال کر نمرسی کی طرف بڑھا دیا۔ نمرسی نے پرانے کی جگہ اسے اپنے کان پر چڑھایا اور مائیکل کی آواز سن کر مطمئن نظر آنے لگا۔ اب اس نے اپنا رخ تھوڑا سا پھیر لیا تھا اور خشامہ اس کا نشے میں تمتمایا ہوا کرخت چہرہ دیکھ سکتی تھی۔

نمرسی نے گلاس کے بجائے براہِ راست بوتل سے چند بدبودار آتشیں گھونٹ بھرے۔ اس کے گلے کی رگیں کچھ اور بھی پھول گئیں۔ وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ ''جو فلم چلنے والی ہے اس کی آڈیو بھی تو صاف ہونی چاہیے نا۔''

اس کی بات کی تہ میں پہنچ کر مائیکل کے چہرے پر بھی شیطانی مسکراہٹ بکھر گئی۔

خشامہ کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ کیا ہونے جا رہا ہے اور یہ جو کچھ بھی تھا، فادر جوناتھن کے ایما پر تھا۔ فادر کا اصل چہرہ بھی اب پوری طرح خشامہ کے سامنے آگیا تھا۔ اس کے باوجود وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ ایسا ہو رہا ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سب اندیشے بالائے طاق رکھے۔ بھاگتی ہوئی فادر کے حجرے تک

پہنچے۔ فادر کے سامنے دُہائی دے۔ اسے بتائے کہ یہ لوگ کیا کرنے جارہے ہیں، کیوں کرنے جارہے ہیں؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

اسی دوران میں نمرسی اٹھا اور اس نے الماری میں سے، سیاہ لیبل والی شراب کی نئی بوتل نکال لی۔ غالباً باہر سخت سردی میں جانے سے پہلے وہ خود کو پوری طرح گرم کرنا چاہتا تھا۔ اندر گلاسوں کی کھن کھناہٹ سنائی دینے لگی۔ نمرسی کی کلائی میں آج ہتھکڑی کی زنجیر کا ٹکڑا ابھی دکھائی نہیں دے رہا تھا...... دفعتاً خشامہ اپنی جگہ سے پلٹی اور تیزی سے چلتی ہوئی تہ خانے کے اس خاص حصے سے نکل آئی۔ پھر ایک راہداری میں ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی وہ اس کمرے تک پہنچی جو فادر کی آرام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ سخت بے تابی کے عالم میں اس نے دروازے پر دستک دی...... دوبار...... تین بار......اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

''فادر! دروازہ کھولیں...... فادر!'' وہ کراہ اٹھی اور پھر دستک دینے لگی۔

اسی اثناء میں فربہ اندام سینئر سسٹر اگاتھا گھبرائی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے ترش لہجے میں خشامہ سے پوچھا۔

''فف...... فادر سے بات کرنی ہے۔'' وہ ہانپی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔

''کیا بات کرنی ہے اس وقت...... اور تم دیکھ نہیں رہی ہو، دروازہ باہر سے بند ہے۔''

خشامہ نے پہلی مرتبہ دھیان سے دیکھا اور اسے پتا چلا کہ دروازے کو باہر سے چٹخنی چڑھی ہوئی ہے۔

''کہاں ہیں فادر...... اور...... اس وقت کہاں گئے ہیں؟''

''تو انہیں تم سے پوچھ کر جانا چاہیے تھا؟'' اگاتھا پھنکاری۔ پھر ذرا سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''صبح لیونا برگ میں کسی عقیدت مند کی تدفین ہے۔ انہیں وہاں جانا پڑا ہے، دوپہر تک لوٹیں گے۔ تمہیں ان سے کیا کام ہے؟''

خشامہ سے کوئی اور بات بن نہیں پڑی۔ اس نے سسٹر اگاتھا کو بتایا کہ اسے رات کو کمرے میں ڈر لگتا ہے۔ وہ فادر سے دعا کرانا چاہتی تھی۔

اگاتھا اس کے جواب سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی۔ غصے سے بولی۔ ''چلو جاؤ، اپنے کمرے میں...... اور تمہاری صلیب کہاں ہے، اسے گلے میں ڈالو۔''

ایک دو مزید ہدایات دینے کے بعد اس نے خشامہ کو واپس کمرے میں بھیج دیا۔

خشامہ کے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ زویا اور اس کی بڑی بہن حولیہ یہیں قصبے کے کسی ہوٹل کے کمرے میں ہیں اور آج رات ان کے ساتھ کچھ بہت بُرا ہونے والا ہے۔

اسے وہ سب کچھ یاد آرہا تھا جو کبھی اس کے اور زویا کے درمیان ہوا تھا۔ وہ زویا کی خوبیوں کی ہمیشہ معترف رہی تھی مگر جہاں کہیں مفاد کی بات آئی تھی، اکثر اس کی طرف سے زویا کے ساتھ زیادتی ہی ہوئی تھی اور وہ خدا کی بندی ایسی تھی کہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کبھی شکوہ زبان پر نہیں لائی تھی۔ خشامہ کو وہ اہم ترین واقعہ بھی یاد تھا جس نے زویا اور شامیر کے درمیان فاصلے پیدا کیے تھے اور وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے تھے۔ تقریباً چار برس پہلے کی وہ شام خشامہ کو یاد تھی جب زویا کی ماما نے شامیر پر الزام لگایا تھا کہ اس نے طیش میں آکر ان پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ تب خشامہ اس جھوٹے الزام کی گواہ بنی تھی اور اس نے بھی زویا کے سامنے کہا تھا کہ ایسا ہوا ہے۔ ان لمحوں میں اسے زویا کے چہرے پر جو ایک جانکاہ زردی پھیلتے ہوئے نظر آئی تھی، وہ آج بھی اسے یاد تھی۔ چند ہی لمحوں میں ایسی بہت سی باتیں خشامہ کے ذہن میں کرب کی لہریں جگا کر گزر گئیں۔

کسی نے جیسے اس کے اندر سے پکار کر کہا۔ ''خشامہ! تم نے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ہی اس نئی زندگی کو اپنایا ہے نا۔ اس سے بہتر کفارہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ اس بے گناہ کو، اس شیشے جیسی شفاف اور نازک دوست کو ایک بدترین حادثے سے بچانے کی کوشش کرو۔ کسی بھی طرح، کسی بھی حیلے سے۔''

قریبی کمرے سے سسٹر اگاتھا کے مدھم خراٹے ایک بار پھر سنائی دینے لگے تھے۔ وہ اٹھی اور بے تابی کے ساتھ کمرے میں چکرانے لگی۔

سامنے ہی دیوار پر فادر جوناتھن کی فریم شدہ تصویر نظر آرہی تھی۔ اسے لگا جیسے یہ تصویر اسے گھور رہی ہے۔ فادر کی تصوراتی آواز اس کی سماعت میں گونجی...... یہ کیا سوچ رہی ہو...... یہ کیا کرنا چاہ رہی ہو؟ نافرمانی کر رہی ہو......گناہ کی مرتکب ہورہی ہو......؟

خشامہ نے تصویر اتاری اور اوندھی کرکے کارنس پر رکھ دی۔

(جاری ہے)

خشامہ چرچ سے نکل کر سامنے کھڑی گاڑی میں گھس گئی تھی اور اب وہ گٹھڑی سی بنی گاڑی کی نشستوں کے عقبی خلا میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی تیز سانسیں اس کے اپنے ہی کانوں میں گونجتی رہیں۔ گاڑی کے اندر سردی تھی۔ شیشے دھندلائے ہوئے تھے۔ چرچ کا گھڑیال رات بارہ بجے کا وقت بتانے کے بعد خاموش ہو چکا تھا۔ بس کسی وقت کسی شب بیدار پرندے کی مدھم سی آواز گاڑی کے مختصر خلا تک پہنچ جاتی تھی۔

اچانک خشامہ کو اپنی کمر کے نیچے کسی سخت شے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے تھوڑی سی کروٹ بدلی اور ہاتھ عقب میں لے جا کر اس چیز کو ٹٹولا...... وہ حیران ہوئی۔ یہ ایک رائفل تھی۔ اس نے دیکھا، چھوٹی نال والی یہ آٹو میٹک رائفل خالی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک خم دار میگزین اٹیچ تھا جو یقیناً لوڈڈ تھا۔ آوارہ بدمعاش مردوں کی صحبت میں رہ کر خشامہ کو اسلحے کی تھوڑی بہت پہچان بھی ہو گئی تھی۔ کم از کم اتنا تو تھا کہ وہ موقع پڑنے پر اس رائفل کا ٹریگر دبا سکتی تھی۔ رائفل کی موجودگی سے اس کے دل میں جہاں ایک طرح کا خوف پیدا ہوا، وہیں اس نے ایک طرح کی تسلی بھی محسوس کی...... رائفل فلالین کے ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔

اس نے اپنی لرزاں انگلی کے ساتھ ٹریگر پر تھوڑا سا دباؤ ڈالا۔ اس نے حرکت نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ رائفل کا وہ کھٹکا دبا ہوا ہے جسے سیفٹی کیچ کہا جاتا ہے۔ اس نے اس سیفٹی کیچ کو چیک کیا۔ وہ یہ سب کچھ احتیاط کے طور پر کر رہی تھی۔ نمرسی یا اس کے ساتھی کے ساتھ الجھنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کی پلاننگ یہی تھی کہ وہ اس اسٹیٹ کار کے ذریعے نمرسی اور اس کے ساتھی کے ہمراہ ہی چرچ کے احاطے سے نکل جائے...... پھر آگے کہیں جا کر یہ کار جونہی آہستہ ہو، یا کسی سگنل پر رکے، وہ نکل بھاگے اور زویا وغیرہ کے لیے مدد طلب کرے۔

دھڑکنیں سرپٹ تھیں۔ خشامہ کی سماعت باہر کی آوازوں پر لگی ہوئی تھی۔ ابھی تک نمرسی اور اس کا ساتھی باہر نہیں آئے تھے۔ زویا کی من موہنی صورت ایک بار پھر اس کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہا کہ زویا اس کے سامنے ہو، وہ اس کی کلائی پکڑے اور اسے اپنے ساتھ سڑکوں اور تنگ گلیوں میں بھگاتی چلی جائے...... یہاں تک کہ اسے سب خطرات سے دور کر دے۔ پھر ہانپتی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ اس کے قدموں میں گر جائے۔ اس سے کہے۔ ''مجھے معاف کر دو۔''

وہ پوچھے۔ ''کس بات پر؟''

وہ جواب دے۔ ''ہر بات پر۔''

یکایک کچھ آہٹوں نے اسے چونکایا۔ یہ خشک پتوں پر متحرک قدموں کی آواز تھی شاید...... وہ کچھ اور بھی سمٹ گئی...... ساکت ہو گئی۔ کار کا دروازہ ایک دم کھلا۔ نمرسی کا دراز قد ساتھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ تب دوسری جانب کا دروازہ وا ہوا۔ مزید سردی کا ایک جھونکا اندر آیا، اس کے ساتھ ہی نمرسی کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ ''چلو اسٹارٹ کرو۔''

اسٹیٹ کار اسٹارٹ ہوئی اور پچاس ساٹھ میٹر لمبے ڈرائیو وے کو طے کر کے چرچ کے چوبی پھاٹک کے سامنے پہنچ گئی۔ گیٹ کا قفل کھولے جانے کی آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ چرچ کا مسلح چوکیدار ہی تھا۔ گاڑی چرچ سے نکلی اور ایک ہموار سڑک پر آگے بڑھنے لگی۔ دھند کی وجہ سے اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ نمرسی اور مائیکل کے اندر بیٹھتے ہی گاڑی میں الکحل کی تیز بو پھیل گئی تھی۔ خشامہ ڈری ہوئی ضرور تھی مگر ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ نمرسی کی آواز سنتے ہی آٹو میٹک رائفل پر اس کی گرفت بے ساختہ مضبوط ہو گئی۔ رائفل کا دستہ اور بیرل کا بیشتر حصہ اب بھی فلالین کے کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔

نمرسی نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''یہاں سے دائیں مڑنا ہے۔ آگے سیدھا ہی جانا ہے۔ وہ ہوٹل میرا دیکھا ہوا ہے۔ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ سیکیورٹی بھی نہ ہونے کے برابر ہوگی۔''

''پھر بھی اس کے کمرے کا دروازہ تو کھلوانا ہی ہوگا جناب۔''

''کوئی مسئلہ نہیں۔ کسی ویٹر یا بیرے کی کنپٹی پر پستول آئے گا تو دروازہ بھی کھلے گا اور راستہ بھی مل جائے گا۔'' نمرسی کے لہجے میں بے پناہ سفاکی تھی۔

ذرا وقفے کے بعد مائیکل بولا۔ ''اور وہ باسٹرڈ؟''

''ابھی تو وہ اسپتال میں ہے۔ خاصی سیکیورٹی میں ہے۔ باہر نکل آیا تو اس کو بھی دیکھ لیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں، دوبارہ یہاں آ کر اس نے اپنی موت کو خود آواز دی ہے۔''

مائیکل نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ ''اور دیکھا جائے باس تو چار سال پہلے اس منحوس کی آمد نے ہی ہماری مشکلات کا آغاز کیا تھا۔''

خشامہ سمجھ رہی تھی۔ مائیکل کا اشارہ یقیناً ڈبل اے چینل کی اسی انویسٹی گیشن کی طرف تھا جس کے نتیجے میں نمرسی اور سہراب کی ایک بڑی ناجائز پراپرٹی پکڑی گئی تھی۔

ان کی گفتگو جاری تھی۔ خشامہ جیسے ہزاروں فٹ کی بلندی پر ایک تنی ہوئی رسی پر کھڑی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا

کہ اس نے بلند آواز میں سانس بھی لی تو نمرسی اور مائیکل کو اس کی موجودگی کا پتا چل جائے گا۔ وہ بس اس انتظار میں تھی کہ کسی چوراہے پر گاڑی کسی ٹریفک سگنل پر رکے اور وہ دروازہ کھول کر نکل بھاگے مگر یوں لگ رہا تھا کہ اس سرخ اسٹیشن کار کو آج برج برگ کے سارے سگنل گرین ہی مل رہے ہیں یا پھر شاید رات کے اس پہر سگنلز کو ''یلو بلنکنگ'' پر کر دیا گیا تھا۔ گاڑی میں ہیٹر آن تھا اور خشامہ کا جسم پسینے میں نہانا شروع ہو گیا تھا۔

تب اسے ایک اور خطرہ لاحق ہو گیا...... اور یہ شدید ترین خطرہ تھا۔ نمرسی یا مائیکل میں سے کسی نے اسموکنگ شروع کر دی تھی۔ الکحل کے ساتھ ساتھ تمباکو کی بو بھی خشامہ کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ وہ خود بھی کبھی کبھار اسموکنگ کر لیتی تھی لیکن اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کھانسی آ جائے گی۔

کھانسی کا مطلب ایک دردناک صورتِ حال کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان لمحوں میں خشامہ نے محسوس کیا کہ شاید اس نے یوں اس کار میں گھس کر غلطی کی ہے۔ نمرسی جیسا خوفناک شخص اس سے بس چار پانچ فٹ کی دوری پر تھا اور وہ دم سادھے پڑی تھی۔

''موبائل ٹھیک سے چارج ہے؟'' نمرسی نے مائیکل سے پوچھا۔

''یس باس۔''

''کچھ یادگار قسم کے کلپس بھی ہونے چاہئیں۔ یہ بعد میں سارہ جیم اور اس کی فیملی کو دباؤ میں رکھنے کے کام آئیں گے......'' نمرسی کے لہجے میں شیطنت لشکارے مار رہی تھی۔

ان دونوں کی گفتگو گواہ تھی کہ وہ زدیا کو عزت اور زندگی دونوں سے محروم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حولیہ کو شاید زندگی کے حوالے سے رعایت مل جاتی۔

خشامہ نے ایک بار پھر اپنے پہلو کے ساتھ لگی ہوئی رائفل کو ٹٹولا اور اس کے اندر ایک طرح کی توانائی پیدا ہوئی۔

یہ سوال بھی اس کے ذہن میں ابھرا کہ یہ کس کی رائفل ہے؟

شاید یہ نمرسی نے ہی احتیاط کے طور پر یہاں رکھی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ رائفل جیسے بڑے ہتھیار کے ساتھ تو ہوٹل میں نہیں گھس سکتے تھے۔ اس کے لیے ان کے پاس یقیناً پسٹل وغیرہ ہوں گے۔ چرچ کے تہ خانے میں وہ نمرسی کے پاس ایک ایسا پسٹل دیکھ بھی چکی تھی۔ پسٹل دیکھ کر اسے یہی لگا تھا کہ وہ شاید کسی پولیس والے سے چھینا گیا ہے۔

یہاں موجود رائفل کے حوالے سے یہ امکان بھی تھا کہ نمرسی وغیرہ کو اس کے بارے میں معلوم ہی نہ ہو۔ جس طرح اس سرخ کار کا تعلق فادر سے تھا، اس رائفل کا تعلق بھی فادر یا چرچ کے کسی دوسرے ملازم سے ہو۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھی جب گاڑی کو ایک جھٹکا لگا۔ شاید کوئی چیز سامنے سے گزری تھی اور مائیکل کو بریک لگانا پڑے تھے۔ یہ کافی سخت جھٹکا تھا۔ خشامہ خود کو ایک نشست کے آہنی فریم کے ساتھ ٹکرانے سے نہ روک سکی۔ اس کے سر پر کچھ چوٹ آئی۔ ہلکی سی آواز بھی پیدا ہوئی۔ یقیناً کچھ تکلیف بھی ہوتی لیکن یہ تکلیف اس شدید خوف کے نیچے دب گئی جو آواز کے سبب اس کے دل میں جاگا تھا۔

کار نے پھر رفتار پکڑ لی تھی مگر وہ سکتہ زدہ اپنی جگہ پر پڑی تھی۔ دل دھڑکنا بھول گیا تھا اور ردعمل کا انتظار کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ جیسے گھنٹوں سے زیادہ طویل تھے...... کیا آواز نمرسی اور مائیکل کے کانوں تک پہنچی ہے...... کیا اس آواز نے انہیں چونکایا ہے؟ کیا انہوں نے اسے عام سمجھا ہے اور اہمیت نہیں دی؟ کیا ان دونوں میں سے کوئی عقب میں جھانکنے کی کوشش کرے گا؟ سوالوں کی تپش نے اس کی پیشانی کو مزید عرق آلود کر دیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بہت طویل محسوس ہوئے اور پھر اس کا خوف قدرے ماند پڑ گیا۔

نمرسی اور مائیکل بدستور باتوں میں مصروف تھے۔

کچھ دیر بعد گاڑی نے بائیں جانب ٹرن لیا۔ اس کی رفتار اس موقع پر کچھ کم ہوئی مگر اتنی کم بھی نہیں تھی کہ وہ باہر چھلانگ لگانے کا سوچ سکتی۔ غالباً یہ سڑک ٹریفک سے خالی تھی۔ دھند کے باوجود مائیکل اسے تیزی سے چلانے لگا۔

ایکا ایکی خشامہ کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے نمرسی نے مائیکل سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ اب سیدھا ہی جانا ہے...... پھر یہ ٹرن کیوں لیا گیا تھا؟

کیا واقعی انہیں کوئی شبہ تو نہیں ہو گیا تھا؟

لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کسی وجہ سے انہوں نے ہوٹل کے لیے متبادل راستہ اختیار کیا ہو۔ ایک بار پھر اندیشے اس کے دل کو بے طرح دھڑکانے لگے۔

گاڑی تین چار منٹ تک تیز رفتاری سے آگے بڑھی پھر یوں لگا کہ وہ قدرے ناہموار راستے پر ہے۔ پھر اچانک وہ جھٹکے سے رک گئی۔ خشامہ کے سارے اندیشے ایکدم جوان ہو گئے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتی یا کرتی، گاڑی کا اگلا

دائیں جانب والا دروازہ تیزی سے کھلا اور خشامہ نے محسوس کیا کہ کوئی باہر نکلا ہے۔ اگلے ہی لمحے پچھلا دروازہ بھی جھٹکے سے کھلا اور خشامہ نے رونالڈو نمرسی کو اپنے سامنے پایا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پسٹل صاف نظر آرہا تھا۔ پسٹل کا رخ سیدھا خشامہ کے سر کی طرف تھا۔ نمرسی کی آنکھوں میں جھانک کر خشامہ کے سارے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ دیکھی جاچکی تھی۔

یہی لمحے تھے جب دراز قد مائیکل بھی ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا جس کی ٹارچ کی تیز روشنی سیدھی خشامہ پر پڑ رہی تھی۔ مائیکل نے تحیر زدہ انداز میں سیٹی بجائی۔ ''اوہو...... یہ چرچ کی عبادت گزار حسینہ یہاں کیا کر رہی ہے؟''

''کون ہو تم؟'' نمرسی دل دہلا دینے والی آواز میں پھنکارا۔

''کوئی لمبا چکر لگ رہا ہے باس۔'' مائیکل نے کہا۔

''اٹھ کے بیٹھو۔'' نمرسی نے بے حد تحکم سے کہا اور اس کے ساتھ ہی سیاہ پسٹل کو حرکت دی۔

وہ اٹھ کر آڑھی بیٹھ گئی۔ کپڑے میں لپٹی رائفل اب بھی اس کے عقب میں تھی اور ان دونوں کی نظر سے اوجھل تھی۔ خشامہ نے دیکھا یہ ایک سنسان جگہ تھی۔ گنجان درخت دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ دائیں طرف نشیب میں کافی دور کچھ دھندلائی روشنیاں نظر آرہی تھیں جو یقیناً ٹاؤن کی کسی سڑک کی تھیں۔

نمرسی نے بڑے زور کے ساتھ اسے سر کے بالوں سے جکڑا اور بے رحمی سے آگے پیچھے جھلا کر بولا۔ ''کس چکر میں ہو تم یہاں؟''

''مم...... میں بس چرچ سے نکلنا چاہتی تھی۔'' وہ... بہ مشکل بول پائی۔

ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور نگاہوں میں تارے سے ناچ گئے۔

''بکواس بند کرو۔ جو سچ ہے وہ بتاؤ۔'' نمرسی دہاڑا۔

''کس نے بھیجا ہے تمہیں یہاں؟''

''میں قسم کھاتی ہوں۔''

''تم اس طرح نہیں مانو گی۔'' نمرسی نے وحشت بھرے لہجے میں کہا اور گاڑی کے اندر گھس آیا۔

مائیکل بھی جلدی سے اندر آگیا اور دروازے لاک کر لیے۔ دونوں کے تیور خطرناک تھے۔ خشامہ نے ایک کھڑکی میں سے دیکھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر دھند سے ایک سائن بورڈ جھانک رہا تھا جس پر ''کیمپ سائٹ'' کے الفاظ لکھے تھے۔ یہ سڑک سے ہٹ کر درختوں میں گھری ہوئی کوئی ایسی جگہ تھی جہاں کیمپنگ وغیرہ کی جاتی تھی مگر اس موسم میں یہ ایریا بالکل سنسان پڑا تھا۔ یہاں اس ویرانے میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

نمرسی اپنے بدبودار وزن کے ساتھ اس پر چڑھ دوڑا۔ اس نے خشامہ کے گالوں کو اتنی شدت سے اپنے ہاتھ میں دبایا کہ خشامہ کو منہ کے اندر خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا۔ مائیکل نے بڑی تیزی کے ساتھ اس کے پورے جسم پر ہاتھ چلایا۔ غالباً اس کا موبائل فون یا چھوٹا موٹا ہتھیار ڈھونڈ رہا تھا۔

اسے کچھ نہیں ملا۔ ''گرجے میں پولیس کی ٹاؤٹ ہے تُو؟'' نمرسی نے پھر آتشیں لہجے میں پوچھا۔ خشامہ نے نفی میں سر ہلایا۔

نمرسی نے اسے پوری طرح اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ اس کا پلاستر والا بازو خشامہ کی گردن پر تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس بازو کی دھکیل سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ نمرسی نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنا موبائل فون نکالا اور مائیکل سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''فادر کو فون ملاؤ۔ پوچھو ان سے کہ نن کے لباس میں یہ لومڑی کون ہے۔''

مائیکل فون کرنے میں مصروف ہوگیا۔ نمرسی نے اسے بے رحمی سے نوچا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''خش...... شا...... مہ!'' وہ گردن پر دباؤ کے سبب بہ مشکل بول پائی۔

''پوچھو فادر سے...... یہ کون ہے؟'' نمرسی نے پھر پھنکارتی سرگوشی کی۔

چند سیکنڈ بعد مائیکل کی آواز ابھری۔ ''فادر کا فون آف ہے۔''

نمرسی نے ایک اور تھپڑ خشامہ کے گال پر جڑا۔ ''اگر نہیں جانتی ہو تو جان لو۔ میرا نام رونالڈو نمرسی ہے۔ میں پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہوں۔''

''میرا...... آپ سے...... کوئی لینا دینا نہیں۔ میں صرف چرچ سے نکلنا چاہتی تھی۔ چرچ کا ایک بدنیت بشپ میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔''

نمرسی نے دانت پیسے۔ خشامہ نے NUNS والا بند گلے کا گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس نے گلے میں ہاتھ ڈال کر زور سے کھینچا۔ گاؤن نیچے تک پھٹ گیا۔ نمرسی نے مائیکل کے ہونٹوں سے سلگتا ہوا سگریٹ علیحدہ کیا اور بے دریغ

خشامہ کے کندھے کو داغ دیا...... کرب کی ایک ناقابل برداشت لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ بے طرح چلائی مگر اس کی آواز اس ویرانے میں کون سنتا، ویسے بھی وہ بند گاڑی کے اندر تھی۔ نمرسی کی سانسوں میں بدبو کے بھبکے تھے اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ یہ ایک سفاک قاتل کی آنکھیں تھیں۔ عین ممکن تھا کہ ابھی چند سیکنڈ بعد وہ جھلا کر پسٹل کی گولی اس کی پیشانی میں اتار دیتا اور اس کی لاش کو اس ٹیلے کے دھندلے درختوں میں پھینک کر اپنے راستے پر چل پڑتا...... وہ بے شک جوانی کے دور سے گزر چکا تھا مگر اب بھی ایک درندہ تھا۔ جب اس نے دوسری بار خشامہ کے جسم کو سگریٹ سے داغا تو سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ نتائج سے بے پروا ہو کر اس نے اپنے نیچے دبی ہوئی رائفل کو سیدھا کیا اور بیرل کو نمرسی کی ناف کی طرف لے جا کر ٹریگر دبا دیا۔ سماعت شکن دھماکے سے نمرسی کا جسم اچھلا اور اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت کی یلغار ہوئی۔ دوسرا فائر خشامہ نے اس کے سینے پر کیا اور یہ ایک کارگر فائر تھا۔ یہی وقت تھا جب خشامہ نے دیکھا کہ مائیکل اپنا ہاتھ سیاہ جیکٹ کے اندر گھسا چکا ہے، یقیناً وہ اپنا ہتھیار نکال رہا تھا۔ یہ بس ایک یا آدھے سیکنڈ کا کھیل تھا۔ خشامہ نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ رائفل اس کی گردن سے لگائی اور تیسری بار ٹریگر دبایا۔ دراز قد مائیکل اچھل کر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ اس کے خون کے چھینٹوں نے ونڈ اسکرین کو داغدار کر دیا تھا۔ رائفل سنگل شاٹ پر سیٹ تھی۔ خشامہ یکے بعد دیگرے ٹریگر دباتی چلی گئی۔ ایک دو فائر خالی بھی گئے ہوں گے تاہم کم و بیش چھ گولیاں مزید ان دونوں کے سر اور سینے میں اتر گئیں۔ نمرسی کی کھوپڑی ایک جانب سے اڑ چکی تھی، مائیکل بھی مکمل لاش کی صورت اختیار کر چکا تھا...... فائرنگ سے ایک جانب کی کھڑکی چکنا چور ہوگئی تھی۔ چھت میں بھی سوراخ تھے۔

خشامہ کے سینے میں جیسے دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کر چکی ہے۔ وہ تو صرف اس لیے گاڑی میں گھسی تھی کہ موقع تاک کر نکل سکے اور کسی بھی طرح زویا کی مدد کر سکے۔ وہ اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھی رہی اور کسی ردعمل کا انتظار کرتی رہی۔ فائرنگ ''بند گاڑی'' کے اندر ہی ہوئی تھی...... اور یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ اس کے باوجود اس امر کا اندیشہ موجود تھا کہ کوئی اس جانب متوجہ ہو جاتا اور اگر پٹرولنگ پولیس متوجہ ہوتی تو پھر خشامہ کے مسائل میں زبردست اضافہ ہوسکتا تھا۔ جزوی طور پر کپڑے میں لپٹی ہوئی رائفل اب بھی خشامہ کے ہاتھوں میں تھی۔

وہ کچھ دیر تک ساکت بیٹھی اپنی دھڑکنیں گنتی رہی، پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے پھٹے ہوئے گریبان کو اس طرح گرہیں دیں کہ سامنے سے بدن ڈھک گیا۔ اس کا دایاں پاؤں جوتی سمیت نمرسی کے خون سے لتھڑ گیا تھا۔ وہ خود کو سنبھالتی ہوئی گاڑی میں سے باہر نکل آئی۔ گہری دھند، سردی اور تاریکی کا تال میل اس ویران جگہ کے ماحول کو جدا شکل دے رہا تھا۔ وہ کچھ لمحوں تک گاڑی کے قریب سکتہ زدہ حالت میں کھڑی رہی، پھر لڑکھڑاتی ہوئی سی نشیب کی طرف بڑھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کر چکی ہے اور اب اس نے کیا کرنا ہے؟ کپڑے میں لپٹی ہوئی رائفل اب بھی اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اسے پھینک دینا چاہتی تھی...... مگر کہاں؟ بے شک فائرنگ کے دوران میں بھی رائفل جزوی طور پر فلالین کے اس کپڑے میں ہی لپٹی رہی تھی مگر پھر بھی اس پر فنگر پرنٹس وغیرہ کی تلاش ہوسکتی تھی۔ وہ پچاس ساٹھ قدم آگے گئی تو اسے ڈھلوان پر ایک گڑھا نظر آیا۔ اسے بارشی تالاب بھی کہا جاسکتا تھا۔ اس نے رائفل کو اچھی طرح کپڑے سے رگڑا اور پھر تالاب کی گہرائی میں پھینک دیا۔ تب اس نے اپنی جوتی اور اپنا خون آلود پاؤں اچھی طرح دھویا۔ سفید گاؤن کے ایک کنارے کو بھی خون کے چھینٹوں سے صاف کیا اور چند قدم ہٹ کر پائن کے ایک اونچے پیڑ کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ وہ بلندی پر تھی۔ دائیں جانب دھند کے اندر سے برج برگ کی کچھ دھندلائی ہوئی روشنیاں نظر آتی تھیں۔ ان روشنیوں میں ہی کہیں وہ ہوٹل بھی تھا جہاں نمرسی اور مائیکل موت کے فرشتوں کا روپ دھار کر جارہے تھے۔ اس زویا کے لیے جو ہوٹل کے کسی کمرے میں اپنی بچی اور بہن کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس نے تصور ہی تصور میں زویا کے چہرے پر ہاتھ پھیرا...... اس کے بالوں کو سہلایا...... پیاری زویا! میں نے ایک بڑی مصیبت کو تم تک پہنچنے سے روکا ہے۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا میں نے کیا ہے...... اب خدا تمہاری حفاظت کرے۔

تب اس کی نگاہ بائیں جانب اٹھ گئی۔ دھند کی وجہ سے زیادہ دور تک نظر نہیں آرہا تھا۔ تاہم وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ دھند کی اس دیوار کے پیچھے عظیم الشان شہر ہیمبرگ کی روشنیاں ہیں...... اور اس سے آگے نیومنسٹر ہے...... اور اس سے آگے ''فلینز برگ''...... فلینز برگ کے نواحی قصبے اور

بستیاں۔ ایسے ہی کسی قصبے یا بستی کا گرجا گھر اس کی نئی پناہ گاہ بن سکتا تھا۔ وہ جس راستے پر چل پڑی تھی اب اس سے پلٹنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ اسی راستے پر آسودہ تھی۔ اس نے اپنے لبادے کو ایک بار پھر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا۔ اسے اپنے بالائی جسم پر جلن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ انہی دو داغوں کی جلن تھی جو نمرسی نے دہکتے ہوئے سگریٹ سے اسے لگائے تھے۔ اس جلن سے دھیان ہٹا کر وہ تیز قدموں سے نیچے اترنے لگی۔ وہ جلد از جلد اس سرخ کار سے دور چلے جانا چاہتی تھی جہاں دو ''درندہ صفت'' اپنے خون میں لت پت پڑے تھے۔

☆☆☆

زویا صبح سات بجے کے لگ بھگ جاگی۔ اس نے اپنے پہلو میں سوئی ہوئی ننھی عینی کا رخسار چوما پھر اٹھ کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکایا۔ ہوٹل کا لان دکھائی دے رہا تھا اور سڑک کا کچھ حصہ بھی۔ دھند رات کے مقابلے میں کچھ کم تھی مگر موجود تھی۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ ٹی وی کے ریموٹ کی طرف بڑھا لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ درحقیقت پچھلے تین چار روز سے اس نے ٹی وی تقریباً آف ہی رکھا تھا۔ اسے وحشت سی ہونے لگتی تھی نیوز وغیرہ سن کر۔

منہ ہاتھ دھو کر اور شال اوڑھ کر وہ بالکونی کی طرف آ گئی۔ حولیہ نیچے شاید لابی میں گئی ہوئی تھی۔ وہ بالکونی کے جنگلے پر کہنیاں ٹکا کر خالی خالی نظروں سے سیب اور چیری کے خوش رنگ پودوں کو دیکھنے لگی۔

اسے معلوم نہیں تھا، کل رات کتنا بڑا طوفان اس تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا ہے اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ طوفان کس وجہ سے اس تک پہنچ نہیں پایا...... اور نہ ہی اسے کبھی معلوم ہونا تھا۔ انسان کی زندگی میں بھی کبھی ایسے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں۔ اس کے اردگرد کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ کوئی اس کی خیریت وسلامتی پر حملہ آور ہو رہا ہوتا ہے اور کوئی اس کا دفاع کر رہا ہوتا ہے۔ نہ وہ حملہ آور کے بارے میں جان پاتا ہے، نہ اپنا دفاع کرنے والے کے بارے میں۔ زویا بھی نہیں جانتی تھی کہ کل ایک عفریت کی وحشت اس کو چھو کر گزر گئی تھی۔

کمرے کی جانب سے حولیہ کی آواز آئی۔ ''زویا! کہاں ہو...... یہ دیکھو۔''

زویا بالکونی سے پلٹ کر اندر گئی۔ حولیہ کے ہاتھ میں تازہ اخبار تھا۔ وہ سنسنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' زویا نے چونک کر پوچھا۔

وہ دبے دبے جوش سے بولی۔ ''ہمیں پچھلے دو تین روز کی صورت حال کا پتا ہی نہیں چلا۔ نمرسی کے حوالے سے کافی کچھ ہوا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''محترمہ! تین روز پہلے وہ پولیس کی حراست سے فرار ہو گیا تھا۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' زویا کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

''بالکل ایسا ہوا ہے لیکن یہ تین روز پہلے کی بات ہے۔ کل رات وہ اپنے ایک ساتھی سمیت ''براڈ ہل'' پر مارا گیا ہے...... یہ دیکھو۔'' حولیہ نے لرزاں ہاتھوں سے اخبار زویا کی طرف بڑھایا۔

زویا نے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھا۔ نمرسی کے جہنم واصل ہونے کی خبر جلی حروف میں موجود تھی۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور پڑھنے لگی۔ خبر کے ساتھ رونالڈ نمرسی کی ایک فائل فوٹو بھی موجود تھی۔ ساتھ میں ایک اور شخص بھی تھا، اس کو زویا کیسے بھول سکتی تھی۔ یہی خبیث مائیکل تھا جس نے اسے عینی سمیت لیونا برگ میں یرغمال بنائے رکھا تھا...... اور بڑی بے حیائی سے ہراساں کرتا رہا تھا۔ وہاں سے فرار ہوتے وقت زویا نے اس کے منہ پر شیشے کے ٹکڑے سے کاری وار کیا تھا اور رخسار چیر کر رکھ دیا تھا۔

خبر کی ہیڈ لائن تھی۔ ''فرار کے قریباً 72 گھنٹے بعد رونالڈ نمرسی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔''

ذیلی سرخی تھی۔ ''اپنے قریبی ساتھی مائیکل کی لاش سمیت اس کی لاش براڈ ہل کے ایریا میں ایک کار کے اندر پائی گئی ہے۔''

خبر کا متن کچھ یوں تھا۔ ''ویران علاقے میں کھڑی کار کے اندر رونالڈ نمرسی مردہ حالت میں پایا گیا۔ اس کے سر اور سینے میں نہایت قریب سے چار گولیاں ماری گئی ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال دوسری لاش کی بھی ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ جس سرخ اسٹیٹ کار سے یہ لاشیں ملی ہیں، وہ چرچ کی ملکیت ہے اور واردات سے چند گھنٹے پہلے چوری ہو گئی تھی۔ اس کی رپورٹ بھی درج ہے۔ موقع سے جو شواہد اکٹھے ہوئے ہیں، ان سے یہی قیاس کیا جا رہا ہے کہ یہ دونوں قتل آپسی لڑائی کا نتیجہ ہیں۔ نمرسی ہی کے کسی مخالف گروپ نے اسے اور اس کے ساتھی کو ہلاک کیا ہے۔''

زویا کا دل بھر آیا۔ یہی جانور تھا جس نے اس پر اور اس کی فیملی پر عرصۂ حیات تنگ کیے رکھا تھا۔ آج وہ اپنے حتمی

انجام کو پہنچ گیا تھا۔ حولیہ کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

اتنے میں دو سالہ عینی بھی جاگ گئی اور ہولے ہولے چلتی زویا کے پاس پہنچ گئی۔ زویا نے اسے بازوؤں سے تھام کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ عجیب کیفیت میں تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ایک عرصے بعد آج ایک جانکاہ خوف سے آزاد ہوئی ہے۔ اس نے عینی کے بالوں کو چوما اور ایسا کرتے ہوئے اس کے رخساروں پر دو موتی ڈھلک آئے۔

اس کا جی چاہا کہ وہ ابھی شامیر کا نمبر ملائے اور اس سے یہ خبر شیئر کرے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی بھی مگر پھر بیٹھ گئی۔ اسے سینئر ڈاکٹر کی بات یاد آگئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ شامیر کو بار بار ڈسٹرب نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔

اسی دوران میں ٹام کی کال آگئی۔ ٹام واحد شخص تھا جسے فی الوقت زویا اور حولیہ کے ٹھکانے کا پتا تھا۔ وہ بھی نمرسی اور مائیکل کی ہلاکت کے بارے میں جان چکا تھا۔ اس کے لب و لہجے میں گہرے اطمینان کی جھلک تھی۔

زویا نے کہا۔ ''ٹام! شروع میں تو پتا چلا تھا کہ کار الٹنے کے بعد نمرسی سخت زخمی ہوا ہے اور شاید جانبر نہ ہو سکے، مگر لگتا ہے کہ وہ زیادہ سیریس نہیں تھا۔ اسی لیے تو ٹھیک بھی ہوا اور فرار بھی۔''

ٹام نے کہا۔ ''حادثے کے وقت وہ گہرے نشے میں تھا اور یوں لگتا تھا کہ بہت گہری بے ہوشی میں چلا گیا ہے، مگر پھر سنبھل گیا تھا۔''

ٹام نے مزید بتایا کہ اطلاعات کے مطابق یہاں پر نمرسی کے بچے کھچے ساتھیوں کا بھی تقریباً صفایا ہو گیا ہے۔ نمرسی سے کاروباری لنک رکھنے والے کچھ لوگ بھی گرفتار ہوئے ہیں۔

زویا اور اس کے منہ بولے بھائی ٹام میں کچھ دیر اسی حوالے سے بات ہوتی رہی پھر ٹام نے ذرا ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''زویا! ایک بات کہنا چاہ رہا ہوں تم سے...... بلکہ تین چار روز سے کہنا چاہ رہا تھا۔ پتا نہیں کہ تمہیں ٹھیک لگے یا نہیں۔''

''ہاں ہاں کہو۔''

''ہفتے کے روز ٹاؤن کی ایک پولیس آفیسر ماریا سادہ لباس میں میرے پاس پہنچی تھی۔ وہ اسی جیل میں فرائض انجام دیتی ہے جہاں آج کل رابرٹ کو رکھا گیا ہے۔ وہ رابرٹ سے بہت متاثر نظر آتی ہے اور اس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔''

رابرٹ کا نام سنتے ہی زویا کے جسم میں چنگاریاں سی پھیل گئیں۔ وہ شوہر تو کیا، انسان کہلائے جانے کے قابل بھی نہیں تھا۔ جب سے اس نے ٹام پر حملہ کیا تھا، زویا کو اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں تھا۔

وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا کہہ رہی ہے پولیس آفیسر؟''

''وہ کہتی ہے، رابرٹ اپنے کیے پر بہت نادم ہے۔ رات دن روتا ہے۔ جس کے ساتھ بھی اس کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے اس سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔''

''بہت خوب...... معافی۔'' زویا نے دکھی استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''ٹام! تم جانتے ہی ہو، اس شخص کی معافیاں تلافیاں کتنی دیرپا ہوتی ہیں...... میں بہت بھگت چکی ہوں اس کی یہ معافیاں...... وہ دو چہروں والا جانور صفت بندہ ہے۔''

''میں سب جانتا ہوں زویا! مگر درمیانی عمر کی وہ آفیسر اس سے بہت متاثر نظر آتی ہے۔ میں تو اس آفیسر کو سادہ دل ہی کہوں گا۔ اس نے رابرٹ کا لکھا ہوا ایک خط بھی مجھے دیا ہے۔ اس خط میں رابرٹ نے مجھ سے بھی معافی مانگی ہے۔ مجھ پر حملہ کرنے کے حوالے سے بے حد ندامت اور پچھتاوے کا اظہار کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ طیش میں ہوش کھو بیٹھا تھا اور اپنے اس جرم کے لیے ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہے۔''

''ٹام! یہ اس کا وہی دوسرا روپ ہے جو بندے کی مت مار دیتا ہے۔''

ٹام کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''آفیسر نے درخواست کی ہے کہ وہ ایک دفعہ اپنی بچی کی اور تمہاری شکل دیکھنا چاہتا ہے۔ بہت منت کر رہا ہے کہ ایک بار تم دونوں اس سے مل لو۔''

''ہرگز نہیں ٹام! میں اس کا نام سننا بھی نہیں چاہتی۔'' وہ جیسے کانپ کر رہ گئی۔

''مگر زویا جو کچھ بھی ہے، وہ عینی کا باپ ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے، ہمارے قانون میں قیدیوں کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ایک مخصوص وقت کے بعد انہیں ان کی فیملیز سے ملایا جاتا ہے۔ آفیسر ماریا کہتی ہے کہ وہ اپنی بچی کے لیے تڑپ رہا ہے......''

''مجھے اس کی تڑپ بڑی اچھی طرح معلوم ہے۔'' زویا کا لہجہ زہر خند تھا۔

''آفیسر نے درخواست کی ہے کہ کم از کم ایک بار تم رابرٹ سے فون پر بات کر لو۔ وہ اس ٹیلی فونک گفتگو کے لیے خصوصی رعایت حاصل کر سکتی ہے۔''

''نہیں ٹام! مجھے اس امتحان میں نہ ڈالو۔ اس کی آواز سننے کے خیال سے ہی میرا دل ہولنے لگا ہے۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ تم اس آفیسر کو بھی بتاؤ کہ یہ شخص کس طرح گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے اور اس کی باتوں میں کتنا وزن ہے۔''

ٹام نے زویا کو سمجھایا بجھایا اور اس سے کہا۔ ''کم از کم آفیسر ماریا کو مطمئن کرنے کے لیے ہی ایک بار رابرٹ سے بات کرلو۔ اس بات چیت سے کوئی درمیانی راستہ بھی نکل سکتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم خود اس سے ملنے نہ جاؤ بلکہ کسی کے ذریعے عینی اس سے مل لے۔'' پھر اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ''ویسے بھی تمہیں اور عینی کو چھپنے کی ضرورت نہیں۔ اب تو یہ نمرسی والا وبال ختم ہوگیا ہے۔ اس حوالے سے جو بھی اندیشے تھے، وہ اب نہیں رہے......''

ٹام کے بہت مجبور کرنے پر رات کے وقت زویا نے خود پر جبر کرکے رابرٹ سے بات کی۔ رابرٹ کا لب ولہجہ اور اس کی گفتگو حسبِ توقع ہی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بے پناہ ندامت کا اظہار کیا۔

بولا۔ ''زویا! ایک سال بعد تمہاری آواز سن رہا ہوں۔ اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا۔ نہ ہی یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ تم سے کن الفاظ میں معافی مانگوں۔ اپنی نگاہوں میں اتنا گر گیا ہوں کہ کسی وقت خودکشی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ میرا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ میں نے تم پر شک کیا۔ تمہارے اور ٹام کے تعلق کو غلط نظر سے دیکھا۔ کاش اس غلط روی سے پہلے مجھے موت آجاتی۔'' وہ اشک بار تھا۔

زویا خاموشی سے سن رہی تھی۔ ان باتوں کا اثر اس کے دل پر نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ ایسے مکالمے پہلے بھی بہت سن چکی تھی...... اور پھر ان مکالموں کے دو چار دن بعد ہی کیا ہوتا تھا، وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہی تمتمایا ہوا چہرہ، وہی آگ اگلتا لہجہ، وہی ملکیت اور حاکمیت کا جنون۔ اس کے بعد زویا کے حصے میں توہین وتذلیل اور جسم وروح کی پامالی ہی آتی تھی۔

وہ پھر گویا ہوا۔ ''میں نے ٹام سے تہ دل سے معافی مانگی ہے۔ میں شامیر کے پاؤں بھی پکڑنا چاہتا ہوں۔ میرا رویہ اس کے حوالے سے بھی شاید ٹھیک نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے تمہاری اور عینی کی جان بچی۔ میں مر کر بھی اس کا یہ احسان نہیں چکا سکتا۔ خدا اس کو زندگی اور صحت دے۔''

''اب تم کیا چاہتے ہو رابرٹ؟'' زویا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''صرف یہ کہ...... مجھے ایک موقع...... صرف ایک موقع اور دے دو...... میرے پچھلے سارے گناہ معاف کرکے صرف ایک بار مجھے بتا دو کہ مستقبل میں میرے لیے امید کی روشنی موجود ہے...... پھر میری سزا کتنی بھی لمبی ہوگی، میں تمہارے بخشے ہوئے حوصلے کی طاقت سے کاٹ لوں گا۔''

''کچھ چیزیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں رابرٹ...... اور میں اتنی بار زخمی ہوئی ہوں کہ میرے اندر کے زخم ناقابلِ علاج ہوگئے ہیں۔ یہ اب مندمل نہیں ہوسکتے۔''

''پلیز...... میں صرف ایک موقع کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ گھگیایا۔

وہ خاموش رہی۔ اس کے پاس رابرٹ کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اگر درمیان میں عینی نہ ہوتی تو شاید وہ ابھی یہ فون کاٹ دیتی۔

اس نے کہا۔ ''زویا! تمہیں اور عینی کو دیکھنے کے لیے میری نگاہیں ترس گئی ہیں۔ بس ایک بار مجھے اپنی جھلک دکھا جاؤ۔ مجھ سے اب اور انتظار نہیں ہوتا۔''

''میں...... اپنے وکیل سے مشورہ کرکے ہی بتا سکتی ہوں۔''

وہ تڑپ اٹھا۔ ''نہیں، وکیل سے نہیں...... اپنے دل سے مشورہ کرو زویا۔ عینی کے لیے تمہارے دل میں جو ممتا ہے اس سے مشورہ کرو...... پلیز زویا۔''

''م...... میں ابھی کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔'' زویا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

رابرٹ سے بات ختم کرکے وہ دیر تک ہوٹل کے اس کمرے میں ٹہلتی رہی۔ انسان، انسان میں کتنا فرق ہوتا ہے، اس نے سوچا۔ ایک طرف یہ رابرٹ لوئیس تھا۔ ایک اعلیٰ جرمن خاندان کا چشم وچراغ، مگر وہ دہری زندگی جی رہا تھا۔ ایک روپ میں وہ نہایت شریف النفس اور عبادت گزار تھا، دوسرے روپ میں اس نے اپنی بیوی اور معصوم بچی کو اپنے اندر کی آگ میں جلا جلا کر نیم جان کر دیا تھا۔ دوسری طرف دور دیس سے آنے والا شامیر تھا...... اپنے اندر بے لوث محبت، قربانی اور وفا کا جذبہ رکھنے والا۔ وہ جرمن نہیں تھا اور نہ ہی اپنے حسب نسب کے حوالے سے اسے کوئی غرور تھا لیکن جب وقت آیا تھا تو وہ بے خطر ایک آگ میں کود پڑا تھا اور اپنا حسب نسب ثابت کیا تھا۔

☆☆☆

زویا کا شوہر نامدار رابرٹ جیل میں تھا۔ اس نے ایک ڈیوٹی آفیسر سارجنٹ ماریا کو اپنی باتوں سے شیشے میں

اتارا تھا۔ اس کے اندر اپنے لیے اپنایت اور ترحم کے جذبات پیدا کیے تھے اور اس کے ذریعے بالآخر ٹام اور زویا سے رابطہ کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

ماریا نے کل پھر زویا سے اس کی بات بذریعہ موبائل فون کرائی تھی۔ اب رابرٹ کو امید تھی کہ آج کسی وقت وہ اس سے ملنے یہاں پہنچے گی۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔

وہ اس کی ضرورت بن چکی تھی۔ وہ ان وحشی پانیوں کا کنارہ تھی جو گاہے بگاہے اس کے اندر موجزن ہوتا تھا۔ اس کا استحصال اس کی خُو بن چکا تھا۔ عینی کا تو بس بہانہ ہی تھا۔ اصل میں وہ عینی کے ذریعے زویا کو اپنی پہنچ میں رکھنا چاہتا تھا۔ حال میں نہ سہی، مستقبل میں سہی...... وہ اس کے جملہ حقوق کا مالک کہلا سکتا تھا۔ ویسے مقامی قوانین کے تحت دوران قید بھی ہر چند ماہ بعد بیوی اور شوہر کو تنہائی میں ملاقات کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔ اس طرح کی ساری باتیں رابرٹ کے ذہن میں تھیں۔

وہ لاک اپ میں ٹہل رہا تھا اور بڑی بے چینی سے زویا اور عینی کی آمد کا منتظر تھا۔ آخر خدا خدا کر کے وہ گھڑی آن پہنچی۔ ایک اہلکار نے آہنی سلاخوں کے سامنے آکر اسے اطلاع دی کہ اس کی فیملی آگئی ہے۔ رابرٹ کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ چہرے پر ایک دکھ آمیز افسردگی لے کر وہ اسٹیل کی چمکیلی سلاخوں کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دو چار منٹ بعد سامنے والے کوریڈور میں اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ وہ آرہی تھی...... ہاں وہ آرہی تھی۔

پھر دروازہ کھلا اور وہ عینی کے ساتھ اندر آگئی...... مگر...... وہ زویا نہیں تھی۔ رابرٹ نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ وہ زویا کی بہن ڈاکٹر حولیہ تھی۔ اس نے زویا ہی کے انداز میں اسکارف لے رکھا تھا۔ اس کی گود میں عینی تھی جس نے دو پونی ٹیلو کر رکھی تھیں اور نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

رابرٹ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ پہلے مایوسی کی لہر اور پھر طیش کی چنگاریاں اس کے تن بدن میں پھیل گئیں۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ وہ نہیں آئی تھی۔ اس نے وہی ڈھیٹ پن دکھایا تھا جس کا وسوسہ رابرٹ کے دماغ میں تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں آیا، شاید وہ بھی آئی ہو مگر سامنے آنے سے جھجک محسوس کر رہی ہو یا پھر...... سرپرائز دینا چاہتی ہو۔

''آپ...... اکیلی...... زویا کہاں ہے؟'' رابرٹ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''وہ نہیں آسکی...... اس کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔''

حولیہ نے اس سے نگاہیں ملائے بغیر جواب دیا۔

''کیا ہوا اس کی طبیعت کو۔ کل تو وہ اچھی بھلی تھی۔ اس نے بات کی ہے مجھ سے؟''

حولیہ نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے عینی سے کہا۔ ''ڈیڈ کو ہیلو بولو۔ بات کرو ان سے؟''

دو سالہ عینی نے اجنبی نظروں سے رابرٹ کو دیکھا پھر توتلی زبان میں ''ہیلو'' کہہ کر جیسے اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

رابرٹ نے بس رسمی انداز میں سلاخوں میں سے ہاتھ باہر نکالا اور عینی کے گالوں کو چھوا۔ اس کی ساری توجہ اپنے سوال کے جواب کی طرف تھی۔ وہ خشمگیں نظروں سے حولیہ کو دیکھ رہا تھا۔

''میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے ڈاکٹر حولیہ۔'' وہ اپنے لہجے کو حتی الامکان شائستہ رکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے بھی جواب دے دیا ہے۔ وہ نہیں آسکی۔''

''آ نہیں سکی، یا آنا نہیں چاہتی ہے'' رابرٹ کا پارہ چڑھنا شروع ہو گیا۔

''جو بھی تم سمجھ لو۔''

''کیا مطلب...... کیا مطلب ہے اس بات کا؟'' رابرٹ کے لہجے میں دبی دبی آتش جھلک دکھانے لگی۔

حولیہ کے چہرے پر ناگواری تھی۔ اس نے رابرٹ کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اچانک جیسے لاک اپ کے اس حصے میں زلزلہ سا آگیا۔ عالم طیش میں رابرٹ اتنی زور سے گرجا کہ در و دیوار ہل گئے۔ اس نے جنونی انداز میں اپنا دایاں ہاتھ سلاخوں میں سے نکالا اور حولیہ کا گریبان دبوچ لیا۔ وہ چنگھاڑا۔ ''اس حرامزادی کی یہ جرأت؟ کیوں نہیں آئی وہ؟ کیوں نہیں آئی...... تم ساری بہنیں ایک جیسی ہو۔ ایک جیسی کمینی، ایک جیسی لعنتی اور نیچ...... میں مار چھوڑوں گا اس کو...... میں مار چھوڑوں گا۔''

کچھ فاصلے پر موجود سارجنٹ ماریا اور ایک گارڈ بھی ہکا بکا رہ گئے۔ شاید انہیں یقین ہی نہیں آیا تھا کہ اتنا دھیما اور عاجز نظر آنے والا غمزدہ رابرٹ اچانک اس قدر آگ بگولا ہو جائے گا۔

رابرٹ نے حولیہ کا گریبان جکڑ رکھا تھا اور چلا رہا تھا۔ ''وہ باسٹرڈ اپنے دو دو یاروں سے مل رہی ہے۔ یہاں اپنے شوہر کے پاس آتے ہوئے اسے موت پڑتی ہے۔ اسے آنا پڑے گا یہاں...... آنا پڑے گا۔''

حولیہ اس سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ ماریا اور اس کا ساتھی گارڈ بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ تب تک رابرٹ جنونی انداز میں ننھی عینی پر بھی جھپٹا مار چکا تھا۔ اس نے بچی کی گردن دبوچنا چاہی تھی مگر حولیہ بروقت بائیں جانب جھکی اور گردن کے بجائے بچی کے بال رابرٹ کے ہاتھ میں آئے۔ اس کے اندر ایک دم بھڑکنے والے شعلے اب بلند تر ہوگئے تھے۔ وہ وحشی نظر آنے لگا۔ ہیجانی انداز میں چنگھاڑا۔ ''میں ماردوں گا اس کو بھی۔ جان لے لوں گا۔'' وہ ننھی بچی کو بالوں سے جکڑے ہوئے غضب ناک انداز میں اپنی جانب کھینچنے لگا۔

حولیہ پکاری۔ ''بچاؤ...... خدا کے لیے بچاؤ۔''

سارجنٹ ماریا نے بچی کو چھڑانے کی کوشش کی۔ ''چھوڑ دو رابی...... چھوڑ دو اسے۔'' اس نے طاقت سے رابرٹ کو پیچھے دھکیلا۔

اس کے جسم میں وحشیانہ طاقت تھی۔ بچی کے چلّانے کی آوازیں دور تک گونج رہی تھیں۔ دو اور اہل کار بھی ماریا کی مدد کو پہنچ گئے۔ وہ بچی کو رابرٹ کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ عین ایسا لگ رہا تھا کہ کسی چڑیا گھر میں کسی درندے نے پنجرے میں سے ہاتھ نکال کر ایک بچے کو دبوچ لیا ہو۔ ایک تنومند پولیس اہل کار نے ڈنڈے سے رابرٹ کے ہاتھ اور کلائی پر زوردار ضربیں لگائیں۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا...... سارجنٹ ماریا کے چہرے پر حیرت کی یلغار تھی۔ وہ یقین نہیں کر پارہی تھی کہ رابرٹ کی عاجزی معاً یہ سفاک روپ بھی اختیار کرسکتی ہے۔

تنومند اہل کار نے اپنے ڈھائی تین فٹ لمبے الیکٹرانک ڈنڈے کو نیزے کی طرح استعمال کرتے ہوئے رابرٹ کے چہرے پر شدید ضرب لگائی۔ جواب میں رابرٹ نے اس پر بھی گالیوں کی بوچھاڑ کی تاہم اسی نوعیت کی دوسری ضرب نے عینی کے بالوں پر اس کی گرفت کمزور کردی...... اہل کاروں نے کھینچ کر روتی بلکتی بچی کو اس سے دور کردیا۔ حولیہ اسے اپنے ساتھ چمٹا کر دور جا کھڑی ہوئی۔

اسی اثنا میں ایک سینئر پولیس آفیسر بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کے حکم پر تین چار باوردی اہل کار لاک اپ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ انہوں نے بپھرے ہوئے رابرٹ کو گھما کر فرش پر پٹخ دیا...... اور پھر اس کی ٹھکائی شروع کردی۔ گھونسے اور ٹھڈے تواتر سے اس کے جسم پر برسنے لگے۔ پہلے تو وہ گالیاں بکتا رہا، پھر اس نے چلّانا شروع کردیا۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہوگیا تھا۔ اس کے ہاتھ سامنے کی طرف سے مخصوص ہتھکڑی میں جکڑے گئے۔ پھر اس ہتھکڑی کے دوسرے حصے کو اس کے دونوں پاؤں کے ساتھ یوں منسلک کردیا گیا کہ وہ گٹھڑی سا بن گیا۔ تب اسی حالت میں اس کی ''مزاج پرسی'' کی جانے لگی۔ وہ دہائیاں دینے لگا۔

آج کے واقعے کے بعد اس نے یقیناً اپنی سزا میں خاطر خواہ اضافہ کرلیا تھا۔

☆☆☆

شامیر اسپتال میں تھا۔ تکلیف کبھی کم، کبھی زیادہ ہوتی تھی۔ زویا نے پرسوں آنے کا کہا تھا مگر اب چوتھا روز تھا، وہ آئی نہیں تھی۔ ہر آہٹ پر شامیر کی نگاہیں بے ساختہ دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ ظاہر ہے نگاہوں کو مایوس ہی لوٹنا پڑتا تھا۔ کل ابن کے جی میں آئی تھی کہ اسے فون کرے مگر پھر سینئر ڈاکٹر تھامسن آموجود ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے منع کردیا تھا اور سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ آرام کرے۔

سہ پہر کو بھی وہ اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔ وہ کیوں اتنی سخت دل ہوگئی تھی؟ کیوں اس کے لیے اپنے دل میں ذرا سی گنجائش بھی پیدا نہیں کر رہی تھی؟ اچانک اسے دروازے پر میوزیشن ٹام کی صورت نظر آئی۔ شامیر کو معلوم ہوچکا تھا کہ چند روز پہلے اسپتال کی انتظار گاہ میں کیا واقعہ رونما ہوا تھا اور رابرٹ کے ساتھ ٹام کی کتنی خطرناک جھڑپ ہوئی تھی۔

ٹام کی چال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے پیٹ پر ابھی تک بینڈیج موجود ہے اور زخم پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ بہرحال وہ چہرے سے ہشاش بشاش نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے شامیر کی خیریت دریافت کی۔ پھر اس سے انگلش میں پوچھا۔ ''مسٹر شامیر! آپ کو نمرسی کے بارے میں کوئی نیوز ملی ہے؟''

''یہی پتا چلا تھا کہ وہ پولیس کی حراست میں ہے۔''

''وہ ہلاک ہوگیا ہے مسٹر شامیر...... وہ کورٹ میں پیشی کے دوران میں پولیس کسٹڈی سے فرار ہوگیا تھا لیکن دو دن بعد اپنے قریبی ساتھی مائیکل سمیت مارا گیا۔ خیال یہی ظاہر کیا جارہا ہے کہ وہ کسی مخالف گروپ کا نشانہ بنا ہے۔''

یہ خبر شامیر کے لیے جہاں بہت سنسنی خیز تھی، وہاں کسی حد تک اطمینان بخش بھی تھی۔ اس نے ٹام سے اس واقعے کی تفصیل دریافت کی۔

آخر میں اس نے ٹام سے مائیکل کے بارے میں

پوچھا۔ ’’یہ وہی ہے نا جس نے لیونا برگ میں زویا اور اس کی بچی کو یرغمال بنائے رکھا تھا؟‘‘

’’بالکل وہی...... نمرسی کی طرح یہ شخص بھی پولیس اور انٹرپول کو ڈکیتی، قتل اور آبروریزی کے بہت سے مقدمات میں مطلوب تھا۔‘‘

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر شامیر نے زویا اور حولیہ کے بارے میں پوچھا۔

ٹام نے کہا۔ ’’زویا سے کل فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ آپ کے لیے پریشان ہے۔ ڈاکٹر حولیہ بھی بہت فکرمند ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر حولیہ آج آپ سے ملنے بھی آئے۔ زویا بھی ایک دو روز تک آئے گی۔‘‘

شامیر نے ایک طویل سانس لی پھر ٹام سے پوچھا۔ ’’رابرٹ کی کیا صورت حال ہے؟‘‘

’’وہ جیل میں ہے۔ کافی سخت کیس بنے ہیں، اس پر...... اب تو قسمت سے ہی آزاد فضا میں سانس لے سکے گا۔‘‘

ٹام جان بوجھ کر جیل میں پیش آنے والا واقعہ چھپا گیا۔ زویا اور حولیہ نے بھی اس سے یہی کہا تھا کہ وہ شامیر کو بتا کر خوامخواہ پریشانی میں مبتلا نہ کرے۔ ویسے بھی قانون کے شکنجے میں پوری طرح کسے جانے کے بعد رابرٹ کا ذکر بے معنی ہو گیا تھا۔

اسی دوران میں ایک دراز قد جرمن نرس آ گئی۔ اس نے شائستہ لہجے میں ٹام سے کہا کہ ڈاکٹرز راؤنڈ پر آنے والے ہیں، لہٰذا اب وہ اٹھ جائے۔

ٹام اسے خدا حافظ کہہ کر باہر چلا گیا۔ اس کی نگاہوں میں شامیر کے لیے ایک خاموش ستائش تھی اور ایسی ہی ستائش، یہاں اپنے لیے، شامیر کو اکثر نگاہوں میں نظر آتی تھی۔

ڈاکٹرز راؤنڈ لگا کر چلے گئے تو شامیر ایک بار پھر اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ درد دبانے والی میڈیسن کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ رگ و پے میں ایک جلن سی سرایت کر رہی تھی۔ اس جلن سے دھیان ہٹانے کے لیے وہ نمرسی اور اس کے انجام کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ ایک بہت مثبت خبر تھی جو ٹام کے ذریعے اسے ملی تھی...... پھر اس کا دھیان بھٹکتا ہوا زویا کی طرف چلا گیا۔ اسے اپنے اردگرد اس کی خوشبو محسوس ہونے لگی۔ یہ کیسا جذبہ تھا؟ یہ کیسی کیفیت تھی؟ کبھی کبھی تو اسے اپنے آپ سے اس کی خوشبو آنے لگتی تھی۔ اس کی باتوں کی خوشبو، اس کے سانسوں کی مہک، اس کی مسکراہٹ اور پھر کلیوں جیسے سپید دانتوں تلے اس کا اپنے نچلے ہونٹ کو ہولے سے دبانا...... اس نے اس کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو پھر سوچتا چلا گیا۔ تب سوچ کی یہ گہرائی بھی ایک طرح کا درد پیدا کرنے لگی۔

اس نے شعوری طور پر سوچ کے گھوڑے کی باگیں موڑنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوا۔ اس کے خیالات کا رخ امو خالہ اور فارہ کی طرف ہو گیا۔ چند دن پہلے انکل اختر نے اسے فارہ کے دیوانے پن کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس نے اسے گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ اپنی سفلی خواہشات کا تعاقب کرتی ہوئی اتنی دور چلی جائے گی، یہ شامیر نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ انکل اختر کے مطابق اس نے خود اپنے جسم کو نوچ کھسوٹ کر اور اپنا لباس پھاڑ کر ایسا کرائم سین تخلیق کیا تھا جو شامیر کو بلا رکاوٹ آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا سکتا تھا۔ یقیناً فارہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں امو خالہ بھی اتنی ہی قصوروار تھیں جتنی وہ خود تھی یا شاید خود اس سے بھی بڑھ کر۔

جس وقت شامیر اسپتال کے اس کمرے میں یہ ساری باتیں سوچ رہا تھا، عین اس وقت ہزاروں میل دور...... لاہور میں امو خالہ کندھے سے شولڈر بیگ لٹکائے گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔ گھریلو ملازمہ نے دروازہ کھولا تھا اور امو خالہ کو بتایا تھا کہ فارہ بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی ہے۔

’’اس نے کچھ کھایا یا نہیں؟‘‘ امو خالہ (ثمینہ بیگم) نے پوچھا۔

’’نہیں جی۔‘‘ ملازمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’بڑی مشکل سے دو تین گھونٹ دودھ پلایا ہے انہیں۔‘‘

’’ایک دم نکمی اور احمق ہو تم۔ ایک ٹکے کی عقل نہیں ہے تمہارے اندر۔ روٹیاں اور پلنگ توڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی ہو۔‘‘

خالہ ثمینہ بکتی جھکتی اندر چلی گئیں۔ وہ سیدھی اس کمرے میں پہنچیں جہاں فارہ سفید بستر پر تکیے کے سہارے چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ پیشانی کی ایک جانب زخم کا ایک نمایاں نشان تھا۔ ایک آنکھ ٹھیک لیکن دوسری ادھ کھلی تھی۔ اس وجہ سے پورا چہرہ ہی عجیب شکل اختیار کیے ہوئے تھا۔ کچھ دن پیشتر آسٹریا میں پیش آنے والے اس ٹریفک حادثے کے اثرات میں سے سب سے نمایاں اثر فارہ کے دائیں پہلو پر تھا۔ اوپر سے نیچے تک جسم کا یہ حصہ یکسر مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

ثمینہ بیگم جلدی سے بیٹی کے سرہانے پہنچیں۔ ٹشو پیپر کے ساتھ وہ پانی صاف کیا جو فارہ کی ایک بانچھ سے بہہ نکلا تھا۔ فارہ کی نگاہیں ماں کے چہرے پر جمی تھیں۔

ثمینہ جانتی تھیں کہ وہ یوں اس کی طرف کیوں دیکھ رہی ہے؟

کل ایک پرائیویٹ اسپتال میں فارہ کے کئی ٹیسٹ ہوئے تھے۔ ان میں سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی وغیرہ بھی شامل تھے۔ آج نیوروفزیشن نے حتمی رپورٹ دینا تھی۔

ثمینہ کے چہرے پر طمانیت تھی۔ انہوں نے فارہ کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ ''کیا کہا ڈاکٹر نے؟'' فارہ نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔

جواب میں ثمینہ بیگم نے شولڈر بیگ میں سے ایک فولڈر نکال کر فارہ کے صحت مند ہاتھ میں دے دیا۔ ''تم خود پڑھ لو۔'' انہوں نے کہا۔

فارہ نے لیٹے لیٹے سرسری نظر سے رپورٹ کو دیکھنا شروع کیا۔ ثمینہ بیگم نے اس کا مفلوج ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''پروفیسر صاحب نے بہت امید دلائی ہے فارہ۔ وہ جو برین کے ایک چھوٹے سے حصے کے ''ڈیمج'' ہونے کا خطرہ تھا، وہ بھی غلط ثابت ہوا ہے۔ انہوں نے کہا ہے، دواؤں اور فزیوتھراپی سے دو تین مہینے کے اندر بہت بہتری ہو جائے گی۔''

فارہ کی نگاہیں بدستور رپورٹ کے اوراق پر تھیں۔ اس نے شک کی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ پھر لکنت زدہ لہجے میں کہا۔ ''...... یہ...... اصلی رپورٹ ہے نا؟''

''کیا مطلب...... میں تمہیں جعلی رپورٹ پڑھواؤں گی؟'' انہوں نے مصنوعی ناراضگی سے کہا اور فارہ کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

فارہ نے رپورٹ ایک طرف رکھ دی۔ ''پتا نہیں ماما! کیوں...... مجھے لگتا ہے...... کہ میں جلدی ٹھیک نہیں ہوں گی...... اور ہو بھی گئی تو...... شاید مجھے زندہ رہنے سے مرنا زیادہ اچھا لگے......'' وہ رک رک کر بولی۔

''مریں تیرے دشمن...... مرے وہ بدبخت، جس نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا بدذات کہیں کا...... بڑے گندے خون کی ملاوٹ ہوئی ہے یہ ہماری فیملی میں۔ اپنے باپ سے زیادہ بے فیض اور کمینہ نکلا ہے یہ، دیکھنا بڑی بری موت مرے گا۔ اسی حرامزادی، لفنگی ٹی وی رپورٹر کے لیے، اپنے پنڈے کو کوئلہ کر کے اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ ہاں، کسی گندی بے فیض نسل کا سفید خون ہے اس کے اندر۔ جنہوں نے یتیمی میں آسرا دیا، پال پوس کر کسی قابل بنایا ان کو دھکے اور پرائے دیس کے غیروں کے لیے جان بھی نچھاور۔''

فارہ نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ وہ ماں سے اس طرح کی باتیں پہلے بھی کئی دفعہ سن چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یہ لڑائی ہار چکی ہے اور اتنے برے طریقے سے ہاری ہے کہ خود کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں ہے۔

اسی دوران میں ملازمہ ایک ٹرے میں چکن سوپ، چاول اور کسٹرڈ وغیرہ لے آئی۔ ابھی ٹرے فارہ کے سامنے بھی نہیں رکھی گئی تھی کہ وہ ناک منہ چڑھانے لگی۔ ''نہیں...... میں نے نہیں لینا کچھ بھی۔'' اس نے منہ پھیرا۔ فالج سے اس کی آواز بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔

''نہیں فارہ...... دو چار لقمے لے لو۔ پروفیسر صاحب کہتے تھے......''

''نہیں...... میں نے کہا ہے نا۔'' وہ ماں کی بات کاٹ کر چڑچڑے انداز میں بولی اور ٹرے کو ہاتھ سے دھکیل کر خود سے دور کر دیا۔ پیالی میں سے کچھ سوپ اچھل کر کسٹرڈ میں گرا اور اسے بیکار کر گیا۔

''اچھا...... اچھا...... غصہ مت کرو۔'' ثمینہ بیگم نے کہا اور ملازمہ کو گھورتے ہوئے ٹرے اسے واپس تھما دی۔

فارہ نے پھر منہ پھیر لیا۔

ثمینہ بیگم اس کی ٹانگوں پر کمبل درست کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں آگئیں۔ فارہ کے کمرے سے باہر آتے ہوئے انہوں نے کمرے کی لائٹ آف کر دی تھی اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ان کے چہرے سے مصنوعی بشاشت رخصت ہو گئی۔ انہوں نے شولڈر بیگ کھولا اور اس میں سے وہ اصل رپورٹ نکال لی جو آج سینئر نیوروفزیشن نے انہیں دی تھی۔ وہ عینک چڑھا کر رپورٹ کو دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں آتشیں آنسو امڈنے لگے۔

رپورٹ اچھی نہیں تھی۔ وہ اس جعلی رپورٹ کے بالکل برعکس تھی جو فارہ کی تسلی کے لیے انہوں نے اصرار کر کے نیوروفزیشن سے بنوائی تھی۔ فارہ نے ابھی جس شبہے کا اظہار عام سے انداز میں کیا تھا، وہ بالکل درست تھا۔ یہ اصل رپورٹ بتا رہی تھی کہ مریضہ کے دماغ کے کچھ ٹشوز مکمل طور پر ''ڈیمج'' ہو گئے ہیں۔ اب ان کی بحالی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ میڈیکل کی مختلف اصطلاحات کے ذریعے فارہ کے مستقبل کا جو نقشہ کھینچا گیا تھا، وہ کسی بھی پہلو

سے حوصلہ افزا نہیں تھا۔

ثمینہ بیگم کے آتشیں آنسو ان کی گود میں گرنے لگے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ طیش کے عالم میں انہوں نے شامیر کے کمرے کی ایک الماری کھولی۔ اس الماری میں اس کے اہم کاغذات، تعلیمی اسناد اور تصویریں وغیرہ تھیں۔ انہوں نے غصے کے عالم میں یہ سارے اہم سرٹیفکیٹ، اسناد اور کاغذات پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیے۔ پھر ایک البم ان کے ہتھے چڑھا۔ اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ انہوں نے تصویروں کے بے شمار ٹکڑے گیس ہیٹر میں جھونک دیے۔

پھر الماری کے اندر ایک فریم پر ان کی نظر پڑی۔ اس یادگار فریم شدہ تصویر میں چھ سات سالہ شامیر اپنے والد کمال احمد کی گود میں نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے اس قیمتی فریم کو فرش پر پٹخ کر توڑا۔ ''جہنمی...... لعنتی...... جیسا باپ ویسا بیٹا۔'' وہ پھنکاریں اور فریم سے نکل آنے والی تصویر کو اپنے پاؤں سے روندنے لگیں۔ ملازمہ سہمی ہوئی تھی اور ایک کھڑکی کی جھری میں سے یہ مناظر دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

زویا، شامیر کی صحت کے سلسلے میں بے حد فکر مند تھی۔ وہ اشک بار ہو کر اس کے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ اتنے میں اس کے موبائل فون کی بیل ہوئی۔ وہ جائے نماز سے اٹھی۔ یہ میونخ سے اس کی ماما کا فون تھا...... زویا نے کل ہی ماما کو فون کیا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ وہ اور حولیہ برج برگ کے کس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ زویا نے ماما کو اس واقعے کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا تھا جو دو دن پہلے مقامی جیل کے لاک اپ میں پیش آیا تھا...... رابرٹ نے جس طرح ننھی عینی کو بھنبھوڑنے کی کوشش کی تھی، اس نے ایک طرح سے زویا اور رابرٹ کے تعلق کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی اور تو اور ماما بھی رابرٹ کے حق میں ایک لفظ نہیں بول سکی تھیں۔

''ہیلو ماما!'' زویا نے کال ریسیو کرتے ہوئے بجھی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''کہاں ہو تم اور حولیہ؟'' ماما نے حسبِ عادت خشک لہجے میں پوچھا۔

''وہیں ہوٹل میں ہیں۔''

''تو اب یہاں کب تک ٹکے رہنا ہے تم نے؟ لیونا برگ واپس جاؤ۔'' وہ تحکم سے بولیں۔

''بس ماما...... دو چار دن میں چلی جاؤں گی۔''

''دو چار دن میں دو ڈھائی سو یورو کرایہ مزید بھر و گی۔ ابھی کیوں نہیں جاتی ہو؟'' انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

زویا ان کی اس چبھن کی وجہ اچھی طرح جانتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شامیر یہاں برج برگ کے اسپتال میں ہے لہٰذا وہ بھی برج برگ میں رکی ہوئی ہے اور یہ بات ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ وہ شامیر کو ایسی حالت میں چھوڑ کر یہاں سے کیسے چلی جاتی۔ حولیہ کا خیال بھی یہی تھا کہ انہیں رکنا چاہیے۔

ماما کی کرخت آواز پھر فون پر ابھری۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولیں۔ ''دیکھو زویا! جو کچھ ہو چکا وہ بہت ہے۔ اب کچھ غلط نہیں ہونا چاہیے...... ورنہ میں تمہاری اپنی جان ایک کر دوں گی۔'' ان کی آواز اندرونی ہیجان کے سبب لرز رہی تھی۔

زویا نے ماں کو بہ مشکل سنبھالا اور باور کرایا کہ نمرسی والے معاملے کی گرد ذرا بیٹھ جائے تو وہ دونوں بہنیں واپس لیونا برگ چلی جائیں گی۔ وہ پریشان نہ ہوں۔

ماں سے گفتگو کرنے کے بعد زویا نے عینی کے لیے دودھ اور حولیہ کے لیے ناشتا تیار کیا۔ اس کے بعد حولیہ کو جگایا اور بتایا کہ وہ ''درس گاہ'' جانے کے لیے نکل رہی ہے۔ درس گاہ جانے کا پروگرام اس نے رات کو ہی بنا لیا تھا۔ حولیہ نے بھی مخالفت نہیں کی تھی۔ درس گاہ کے منتظم، ایک ممتاز عالم دین بزرگ تھے۔ ان کا نام مولانا نلام قادر تھا اور وہ ٹاؤن کی واحد مسجد کی امامت بھی کرتے تھے۔ زویا ان سے شامیر کے لیے دعا کرانا چاہتی تھی۔

وہ بذریعہ ٹیکسی کار دس بجے کے لگ بھگ درس گاہ پہنچ گئی۔ اس نے حجاب پہن رکھا تھا اور ایک سفید کھلے لبادے میں تھی جو کندھوں سے پاؤں تک چلا گیا تھا۔ مولوی صاحب سے اس کی ملاقات درس گاہ کے ہی ایک کمرے میں ہوئی۔ نورانی صورت والی اس حلیم الطبع شخصیت سے مل کر زویا کو ایک طرح کا روحانی سکون محسوس ہوا۔ زویا کی درخواست پر انہوں نے شامیر کے لیے دعا کی...... انہوں نے زویا کو کئی ایسی باتیں بتائیں جو اس کے بے قرار دل کے لیے کسی حد تک راحت کا باعث بنیں۔ انہوں نے کہا۔ ''ہر مقام شکر کا مقام ہوتا ہے، چاہے وہ ہماری سمجھ کے مطابق کتنا بھی تکلیف دہ کیوں نہ ہو اور صدقہ و خیرات بلاؤں کو ٹالتا ہے۔ ہماری یہ نیکی، ہمارے لیے کسی نہ کسی شکل میں ضرور آسانیاں پیدا کرتی ہے۔''

زویا جب مولانا سے مل کر درس گاہ سے باہر نکلی تو مسجد کے سامنے ایک بوڑھی، سفید فام عورت خستہ حالت میں کھڑی تھی، یقیناً کسی مالی مدد کی منتظر تھی۔ زویا کے دل میں عجیب سا گداز بھرا ہوا تھا۔ اس نے کچھ دیر تک سوچا، نقدی تو اس کے پاس تھوڑی ہی تھی...... اس کا کریڈٹ کارڈ بھی لیونا برگ میں ہی تھا...... اس نے اپنی انگلی سے سونے کا ایک Ring نکالا اور عورت کے لرزتے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''گولڈ کا ہے مدر۔'' اس نے کہا۔

عورت کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو امڈ آئے۔

زویا آگے بڑھ گئی۔ اس کی نگاہ دور ایک بلند صلیب پر پڑی۔ گھروں کی مخروطی چھتوں کے درمیان سے یہ صلیب ایک ٹاور کی طرح ابھری ہوئی تھی۔ یہ ٹاؤن کے چرچ کی صلیب تھی۔ چرچ کا خیال آتے ہی زویا کو فادر جوناتھن کا خیال بھی آ گیا۔ اسے پتا چلا تھا کہ چند روز سے وہ سخت بیمار ہیں۔ اس نے ان کی عیادت کا سوچا پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ آج ہفتے کا دن تھا۔ چرچ سے باہر بھی تو بہت سے ضرورت مند، محتاج اپنی آنکھوں میں انتظار لیے کھڑے ہوتے تھے۔

وہ چرچ کی طرف جانے کے بجائے قریبی مارکیٹ کی طرف مڑ گئی...... تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ مارکیٹ سے نکلی تو اپنی کلائی کی سوئس گھڑی مناسب قیمت پر بیچ چکی تھی۔ اس کے شولڈر بیگ میں اب کم و بیش تین سو یورو موجود تھے۔

وہ قریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ پیدل ہی طے کر کے چرچ پہنچی۔ وہاں ایک جانب تعمیر اور بحالی کا کام جاری تھا۔ چرچ کو دیکھتے ہی اس کے تصور میں وہ اندوہناک مناظر ابھر آئے جب یہاں آگ لگی تھی اور ایک تہلکہ مچا تھا۔ شعلے، دھواں، جان بچانے کی بھاگ دوڑ، کربناک آوازیں...... وہ سب کچھ زویا کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ وہ کسی شیر کی طرح شعلوں کی طرف جھپٹا تھا اور ایک بار نہیں، کئی بار...... دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے تھے اور تو اور فائر مین بھی حیرت زدہ تھے۔

ایک آہ کھینچ کر زویا حال میں واپس آ گئی۔ وہ اب چرچ کے سامنے والے احاطے میں تھی۔ یہاں ایک مستطیل شیڈ کے نیچے بہت سے مفلوک الحال، سوالی موجود تھے۔ اس نے اپنے شولڈر بیگ کی زپ کھولی اور دو تین منٹ کے اندر سارے یورو ان مستحق افراد میں تقسیم کر دیے۔

''ٹھیک ہو جاؤ شومیر...... ٹھیک ہو جاؤ...... اپنے قدموں پر کھڑے ہو جاؤ اور انہی قدموں پر چل کر یہاں سے...... اور یہاں کے خطرات سے دور چلے جاؤ۔ اپنے پیاروں میں پہنچ جاؤ......'' ایک خاموش دعا اس کے ہونٹوں پر تھی۔

وہ اب چرچ کے مین دروازے پر کھڑی تھی۔ ''میں فادر سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے ایک منتظم سے کہا۔

''فادر جوناتھن؟'' منتظم نے تصدیق چاہی۔

''جی ہاں۔''

''فادر تو نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب جناب؟''

''شاید تمہیں معلوم نہیں۔ کل شام انہیں سخت ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ ٹاؤن کے کارڈیک اسپتال میں ہیں۔''

''او گاڈ!'' زویا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

☆☆☆

فادر جوناتھن اسپتال کے ''سی سی یو'' میں پڑا تھا۔ اس کے لیے پچھلے چار پانچ دن، زندگی کے کٹھن ترین دن ثابت ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہر طرح کے مصائب نے اس کا گھر دیکھ لیا ہے۔ نمرسی اور مائیکل کے قتل کی خبر سن کر وہ سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو گیا ہے۔ وہ دونوں تو ایک ''ناقابل اصلاح گناہ گار'' کو ختم کرنے کے لیے نکلے تھے۔ وہ صحیح سلامت رہی تھی اور وہ خود لاشوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ کہا یہی جا رہا تھا کہ وہ کسی مخالف گروپ کی کارروائی کا نشانہ بنے ہیں۔

فادر کو خشامہ کی طرف سے بھی پریشانی تھی۔ جس رات نمرسی اور مائیکل والا واقعہ ہوا، اسی رات وہ بھی چرچ سے اوجھل ہو گئی تھی۔ فادر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ خیال یہی تھا کہ وہ بطور نن، چرچ کے پابند ماحول کو برداشت نہیں کر سکی۔ خاص طور سے مستقل طور پر...... تہ خانوں میں رہنا اس کے لیے بیزار کن ثابت ہوا ہے اور وہ کہیں نکل گئی ہے۔ دوسرا اندیشہ جو زیادہ تشویشناک تھا...... یہ تھا کہ کہیں نمرسی نے ہی اس کے ساتھ کچھ کر نہ ڈالا ہو۔ نمرسی بھی دو روز تہ خانوں میں ہی موجود رہا تھا...... وہ جوان اور خوبصورت تھی۔ عین ممکن تھا کہ نمرسی کی نگاہ اس پر پڑ گئی ہو اور وہ اپنی بدفطرت سے مجبور ہو گیا ہو۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ یہاں چرچ میں ڈیڑھ دو سال پہلے بھی ہوا تھا۔ ایک جواں سال جرمن پادری کی نیت ایک اٹالین نن پر خراب ہو گئی تھی۔ وہ اسے تہ خانے کے ایک الگ تھلگ کمرے میں لے گیا تھا۔ وہاں اس کے

ساتھ زیادتی کی اور اسے بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر غائب ہوگیا۔ اس بیس سالہ لڑکی کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں بھی کپڑا ٹھونسا گیا تھا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں ہی چل بسی تھی۔ بعدازاں لاش کی بو پھیلنے پر اس کا سراغ لگا تھا۔

اسی طرح کے اندیشے کے تحت فادر جوناتھن نے دوروز پہلے تہ خانوں کے ہر کونے کھدرے میں جھانک کر دیکھا تھا۔ فادر جانتا نہیں تھا کہ وہ جس کے بارے میں فکرمند ہے اور سوچ رہا ہے کہ کہیں وہ نمرسی کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو، وہ خود نمرسی کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوئی ہے...... وہ نمرسی کے قتل اور خشامہ کی گمشدگی میں کوئی لنک نہیں ڈھونڈ سکا تھا۔

اور پھر کل شام جب پولیس پارٹی اس سے ''چوری ہونے والی کار'' کے حوالے سے پوچھ گچھ کر کے واپس گئی تھی وہ سخت جھنجلاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ ان لمحوں میں اس کا دھیان ایک بار پھر زویا کی طرف چلا گیا۔ اس کے اندر طیش کی لہریں ابھرنے لگیں۔ اس نے سوچا تھا، کاش اس کے جسم میں اتنی توانائی ہوتی کہ وہ خود زویا تک پہنچتا اور اپنے ہاتھوں سے اس نافرمان، منحرف لڑکی کی جان لے لیتا۔ اس نے ہر قدم پر اپنی قوم، اپنے وطن اور مذہب کے لیے ندامتوں کے اسباب پیدا کیے تھے۔

زویا اور دیگر حالات کے بارے میں سوچتے سوچتے ہی اس کے سینے میں درد شروع ہوگیا تھا۔ سانس تو پچھلے کئی دنوں سے ابتر تھی، اس درد نے اس کی رہی سہی ہمت بھی ختم کردی اور وہ بیڈروم کے دروازے کے سامنے ہی چکرا کر گر گیا...... اس نے آج قریباً 18 گھنٹے بعد یہاں اسپتال کے سی سی یو میں آنکھ کھولی تھی۔ اب وہ پچھلے تقریباً دو گھنٹے سے اسی طرح چت لیٹا سوچ رہا تھا۔ اس کے جسم سے نالیاں لگی تھیں اور منہ پر گیس ماسک تھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں میں بار بار نمی جمع ہوجاتی تھی۔ ایک رقت سی طاری تھی اس پر۔

سبز لباس میں ملبوس نرس بڑے احترام سے اس کے سامنے جھکی اور اس کا بی پی چیک کرتے ہوئے بولی۔ ''فادر! آپ بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔ مشکل وقت گزر گیا ہے۔''

وہ بہت نحیف آواز میں بولا۔ ''مشکل وقت گزر گیا ہے مگر اس کے اثرات بھی تو کچھ کم مشکل نہیں ہیں۔ تمہاری جھوٹی تسلی کا شکریہ۔''

''جھوٹی تسلی نہیں فادر۔'' وہ کھوکھلے لہجے میں گویا ہوئی۔

''میں جانتا ہوں۔'' وہ ٹھہری آواز میں کہنے لگا۔ ''اب جتنا وقت بھی گزرنا ہے...... اس بستر پر ہی گزرنا ہے اور کتنا گزرنا ہے اس کا بھی کیا پتا؟ چند دن...... چند مہینے...... یا کیا پتا چند منٹ۔''

''پلیز فادر! ایسا مت کہیں۔ برج برگ میں بہت سے لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے۔''

فادر کی آنکھوں میں پھر نمی آگئی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ نتھنوں میں دواؤں اور کیمیکلز کی بو تھی۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب کایا کلپ محسوس کر رہا تھا۔ ماضی بعید اور ماضی قریب کی ساری کوتاہیاں اور غلط رویاں اسے یاد آنے لگیں۔ نوجوانی کے کچھ کمزور لمحے، درمیانی عمر کی منافقت اور بڑھاپے کی ہوس زر...... وہ اپنے ہی اندر مسمار ہونے لگا تھا۔ آنسو آنکھوں کے گوشوں سے رسنے لگے اور کنپٹیوں کی طرف بہنے لگے۔

یہی وقت تھا جب اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ زویا اندر آرہی تھی...... ہاں، یہ سارہ کی بیٹی زویا ہی تھی۔ وہ ایک کھلے لبادے میں تھی۔ اس نے اسکارف لے رکھا تھا۔ اسکارف اور لبادہ سفید تھے۔ اس کے چہرے پر ملکوتی اجالا تھا جیسے جنت کی کوئی دوشیزہ ہو...... اور ہوا پر پاؤں رکھتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی ہو۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا گلدستہ تھا۔ وہ اس کے قریب رکھی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کی آواز جیسے کافی فاصلے سے جوناتھن تک پہنچ رہی تھی۔ ''فادر! آپ کیسے ہیں؟''

فادر جوناتھن نے اثبات میں سر ہلایا۔

''فادر! آپ نے بہت زیادہ ٹینشن لی ہوئی تھی۔ پلیز آپ خود کو ریلیکس کریں۔ سب اچھا ہوجائے گا۔''

''خدا کرے سب اچھا ہوجائے۔'' فادر نے نحیف آواز میں کہا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''تم اور حولیہ ٹھیک ہونا؟''

''ہاں فادر! آپ کی دعا ہے۔ بس حولیہ کو ایک بازو پر کچھ زخم آئے تھے لیکن اب وہ بھی ٹھیک ہے۔''

''اور...... وہ پاکستانی...... شامیر؟''

''وہ کافی زخمی ہے فادر...... آپ اس کے لیے دعا کرنا۔'' زویا کی آواز بھرا گئی۔ فادر نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ بولی۔ ''شامیر کو اس حال تک پہنچانے والے دو تو اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں...... اگر کوئی اور ہے تو اللہ کرے وہ بھی سزا پائے۔'' زویا کا اشارہ نمرسی اور مائیکل کی

طرف ہی تھا۔

فادر نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ تازہ آنسو اس کی سفید براق کنپٹیوں کی طرف ڈھلک گئے۔

''آپ کی دعاؤں میں بہت اثر ہے فادر۔ چرچ میں ہمیں آپ کی پناہ میسر نہ آئی ہوتی تو نمرسی کے کارندے دو ہفتے پہلے ہی ہماری جان لے چکے ہوتے۔ چرچ کی آگ میں سے بھی آپ ہی کی دعاؤں نے ہمیں زندہ نکالا۔ اب بھی یہ دعائیں درکار ہیں......''

فادر جوناتھن دھندلائی نظروں سے زویا کے چہرے کو دیکھتا چلا جارہا تھا۔ اس کے اندر لعنت وملامت کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ وہ چالیس سال سے کنفیشن باکس میں بیٹھ کر لوگوں کے اعترافاتِ گناہ وجرم سن رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں آج اس کا دل چاہا کہ وہ اس اجلی اجلی ''فرشتہ صورت'' لڑکی کو باکس کے اس حصے میں بٹھائے، جہاں وہ خود بیٹھتا رہا ہے اور خود پردے کی اس جانب کھڑا ہو جائے جہاں اعترافِ گناہ کیا جاتا ہے۔ وہ سب کچھ اس کے گوش گزار کر دے جو ایک گاڑھے سیاہ دھوئیں کی طرح اس کے سینے میں جمع ہو رہا ہے۔

یہ چرچ نہیں اسپتال تھا، یہاں کنفیشن باکس بھی نہیں تھا۔ پھر بھی جوناتھن کو یہی لگا جیسے وہ باکس میں ہے اور پردے کی دوسری جانب سفید لباس میں زویا بیٹھی ہے۔ اس نے اپنے کمزور استخوانی ہاتھ میں زویا کا ہاتھ تھاما۔

''زویا......'' اس نے بہ مشکل کہا۔ الفاظ اس کے گلے میں اٹک گئے۔

اس نے آنکھیں پھر موند لیں۔ کتنی ہی دیر، اپنے اندر طاقت جمع کرتا رہا...... مگر طاقت جمع نہیں ہوئی۔ اس نے آنسوؤں کا ایک گھونٹ بھرا اور زویا کی طرف دیکھے بغیر بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ''بیٹی! مجھے معاف کر دینا۔''

وہ جیسے سرتاپا لرز گئی۔ ''فادر! آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ آپ کس بات کی معافی مانگ رہے ہیں؟''

''ہر بات کی۔'' فادر نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا اور اپنے سینے پر کراس کا نشان بنایا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب کیفیت تھی۔

''فادر...... پلیز مجھے شرمسار نہ کریں، آپ تو خدا کے برگزیدہ ہیں۔ بے شمار لوگوں کے لیے آپ کی زندگی ایک مثال ہے...... مذہب اور عقیدے سے قطع نظر آپ وسیع نظر رکھنے والے ایک مہربان شخص ہیں۔ اوپر والا آپ کے عقیدت مندوں کے سر پر آپ کا سایہ سلامت رکھے۔''

''زویا! تمہارے خیالات کے لیے شکریہ۔'' فادر نے آنکھیں بند کیے کیے کہا پھر ہاتھ سے اس بات کا اشارہ دیا کہ وہ اب جا سکتی ہے۔

فادر کا کندھا چھو کر وہ اٹھی۔ خدا حافظ کہہ کر چند قدم الٹے پاؤں چلی پھر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

کڑوی کسیلی دواؤں کی وجہ سے شامیر کی طبیعت ہر وقت مکدر رہتی تھی۔ تاہم کسی وقت وہ تھوڑی سی راحت بھی محسوس کرتا تھا۔ اس وقت بھی کچھ ''ریلیف'' کی کیفیت تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ برج برگ کی فضا میں ایک خوشگوار سہ پہر کی چمک تھی۔ نیلے آسمان کا ایک شفاف ٹکڑا کھڑکی میں سے دکھائی دیتا تھا۔ سفید پرندوں کی ایک چھوٹی سی قطار، دو سیکنڈ کے لیے جھلک دکھا کر اوجھل ہو گئی۔ نیچے کیاریوں میں سن فلاور...... گیندے اور گلاب کے پھول رنگ بکھیر رہے تھے اور کسی وقت مدھر ہوا کا ہاتھ انہیں جھومنے پر اکساتا تھا۔

سامنے ہی پتھر کا ایک بینچ نظر آرہا تھا۔ لمبے بالوں والا ایک ٹین ایجر لڑکا ہیڈ فون لگائے میوزک سن رہا تھا۔ غالباً کوئی رنجیدہ گانا ہی تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی دکھائی دیتی تھی۔ پھر اس نے جلدی سے اپنی پینٹ کی جیب ٹٹولی...... اور سیل فون نکال لیا۔ کسی کی کال آئی تھی۔ اس نے کال ریسیور کی۔ اس کے کتابی چہرے پر خوشی اور مسرت کی یلغار سی ہو گئی۔ اس نے فون کو دو تین بوسے دیے۔ شاید اس کی کوئی گرل فرینڈ ہی تھی۔ وہ باتیں کرتا ہوا اٹھا اور دوسری طرف چلا گیا......

شامیر، بستر پر نیم دراز سوچنے لگا۔ کبھی کبھی کوئی ای میل، کوئی فون کال، یا پھر پوسٹ مین کی دستک انسان کے لیے کس قدر جاں فزا ثابت ہوتی ہے...... اس کا دھیان بے ساختہ چار برس پہلے کے شب وروز کی طرف چلا گیا۔ ایک ایسی ہی دستک اس کے لیے بھی تو ہوئی تھی۔ یہ خوشی اور امید کی دستک تھی جو لاہور میں ان کے گھر پر ہوئی تھی۔ زویا کی ہمراز دوست جین، زویا کی حالت سے غمزدہ ہو کر شامیر کو ڈھونڈتی ہوئی لاہور اس کے گھر پہنچی تھی۔ بدقسمتی سے وہ گھر پر نہیں تھا۔ اگر تب جین کے آنے کی اطلاع اس تک پہنچ جاتی تو شاید حالات وہ نہ ہوتے جو آج تھے۔ شاید بہت پہلے اس کی اور زویا کی دوریاں ختم ہو گئی ہوتیں۔ شاید وہ اپنی مراد پا چکا ہوتا۔ شاید...... شاید۔ ایسے بہت سے حسرت ناک ''شاید'' ہر انسان کی زندگی میں موجود ہوتے ہیں۔ اگر

اس وقت اموخالہ کے دل میں رحم آ جاتا اور وہ جین کا رابطہ اس سے کرا دیتیں تو شاید......

ہاں پھر وہی شاید۔

اموخالہ کی اس ''سخت دلی'' نے امید کی وہ کرن اندھیروں میں غرق کر دی تھی جو چار سال پہلے اس داستان کو ایک حسین موڑ دے سکتی تھی۔ اب وہ حسین موڑ رہا تھا، نہ وہ اموخالہ اور نہ وہ فارہ۔ وہ دونوں اپنے ہی ایجاد کیے ہوئے عذاب میں گرفتار ہو چکی تھیں۔ یہاں شامیر اپنی اذیتوں کے گھیرے میں تھا۔

شامیر نے دروازے کی جانب دیکھا اور یکبارگی دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ حولیہ اندر آ رہی تھی۔ آج زویا کی طرح وہ بھی حجاب میں تھی۔ اس نے اسپتال کا ''ملاقاتیوں والا گاؤن'' پہن رکھا تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ اس کے قریب رکھی نشست پر بیٹھ گئی۔ آج پہلی بار شامیر نے حولیہ کے چہرے پر اپنے لیے اپنایت اور ہمدردی کے تاثرات دیکھے۔

''شکر ہے، تم میں سے کسی کی شکل تو نظر آئی۔'' شامیر نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔''زویا پھر کیوں نہیں آئی؟''

''فون پر زویا اور میں یہاں کے میڈیکل اسٹاف سے مسلسل رابطے میں رہی ہیں۔ تمہاری خیریت پوچھتی رہی ہیں۔''

''بس فون پر ہی؟''

''شامیر! ویری سوری۔ میں نے کل ہی چکر لگانا تھا مگر پھر زویا کو کسی ضروری کام سے ڈاؤن ٹاؤن جانا پڑ گیا۔ راستے میں اسے پتا چلا کہ فادر جوناتھن کو اٹیک ہوا ہے اور وہ اسپتال میں ہیں۔ مجبوراً وہ وہاں چلی گئی۔''

دونوں میں کچھ دیر تک فادر کی صحت کے بارے میں گفتگو ہوئی پھر شامیر نے زویا اور عینی کے بارے میں پوچھا۔ حولیہ بولی۔ ''زویا بھی کل ضرور آئے گی۔ وہ چار پانچ روز سے آنا چاہ رہی ہے مگر کسی حد تک نمرسی کا خوف ہی تھا جو ہمیں بار بار ہوٹل سے نکلنے سے روک رہا تھا...... خیر اب نمرسی تو اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ ایسے شخص کے جانے پر تو خدا کا شکر ہی کرنا چاہیے۔''

نرس آئی اور شامیر کے سلامت بازو پر لگے کینولا میں ایک انجکشن دے کر چلی گئی۔

حولیہ، شامیر کی حالت سے پریشان تو تھی مگر اس نے پرخلوص انداز میں شامیر سے امید افزا گفتگو کی۔ وہ اپنے سابقہ رویے پر بھی بے حد شرمندہ تھی۔ اس شرمندگی کے نتیجے میں اس کی آنکھوں میں مسلسل آنسو جھلملاتے رہے......

ملاقات کا وقت محدود تھا، کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلی گئی۔

اگلے روز کا انتظار شامیر نے بے حد شدت سے کیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ دس بارہ گھنٹے نہیں، دس بارہ مہینے ہیں۔ پچھلی بار زویا جب تک اس کے پاس رہی تھی، وہ اپنی ہر تکلیف بھول گیا تھا۔ اب بھی اسے یہی امید تھی۔ اس کی نگاہ بار بار بے ساختہ، وال کلاک کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ بالآخر وہ آ گئی۔ وہ لیونا برگ کی ایک بڑی چمکیلی سہ پہر تھی۔ آج شامیر کی طبیعت بھی قدرے بہتر تھی۔ یا شاید یہ زویا کا انتظار ہی تھا جس نے تکلیف کی طرف سے اس کا دھیان ہٹا دیا تھا۔ وہ ہلکے رنگ کے مشرقی لباس شلوار قمیص میں تھی۔ اندر آنے کے بعد وہ حجاب کو ایک دوپٹے کی طرح اپنے سر پر اوڑھ لیتی تھی۔

''زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟'' وہ وال کلاک کو دیکھ کر بولی۔

''دیر تو یقیناً ہو گئی ہے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''لیکن جب آنے والا آ جائے تو شکوے بھول ہی جاتے ہیں۔''

''بس یہاں کی فارمیلٹیز میں دیر ہو جاتی ہے۔ ورنہ میں تو ایک بجے ہوٹل سے نکل آئی تھی۔''

دونوں نے تھوڑی دیر تک نمرسی کی موت کے بارے میں بات کی۔ نمرسی اور اس کی سفاکی کے بارے میں اب زویا اور شامیر کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہ گیا تھا۔ فادر جوناتھن کے گھر قیام کے دوران میں ہی شامیر نے زویا کو بتا دیا تھا کہ وہ حولیہ پر ہونے والے ستم سے آگاہ ہو چکا ہے۔ زویا کی زندگی پر منڈلانے والا ایک اور بدکردار اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا اور یہ شامیر کے لیے بہت اطمینان بخش تھا۔ لیکن وہ انجام کو کیسے پہنچا، اصل میں اس کے پیچھے کس کا کردار تھا؟ یہ ان دونوں کے لیے راز تھا اور راز ہی رہنا تھا۔ وہ لڑکی جس کا نام خشامہ تھا، اب ایک الگ دنیا کی باسی تھی۔

زویا نے کہا۔ ''میں نے آج بھی سینئر ڈاکٹر تھامسن رے سے بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علاج اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جب انفیکشن رک جائے گا اور زخم مندمل ہونا شروع ہو جائیں گے تو پھر جسم کی اسکن گرافٹنگ کے بارے میں سوچا جائے گا۔ شکر ہے کہ تمہارا چہرہ محفوظ رہا ہے۔ انشاء اللہ پلاسٹک سرجری صرف جسم کے لیے ہوگی اور جب یہ ہو جائے گی تو باڈی بالکل پہلے کی طرح ہو جائے گی۔''

''لیکن یہ کام زیادہ جلدی بھی نہیں ہونا چاہیے۔'' شامیر نے دبی دبی سی مسکان کے ساتھ کہا۔

''کیا مطلب؟''

"لگتا ہے کہ تم نے تو مجھے چار ہفتوں میں کھڑا کر دینے کا پروگرام بنالیا ہے۔ ایسا ہوگیا تو پھر تو میں چلا جاؤں گا واپس۔ ایسی تسلی تشفی والی نایاب باتیں مجھ سے کون کرے گا؟"

جب بھی شامیر کوئی ایسی معنی خیز بات کرتا تھا، زویا موضوع بدل دیتی تھی۔ شاید وہ کسی ایسے رخ پر جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اب بھی اس نے شامیر کا تکیہ درست کرتے ہوئے بات بدلی۔ "ماما سے پھر تو بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔"

"تمہیں بات کرنی بھی نہیں چاہیے شومیر! بات تو انہیں کرنی چاہیے...... بلکہ انہیں معافی مانگنی چاہیے تھی تم سے۔ حولیہ نے مجھے بتایا ہے، ایسن میں انہوں نے تم سے بہت برا سلوک کیا۔" زویا کی آواز کرب میں ڈوب گئی۔

"میں وہ سب بھول چکا ہوں زویا! ویسے بھی وہ بڑی ہیں۔ وہ جو بھی کہہ لیں، ان کا حق بنتا ہے۔"

"لیکن...... انہوں نے جو بھی کہا، جو بھی سوچا وہ سب کا سب غلط تھا شومیر! ایک عمر رسیدہ تعصب نے انہیں اندھا بہرا کر چھوڑا ہے۔ وہ یہی سمجھتی رہیں کہ حولیہ پر ستم ڈھانے اور انہیں زخمی کرنے والا فعل پاکستانی سہراب درانی نے انجام دیا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر نمرسی کی سفاکی تھی اور نمرسی جرمن تھا۔ میری زندگی کو مسلسل عذاب بنانے والا بھی کوئی اور نہیں ان کا چہیتا ہم قوم رابرٹ ہی تھا۔ بچہ نہ ہونے کے سبب حولیہ کو اپنی زندگی سے دور کرنے والا بھی ایک جرمن ہی ہے اور پھر جن لوگوں نے مجھے اور میری بچی کو کوئی روز میرے ہی گھر میں یرغمال بنایا، وہ کون تھے؟ وہ بھی ایشیائی نہیں تھے، نہ ہی مسلمان تھے۔ وہ یہاں کے مہذب جرمن ہی تھے، ہاں مہذب جرمن اور مہذب سفید فام جو چرچ میں لگنے والی آگ کے موقع پر قطار اندر قطار کھڑے تھے اور بے بس نظر آرہے تھے۔ اندر میری بہن اور خود میری ماں موت کے دہانے پر تھیں۔ تہذیب تو انسانیت اور قربانی سکھاتی ہے۔ اس وقت انسانیت اور قربانی کسی جرمن میں نہیں غیر جرمن میں نظر آئی۔ تم نے اپنی جان شدید خطرے میں ڈالی اور ان دونوں کو بھڑکتے شعلوں سے نکالا لیکن وہ میری ماما ہیں، میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ ان سب باتوں کو سمجھنے کے باوجود کبھی نہیں سمجھیں گی۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ان کو اپنی قوم سے غداری کی طرح لگے گا۔"

"زویا! میرے خیال میں ان کے رویے کے پیچھے ان کی ازدواجی زندگی کا بھی کچھ عمل دخل رہا ہے۔" شامیر نے نحیف آواز میں کہا۔

"شومیر! اگر میرے مرحوم والد میں کچھ خامیاں تھیں تو ان میں وہ اکیلے قصوروار نہیں تھے۔ یہ تالی دونوں ہاتھوں کے ساتھ بجتی رہی ہے مگر اس کا یہ مطلب کیسے ہوگیا کہ کسی ایک فرد کی وجہ سے ایک پورے خطے یا اس خطے میں بسنے والے لوگوں کو ہی ملعون و مطعون کر دیا جائے۔"

"میں تمہاری اس بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں زویا۔ ہر قوم اور خطے میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ کیا مجھے جرمنی میں اچھے دوست نہیں ملے؟ جین، ٹام، مارگریٹ یہ سب جرمن ہی تو ہیں...... اور پھر نومسلم مسز حامدہ جن کی آنکھوں میں، میں نے ہر کسی کے لیے بے لوث محبت کی جوت جلتے دیکھی ہے۔"

پیتھالوجسٹ کی آمد پر زویا کو باہر جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر تھامسن رے کی عنایت سے وہ پھر اندر آنے اور تسلی سے شامیر کے پاس بیٹھنے میں کامیاب ہوگئی۔ کھڑکیوں سے باہر پھولوں کے رنگ تھے اور ایک خوشبودار ہوا تھی جو

صرف محسوس کی جا سکتی تھی۔
شامیر نے کہا۔ ''زویا! ایک سوال عرصے سے ایک کانٹے کی طرح میرے دل میں چبھا ہوا ہے اور شاید ہمیشہ چبھا رہے گا۔ کیا تم مجھے اس سوال کا جواب دے کر اس اذیت سے نکال سکو گی؟''
زویا کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ ''کیسا سوال؟'' اس نے ذرا جھجک کر کہا۔
''ناراض تو نہیں ہو گی؟''
اس نے اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا اور نفی میں سر ہلایا۔
''زویا! کیا میرے یہاں سے جانے کے بعد تم واقعی اپنے مسائل میں گم ہو کر رہ گئی تھیں؟ کیا تم نے کبھی مجھے یاد نہیں کیا؟''
وہ شامیر کو دیکھے بغیر بولی۔ ''کیا، میں خاموش رہنے کا حق استعمال کر سکتی ہوں؟''
''یہ حق تو تم بہت عرصے سے استعمال کر رہی ہو۔'' اس نے کہا اور ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جب وہ آنکھیں بند کرے گا تو آنکھوں میں بند دو موتی باہر لڑھک آئیں گے۔ وہ شرمندہ ہو گیا مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔
ان دو آنسوؤں نے زویا کے دل پر عجیب سا اثر کیا۔ جیسے پانی سے لبالب بھری ہوئی ایک گھاگر کو ٹھوکر لگ جائے۔ وہ کتنی ہی دیر تک کچھ بولنے کی کوشش کرتی رہی مگر سمجھ نہیں پائی کہ کیا کہے؟ شامیر بھی اسی طرح آنکھیں بند کیے چت لیٹا رہا۔ اس کے زخم زخم جسم کے خیال سے زویا کا دل بھر آیا۔
''ناراض ہو گئے ہو؟'' اس نے ہمت کر کے پوچھا۔
''یہ حق تو نہیں ہے مجھے۔''
''اچھا..... پوچھیں جناب۔''
زویا کے اس طرح مخاطب کرنے پر شامیر کے چہرے پر عجیب سی رونق اڈ آئی۔ جسمانی تکلیف کہیں دور پس منظر میں چلی گئی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔
''کبھی یاد کیا مجھ کو؟''
زویا کے ہونٹ بے ساختہ لرزے مگر وہ کچھ بول نہیں سکی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اچھے دنوں میں جب کوئی چاہت کی بات کرنا ہوتی تھی، وہ اس کی پشت کی طرف جا کر اسے اپنی بانہوں میں لے لیتی تھی اور اس کے کان میں دلنشین سرگوشی کرتی تھی۔ آج بھی شاید وہ یہی جھجک محسوس کر رہی تھی۔
شامیر نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ''چلو...... میں اس طرف دیکھ لیتا ہوں، اب جو جی میں آئے کہہ دو۔''
شامیر کا بایاں ہاتھ زویا کے گھٹنے کے بالکل پاس تھا۔ اس نے اسے تھاما اور اپنی شہادت کی انگلی سے بڑی نرمی کے ساتھ اس کی ہتھیلی پر yes کے حروف لکھے۔ اس نے شامیر کے سوال کا جواب اثبات میں دیا تھا یعنی وہ اسے یاد کرتی رہی ہے۔
اپنی ہتھیلی پر حروف کا لمس محسوس کر کے شامیر کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ اسے لگا کہ ایک سخت برف تھی جو پگھل رہی ہے۔ اس نے مڑ کر زویا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ گلاب ہو رہا تھا۔ ان لمحوں میں ایک نہایت دھیمی سی جھجک آمیز شوخی اسے زویا کی جھکی ہوئی پلکوں پر دکھائی دی۔
''کتنا یاد کیا؟'' اس نے پوچھا اور منہ پھر دوسری طرف پھیر لیا۔
''بہت زیادہ.....'' زویا نے پھر انگلی سے اس کی ہتھیلی پر لکھا۔
''کتنا زیادہ؟''
''بہت ہی زیادہ۔ ہر پل......''
''تو پھر، میرا دل اتنا کیوں دکھایا...... کیوں کہا کہ اب سب کچھ بدل چکا ہے؟ کیوں مجھے لیونا برگ سے بھگانے کے لیے اتنی سرد مہری دکھائی؟'' وہ منہ پھیرے پھیرے بولا۔
''......SORRY'' اس نے شامیر کی ہتھیلی پر لکھا۔ کتنا مختصر مگر جامع جواب تھا۔
شامیر نے منہ پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔ زویا کی آنکھوں میں گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے...... کسی بھی وقت آنسوؤں کی موسلا دھار بارش ہو سکتی تھی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ وہ اچانک رونے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ کریم کلر کے اسکارف میں چھپا لیا تھا۔ شامیر کو فقط اس کی پیشانی نظر آ رہی تھی جس پر رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے آنسو بے آواز تھے۔ پندرہ بیس سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔
''پلیز زویا! ایسا مت کرو۔'' اس نے کہا۔
وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ شاید لابی میں بیٹھ کر اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا تھا۔
پانچ دس منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ اوس میں دھلے سرخ و سپید پھول کی طرح تھا۔ اسے دوبارہ اپنے

پاس دیکھ کر شامیر کی پنڈلیوں کی طرف سے اٹھنے والی درد کی شدید لہریں ماند پڑ گئیں۔
اس کا دل چاہا کہ وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر زویا کو گلے سے لگا لے لیکن کیسے؟ وہ تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔
''زویا! تم نے آج میرے لیے مشکلیں پیدا کر دی ہیں۔''
''کیا مطلب؟''
''اسپتال میں سب سے زیادہ ڈر تو موت کا ہی ہوتا ہے مگر مجھے بالکل ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ ہاں، اب لگ رہا ہے۔''
''پلیز شومیر! ایسی باتیں مت کرو۔ تم نے چند روز میں بالکل ٹھیک ہو جانا ہے۔''
''اب تو شاید ہونا ہی پڑے گا۔ گہری تاریکیوں میں کچھ روشنی سی نظر آنے لگی ہے۔''
''آپ صحافی ہو کر بھی کبھی ادیبوں والے لفظ استعمال کرتے ہیں۔''
''اچھے لفظ استعمال کرنے میں تو تم بھی کسی سے پیچھے نہیں ہو زویا...... اور ابھی تم نے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ میری زندگی کا یادگار ترین لفظ بن گیا ہے۔ اس کے اندر چھپی ہوئی خوبصورتی اور محبت کو میں زندگی بھر فراموش نہ کر سکوں گا۔''
''کون سا لفظ؟''
''جو تم نے میری ہتھیلی پر آخر میں لکھا۔'' وہ آنکھیں بند کیے کیے بولا۔
''وہ تو میں بہت دفعہ لکھ سکتی ہوں۔'' وہ پلکیں جھکا کر بولی۔
عجب جذب کے عالم میں اس نے شامیر کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی ہتھیلی پر اپنی شہادت کی انگلی سے پھر sorry لکھ دیا۔
شامیر نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ادویات کا اثر شاید ختم ہو رہا تھا۔ پاؤں کے ناخنوں سے لے کر ہنسلی کی ہڈیوں تک درد کی شدید لہریں اٹھنا شروع ہو گئی تھیں مگر زویا کی موجودگی میں یہ لہریں تکلیف نہیں دے رہی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے کیے، ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''کچھ اور بھی لکھنا چاہو تو لکھ دو۔''
''اور کچھ نہیں۔'' وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔
''کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔ لکھ دو۔ کہتے ہیں کہ آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔''
اس کے چہرے پر پھر سرخی پھیل گئی۔ اس نے نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا۔ کن انکھیوں سے شامیر کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھیں بدستور بند کر رکھی تھیں۔ اس نے ہتھیلی پر لکھ دیا SORRY اور نیچے لکھا STILL LOVE YOU۔
اس کی پلکوں پر پھر دو موتی آن اٹکے تھے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''بس اب چلتی ہوں۔'' وہ نظر چرا کر بولی۔ آنکھوں میں بادل پھر گہرے ہو گئے تھے۔
اس سے پہلے کہ شامیر اسے روکنے کے لیے کچھ کہتا، ایک مقامی بچی ایک لیڈی ڈاکٹر کی انگلی پکڑے ہوئے اندر آئی۔ پانچ چھ سالہ بچی کے ہاتھ میں سرخ گلاب کی ایک کلی تھی۔ اس نے یہ کلی شامیر کے سرہانے رکھی اور جرمن میں شکریے کے کچھ کلمات ادا کیے۔
ڈاکٹر نے انگلش میں ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان سب 120 بچوں کی طرف سے جو لیونا برگ کے اسکولوں سے آئے ہیں اور آپ کی عیادت کے لیے یہاں پہنچے ہیں۔ یہ سب بچے آپ کے لیے دعاگو ہیں۔''
''میں اس تعریف کے قابل نہیں ہوں۔ بہرحال ان معصوم ہستیوں کا بہت شکریہ۔'' شامیر نے کہا۔
چند فقروں کے تبادلے کے بعد بچی اور ڈاکٹر واپس چلے گئے۔ شامیر نے چونک کر دیکھا۔
زویا بھی جا چکی تھی۔ شامیر کی ہتھیلی پر جیسے نایاب قیمتی موتی رکھے ہوئے تھے۔ یہ چار لفظ نہیں، چار موتی ہی تھے۔ ''سوری...... اسٹل لو یو......'' اس نے مٹھی بند کر لی۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ یہ موتی گر جائیں گے یا کوئی ان کو دیکھ لے گا۔ انبساط کی لہریں اس کی ہتھیلی کے اندر سے اٹھ رہی تھیں اور پورے جسم میں پھیل رہی تھیں۔ یہ لہریں اس بے پناہ تکلیف پر حاوی تھیں جو اس کے روئیں روئیں میں بسی ہوئی تھی...... کچھ وقت کے لیے کم ہو جاتی تھی مگر پھر پلٹ آتی تھی۔
یہی وقت تھا جب سینئر ڈاکٹر تھامسن رے اپنے آفس میں ایک جونیئر ڈاکٹر کے ساتھ موجود تھے۔ وہ شامیر کی تازہ میڈیکل رپورٹس دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں تشویش ابھر رہی تھی۔ کافی ساری جلد کافی جا چکی تھی پھر بھی انفیکشن رک نہیں پا رہا تھا۔ سینے اور پیٹ پر آگ کے اثرات بہت زیادہ تھے۔ اندرونی عضلات، خاص طور سے جگر بھی متاثر ہوا تھا۔ کوئی کرشمہ ہی مریض کو بحالی کی طرف لا سکتا تھا۔ ڈاکٹر تھامسن رے روزانہ ہی آگ سے متاثرہ بیسیوں مریضوں کو دیکھتے تھے...... مگر اس پاکستانی مریض کے لیے

وہ اپنے اندر ایک خاص قسم کی ہمدردی اور تشویش پاتے تھے۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، بہت کم لوگ کر پاتے تھے۔

☆☆☆

زویا اب تقریباً روزانہ ہی اسپتال آرہی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ دیر اس کے پاس رہنے کی کوشش کرتی۔ تیز دواؤں کے زیر اثر شامیر پر کسی وقت غنودگی بھی طاری ہوتی لیکن وہ زویا کی باتیں سنتا رہتا اور حسب حال جواب بھی دیتا۔ وہ اس کا بایاں ہاتھ اپنے نرم ہاتھ میں تھام لیتی۔ کسی وقت اس کی ہتھیلی پر انگلی سے لکھ دیتی LOVE YOU وہ غنودگی میں بھی ہوتا تو اس کے چہرے پر ایک روشنی سی پھیل جاتی۔

ایک روز وہ آئی تو شامیر کی طبیعت نسبتاً بہتر تھی۔ زویا نے اپنے ہاتھ سے اسے تھوڑا سا جوس پلایا۔ ''بستر کی ٹیک تھوڑی سی اونچی کردوں؟'' زویا نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

اس نے ٹیک اونچی کردی۔ وہ محویت سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہو شومیر؟''

''دیکھ نہیں رہا، سوچ رہا ہوں...... یہ زیادتی کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ؟''

''کون سی؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''یہی انگلش بولنے والی۔ تمہاری اس گلابی اردو کو میں ترس گیا ہوں۔''

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ''تو...... ٹھیک ہے۔ اردو ہی سہی لیکن کسی غلط لفظ پر تو م کو میرا مذاق ناہیں اڑانا ہوئیں گا۔''

''تمہیں لگتا ہے کہ میں مذاق اڑانے کے قابل ہوں؟''

''کیا مطلب؟''

''مذاق اڑاؤں گا، مگر ٹھیک ہونے کے بعد۔ جی چاہتا ہے کہ ہم وہ سب کچھ دہرائیں جو چار سال پہلے کے اس جولائی میں ہوا تھا اور جس کا ہر ہر منظر میرے ذہن پر نقش ہے۔''

''بس...... فی الحال آپ اپنا سارا توجہ اپنی تندرستی پر دیں۔'' (وہ اب اکثر اسے 'آپ' کہہ کر بھی بلاتی تھی)

''جی چاہتا ہے زویا کہ وقت پلٹ آئے۔ ہم پھر اسی جگہ 21 نمبر ٹرین کے آخری اسٹاپ پر جا کھڑے ہوں۔ اس بار جب تم مجھے چھوڑ کر جاؤ تو...... میری آواز میرے گلے میں نہ پھنس جائے۔ میں تمہیں پکار سکوں...... بلکہ کتنا اچھا ہو کہ تم جاؤ ہی نہ۔''

وہ بس ایک ''ہوں'' کر کے رہ گئی۔ آنکھوں میں گہرا کرب کروٹیں لے رہا تھا۔

''یہ انا ہمارے آڑے کیوں آجاتی ہے زویا۔ ہم ایک دوسرے کو پکار کیوں نہیں سکتے؟ کیوں واپس نہیں بلا سکتے؟''

''انا اور شاید کچھ دنیا کا ڈر بھی...... شاید اسی کو تقدیر کا نام ڈیا جاتا ہے۔ ہام تقدیر سے ناہیں لڑ سکتے اور نہ وقت کو واپس بلا سکتے ہیں۔ ہاں، آگے کے لیے سوچنا ہمارے بس میں ہوتا ہے۔''

''لیکن ہم تو فرض کر رہے ہیں نا......'' وہ ذرا کراہ کر بولا۔ ''اگر وقت چار سال پیچھے چلا جائے...... تو کیا ہو؟...... ذرا تصور کرو...... تم مجھ سے ناراض ہو کر اپنے فون بند کر چکی ہو۔ میں بھی اپنی انا کا اسیر ہو کر پاکستان واپس جا چکا ہوں...... ہم ایک دوسرے کے لیے تڑپ رہے ہیں، مگر ایک دوسرے کی طرف سے پہل کا انتظار کر رہے ہیں...... بس فرض کرو...... اونلی امیجی نیشن۔''

وہ اپنی ٹھوڑی اپنی ہتھیلی پر ٹکا کر کسی گہری سوچ میں کھو گئی پھر کھوئے کھوئے آہنگ میں بولی۔ ''اگر ایسا ہو جائے تو آپ کیا کریں گے؟''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''میں اپنی ضد کو پاش پاش کردوں گا۔ تمہیں فون کروں گا۔ ایک بار نہیں، کئی بار...... شاید درجنوں بار...... تمہیں عاجز کر ڈالوں گا۔ تمہیں تمہارے خول سے نکلنے پر مجبور کردوں گا۔ اپنے سارے تحفظات ایک طرف رکھ دوں گا۔ زویا! جب محبت ہے تو پھر تحفظات کیسے؟ سبک سری اور توہین کا خیال کیسا؟ محبت تو نام ہی اپنی ہستی کو کسی دوسرے کے لیے فنا کر دینے کا ہے۔ اس میں دوسرے کی پہل کا انتظار کیوں کیا جائے؟ کیوں نہ سر جھکا کر محبت کو سربلند کر دیا جائے۔''

زویا کے گلابی ہونٹوں پر بے ساختہ ایک موہوم سی مسکراہٹ پھیلی۔ ''اس لیے ہام کہتا کہ آپ جرنلسٹ ہو مگر ادیب بھی لگتے ہو۔''

''اچھا، اب تم بتاؤ کہ تم کیا کرتیں؟''

وہ ایک بار پھر گمشدہ موڈ میں چلی گئی۔ ہاتھ پر اپنی ٹھوڑی ٹکائے ٹکائے بولی۔ ''ہام، آپ کو بالکل فون ناہیں کرتا...... ہام شاید 21 نمبر ٹرین کے اسٹاپ پر ہی معاملے کو بگڑنے سے بچا لیتا۔ ہام کی سمجھ میں آج تک ناہیں آیا کہ

اس ڈن وہ سب کیا ہوا؟''

شامیر نے عجب دکھی انداز میں زویا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''زویا...... کیا یہ سلسلے وہیں سے جڑ سکیں گے جہاں سے ٹوٹے تھے؟''

اس سے پہلے کہ زویا جواب میں کچھ کہتی، دو تین ڈاکٹرز کا ایک پینل، میڈیکل اسٹاف کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ لوگ سیدھے شامیر کے بیڈ کی طرف ہی آئے۔ زویا سے کہا گیا کہ وہ باہر چلی جائے، مریض کا معائنہ ہونا ہے۔

شامیر کا ہاتھ دبا کر زویا باہر چلی گئی۔ ڈاکٹروں نے اسے گھیر لیا۔ ان میں مہربان چہرے والے سینئر ڈاکٹر تھامسن بھی شامل تھے۔ شامیر کے زخموں کا معائنہ کیا گیا۔ وائٹل سائنز دیکھے گئے، خون کے نمونے لیے گئے۔ ڈاکٹرز آپس میں بہ زبان جرمن گفتگو کر رہے تھے، تاہم اِکا دُکا الفاظ شامیر کے پلّے بھی پڑ جاتے تھے۔ مثلاً...... انفیکشن...... خون کی کمی...... رگوں میں پانی کی زیادتی...... وغیرہ وغیرہ۔ گُردوں کی ایک رپورٹ پر بھی خصوصی توجہ دی جارہی تھی۔

ڈاکٹرز کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد زویا پھر آگئی۔ اسے دیکھ کر شامیر کی آنکھوں میں روشنی سی اُمڈ آئی تھی۔

وہ اس کے قریب بیٹھ کر بولی۔ ''شومیر! آپ تو بہت مشہور ہوگئے۔ تین چار میگزین اور نیوز پیپرز میں آپ کا تصویر پرنٹ ہوا۔ اب بھی اسپتال سے باہر بہت سا لوگ ہے جو آپ کا خیریت ڈریافت کرتا...... آپ سے ملنا مانگتا...... لیونا برگ کے چرچ میں سنڈے کو آپ کے لیے خاص دعا ہوئیں گا۔''

''ان سب لوگوں کا بہت شکریہ زویا...... اور سب سے بڑھ کر تمہارا۔ یہ تم ہی ہو جو مجھے اس تکلیف سے لڑنے کی طاقت دے رہی ہو۔''

اس نے بے حد اپنایت سے شامیر کا ہاتھ دبایا......

''پلیز شومیر! بس جلدی سے اچھے ہوجائیں۔'' اس نے کہا اور ایک آنسو شامیر کے ہاتھ پر گرا پھر وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور خدا حافظ کہہ کر مڑ گئی۔

''کل جلدی آنا زویا۔'' وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔

وہ جاتے جاتے مڑی، اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں اشک جمع ہوچکے تھے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

سنڈے کے روز شامیر بہت تکلیف محسوس کر رہا تھا اور جب وہ زیادہ تکلیف محسوس کرتا تھا، اسے زویا کی کمی بھی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ سہ پہر تین بجے تک کا وقت اس نے کلاک کو دیکھ دیکھ کر گزارا...... زویا تو نہیں آئی، اس کا فون آگیا۔ وہ کسی وجہ سے آج نہیں آسکتی تھی۔ شامیر کے سینے سے ایک نہایت ٹھنڈی اور طویل سانس خارج ہوئی۔ اب پھر چوبیس گھنٹے کا انتظار تھا۔ اسے لگا کہ وہ پاکستان سے ہزاروں میل دور یہاں بالکل اکیلا ہے۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ خالہ ثمینہ اپنی مفلوج بیٹی کو لے کر پاکستان واپس جاچکی ہیں...... اور اگر وہ یہاں بھی ہوتیں تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ کبھی اس کی تھیں ہی نہیں، وہ تو بس ایک ضرورت اور ایک ضد تھی جس نے اسے ان کا پیارا بھانجا بنا رکھا تھا...... ہاں، وہ اکیلا ہی تھا۔ اس دنیا میں کوئی نہیں تھا جسے وہ حقیقی معنوں میں اپنا کہہ سکتا۔ اس نے دکھی دل کے ساتھ سوچا، چلو اچھا ہی ہے...... اگر اسے واقعی مرنا ہی پڑ گیا تو کوئی رونے پیٹنے والا تو نہیں ہوگا لیکن پھر اس کا دھیان زویا کی طرف چلا گیا...... نہیں، کم از کم ایک تو ہے، جو روئے گا اور شاید بری طرح روئے گا۔ پتا نہیں کیوں اس کے رونے کا خیال کر کے اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ زندہ رہے۔ وہ اپنی اس تکلیف کو ایک یادگار مزاحمت پیش کرے۔

میڈیکل اسٹاف کے لوگ آئے۔ انہوں نے مسکراتے لہجے میں کچھ کہا اور شامیر کے بیڈ کو دھکیلتے ہوئے دوسری طرف لے گئے۔ وہ یہی سمجھا کہ شاید اسے روٹین کے کسی ٹیسٹ کے لیے لے جایا جارہا ہے مگر ایک دیوار گیر کھڑکی کے قریب بیڈ روک دیا گیا۔ کھڑکی کے پردے ہٹائے گئے۔ شیشوں کی دوسری جانب کا منظر دیکھ کر شامیر دنگ رہ گیا...... یہاں ایک سرسبز لان میں قطار اندر قطار بے شمار لوگ موجود تھے۔ ان میں بچے، جوان، بوڑھے ہر عمر کے مرد و زن شامل تھے۔ ٹی وی کے رپورٹرز اور کیمرا مین بھی تھے۔ ان کے چہروں پر شامیر کے لیے تعریف و تحسین تھی اور بہت سے ایسے تھے جن کے ہاتھوں میں گلدستے تھے۔ شامیر بہت تکلیف محسوس کر رہا تھا لیکن ان مناظر نے اس کا دھیان کچھ دیر کے لیے بٹا دیا۔ اسے لگا کہ کچھ دیر پہلے وہ جو کچھ سوچ رہا تھا، وہ عبث تھا۔ وہ اکیلا تو تھا مگر بالکل بھی اکیلا نہیں تھا۔ اس دیارِ غیر میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس کے لیے دل میں جگہ رکھتے تھے اور اس کے لیے دعاگو تھے۔ اس کے دل میں آیا کاش زویا کی ماما بھی یہاں موجود ہوتیں اور دیکھ سکتیں کہ ہر مسلمان ان کا شوہر راشد احمد نہیں ہوتا...... اور دیکھ سکتیں کہ برصغیر میں ہی رہنے والے ایک پاکستانی نے کس طرح ان کے اہلِ خانہ اور ان کے ہم

وطنوں کے دل میں جگہ بنائی ہے۔

یہی وقت تھا، جب اسپتال کے ایک کمرے میں ڈاکٹرز کا ایک بورڈ شامیر کے کیس کو ڈسکس کر رہا تھا۔ سینئر ڈاکٹر تھامسن نے کہا۔ ''جسم آکسیجن کو پوری طرح جذب نہیں کر پا رہا۔ گردوں کا فعل بھی متاثر ہو رہا ہے۔ یہی صورت حال رہی تو دو تین روز میں سانس کی دشواریاں بھی پیش آسکتی ہیں۔''

ایک دوسرے جرمن ڈاکٹر نے کہا۔ ''اصل مسئلہ تو انفیکشن ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ مریض کو برلن یا فرینکفرٹ میں شفٹ کر دیا جائے؟''

ڈاکٹر تھامسن کے علاوہ ایک اور ڈاکٹر نے بھی مایوسی سے سر ہلایا۔ ڈاکٹر تھامسن نے کہا۔ ''میری رائے میں تو اس اسٹیج پر سفر مزید پیچیدگی پیدا کر دے گا۔ ہمیں کم از کم دو تین روز بعد مزید دیکھنا پڑے گا۔'' پھر انہوں نے اپنے اسسٹنٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''لواحقین میں قریبی کون ہے؟''

''سر! بس وہی پاکستانی نژاد لڑکی زویا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، اسے کال کرو۔''

''میں نے آپ کے کہنے پر کر دی تھی سر۔ وہ آنے ہی والی ہوگی۔''

ابھی ڈاکٹرز کی ڈسکشن جاری تھی کہ زویا بھی حجاب لیے اور شولڈر بیگ لٹکائے پہنچ گئی۔ وہ پریشان تھی۔ سائڈ روم میں ڈاکٹر تھامسن نے اس سے اکیلے میں بات کی۔

''مسٹر شامیر آپ کے کیا لگتے ہیں؟''

''وہ میرے ہم کار تھے۔ ہم ڈبل اے چینل پر اکٹھے کام کرتے رہے ہیں۔ ان کے علاج کے سارے معاملات یہاں میں ہی دیکھ رہی ہوں۔ پاکستان سے چینل کے مالک عظمت سلطان صاحب تعاون کر رہے ہیں۔''

ڈاکٹر تھامسن نے ایک توقف کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مسٹر شامیر کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے لیکن امید پر دنیا قائم ہے۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔'' وہ سر جھکا کر شامیر کی رپورٹس کو دیکھتے رہے، تب بولے۔ ''دیکھو مس زویا! یہ جو ہماری جلد یعنی کھال ہوتی ہے، یہ ایک طرح کا قدرتی غلاف ہے جو ہمارے جسم کو ہر طرح کے انفیکشن سے محفوظ رکھتا ہے۔ جب یہ جلد جل جاتی ہے تو جسم ایک دم غیر محفوظ ہو جاتا ہے۔ ہر طرح کے بیکٹیریاز اس پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اس تھرڈ ڈگری برننگ میں کچھ اسی طرح کی سچویشن ہے۔ فی الحال ہم مسٹر شامیر کو برلن یا ویانا میں منتقل بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے دو تین روز انتظار کرنا پڑے گا۔''

زویا خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ سینئر ڈاکٹر تھامسن نے شفقت سے اس کا کندھا تھپکا۔ ''آپ ہمت سے کام لیں اور دعا کریں۔''

زویا رو دی۔ ''اس نے ہمارے لیے خود کو ختم کر لیا ڈاکٹر۔ وہ کہاں سے آیا اور کہاں پہنچ کر ہمارے لیے زندگی کی ڈھال بن گیا......''

ڈاکٹر تھامسن طویل سانس لے کر بولے۔ ''اس کی قربانی واقعی قابل ذکر ہے۔ لوگ اس طرح اپنی جان اس وقت خطرے میں ڈالتے ہیں جب ان کا کوئی بہت قریبی موت کے خطرے میں ہوتا ہے یا پھر کوئی بے حد جذباتی رشتہ۔''

زویا روتے ہوئے ملتجی لہجے میں بولی۔ ''ڈاکٹر! آپ سے میری ایک درخواست ہے۔ میں جانتی ہوں اسپتال کے رولز سخت ہیں لیکن آپ میرے لیے پلیز تھوڑی سی گنجائش پیدا کریں۔ میں زیادہ سے زیادہ دیر شامیر کے پاس رکنا چاہتی ہوں۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ وہ میری موجودگی میں سکون محسوس کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر نے اپنی گھنی بھویں اٹھا کر معاملہ فہم نظروں سے زویا کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

قریباً دس منٹ بعد زویا، شامیر کے پاس موجود تھی۔ اس کو دو تین ڈرپس لگی ہوئی تھیں۔ آکسیجن ماسک بھی تھا لیکن لگایا نہیں گیا تھا۔ اس کے وجیہہ چہرے پر نقاہت اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ غیر متوقع طور پر زویا کو سامنے دیکھ کر وہ جیسے کھل اٹھا۔

''ارے...... یہ کرشمہ کیسے ہوگیا؟ تم نے تو کہا تھا کہ آج نہیں آسکو گی۔''

وہ مسکرائی۔ ''پھر سوچا کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جاؤ۔ آپ کی ناراضگی...... بہت کھلتی ہے میں نے۔''

''اور میں نے بھی۔''

زویا نے حسب معمول اس کا ہاتھ تھام لیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اسے جوس پلانا چاہا مگر اس نے فقط ایک سپ لے کر سر نفی میں ہلا دیا۔ وہ مختلف موڈ میں تھا۔ تکلیف کے آثار چہرے پر نہیں آنے دے رہا تھا مگر ضبط بھی آسان نہیں تھا۔

زویا کا ہاتھ ہولے سے دبا کر بولا۔ ''موت کیسی ہوتی ہے زویا؟''

''آپ ایسے بے ڈھنگے سوال کریں گے تو میں اٹھ کر

چلی جاؤں گی۔‘‘

’’بھئی، یہ بے ڈھنگا سوال نہیں۔ موت و حیات پر غور کرنا تو دانشوروں کا وتیرہ ہے..... آنکھیں بند کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ موت ایک اندھیرے کی طرح ہوتی ہے۔ جب ہم زندگی سے بہت تنگ ہوتے ہیں تو دھیرے دھیرے اس اندھیرے میں اترنے سے زیادہ ڈر نہیں لگتا لیکن جب زندگی میں تمہارے جیسی کوئی روشن کرن موجود ہو تو پھر ڈر لگنے بھی لگتا ہے۔‘‘

’’اگر ایسی بات ہے تو پھر آپ کو خوب ڈرنا چاہیے اور ایسا کوئی خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں، آپ بہت جلد اچھے ہونے جا رہے ہیں۔ میں نے آپ کو اچھا کر کے چھوڑنا ہے۔‘‘

’’اور خیر سے مجھے اچھا کرنے کے لیے تم کیا کرو گی؟‘‘

وہ خوش نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ’’اگر میں مغلیہ دور کی کوئی شہزادی ہوتی تو آپ کے بستر کے گرد چکر کاٹتی اور اپنی جان آپ کے جسم میں ڈال دیتی۔ میں شہزادی تو نہیں ہوں مگر جان تو میں پھر بھی ڈال دوں گی۔ آپ کے پاس رہ کر، آپ کا حوصلہ بڑھا کر..... اور اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد دن رات آپ کی خدمت کر کے۔‘‘ اس نے شامیر کے چھوڑے ہوئے جوس میں سے ایک ’’سپ‘‘ لیا اور دل گداز نظروں سے اسے دیکھا۔

اسی دوران میں شامیر کے دائیں پہلو میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ زویا پاس نہ ہوتی تو شاید یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت ہوتا لیکن اس کی موجودگی ایک ایسے تریاق کی طرح تھی جو ہر زہر کی تلخی کم کر دیتا تھا اور کبھی کبھی ناپید بھی۔

اس نے زویا کا نرم ہاتھ دبایا اور کھوئے کھوئے آہنگ میں بولا۔ ’’زویا! مجھ سے ایک وعدہ کرو۔‘‘

’’کیا شومیر؟‘‘

’’وعدہ کرو کہ..... آخر تک میرا ہاتھ ایسے ہی تھامے رکھو گی۔‘‘

’’آ..... آخر تک؟ کیا مطلب؟‘‘

اس نے بات بدلی۔ ’’جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتا..... اسی طرح میرے پاس بیٹھی رہو گی..... میری ہتھیلی پر کچھ لکھتی رہو گی۔ بولو کرو گی نا؟‘‘

’’شومیر! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟‘‘ وہ رو دینے کے قریب تھی۔

وہ مسکرا دیا۔ ’’ایسی باتیں اس لیے کر رہا ہوں کہ تم پھر انگلش بول رہی ہو۔ جب تم ’’اردو‘‘ بولو گی تو میرا موڈ بھی اچھا ہو جائے گا۔‘‘

’’شومیر! پلیز، آپ ایسا دکھ دینے والا باتیں کیوں کرتا؟‘‘ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

یہ دھوپ چھاؤں کا منظر وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ اردو بھی بول رہی تھی اور دکھی بھی تھی۔

اتنے میں شامیر کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہونے لگی۔ ڈیوٹی ڈاکٹرز نے ماسٹر مانیٹر پر یہ کیفیت دیکھ لی۔ ایک ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ فوراً موقع پر پہنچ گیا۔ زویا پھر باہر چلی گئی۔

شامیر کو انجکشن لگائے گئے۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ تکلیف کی شدت دب گئی۔ جیسے شعلوں پر ریت ڈال دی جائے اور انگارے اندر ہی اندر سلگ رہے ہوں۔ کچھ بھولی بسری آوازیں اس کی سماعت میں گونجنے لگیں۔ ان آوازوں کا تعلق چار سال پہلے کے خوبصورت شب و روز سے تھا۔

’’میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ پیار کروں گی اور کسی پاکستانی یا انڈین وغیرہ سے تو بالکل بھی نہیں۔‘‘

’’زویا! تم پورے پندرہ منٹ لیٹ ہوئی ہو۔‘‘

’’بالکل غلط شومیر! پندرہ نا ہیں بارہ منٹ۔ جو ٹائم تم سے دور گزرتا اس کے ہر ہر سیکنڈ کا حساب رکھتی ہوں۔‘‘

’’اگر کبھی مجھ سے بچھڑنا پڑا زویا تو کیا کرو گی؟‘‘

’’بچھڑنے والا صفحہ تو مجھے اپنی زندگی کی کتاب میں کہیں نظر ہی نہیں آتا.....‘‘ آوازیں گونجتی رہیں۔

☆☆☆

زویا، حولیہ، جین، افشاں اس کی والدہ اور انکل اختر..... سینئر ڈاکٹر تھامسن کے روم میں ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر انہیں بتا رہا تھا کہ شامیر کی حالت سنبھل نہیں سکی۔ اگلے چوبیس گھنٹے اس کے لیے بڑے مشکل ہیں۔ ان سب کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

جب سب اٹھ کر باہر چلے گئے تو زویا پھر بھی کھڑی رہی۔ ڈاکٹر تھامسن بے حد سنجیدہ تھے اور سوالیہ نظروں سے زویا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زویا نے خود کو بمشکل بولنے کے لیے تیار کیا اور کہا۔ ’’ڈاکٹر! چوبیس مشکل گھنٹوں سے آپ کا کیا مطلب ہے؟‘‘

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ’’تم اس سے پیار کرتی ہو؟‘‘

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دو آنسو رخساروں پر لڑھک گئے۔

''اس کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

الفاظ دہکتے تیروں کی طرح زویا کے دل میں ترازو ہوگئے۔ اس نے اپنے ہونٹ بے حد مضبوطی سے بھینچ لیے۔ اسے لگا کہ اسے دیوار کا سہارا لینا پڑے گا مگر پتا نہیں وہ کیسے کھڑی رہی۔

ڈاکٹر تھامسن باہر جانے کے لیے مڑ گئے مگر دروازے کے پاس جا کر پھر رک گئے۔ زویا کے قریب آکر بولے۔ ''سوختہ زخمی کے لیے آخری وقت بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہم ٹرنکولائزرز تو دیتے ہیں مگر اس کی ایک LIMIT ہوتی ہے۔ برین کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ تمہاری موجودگی اسے بہت سکون دیتی ہے۔''

زویا کو وہ الفاظ یاد آئے جو شامیر نے تین دن پہلے کہے تھے...... ''زویا ...... آخر تک ...... میرا ہاتھ تھامے رکھنا...... میرے پاس رہنا۔''

وہ سسک اٹھی، پھر ہاتھ جوڑ کر ڈاکٹر تھامسن سے مخاطب ہوئی۔ ''ڈاکٹر! ایک التجا ہے آپ سے...... اگر ہوسکے تو اسے مان لیجیے گا۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''م...... میں...... آخر تک ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں...... کتنا بھی بُرا وقت ہو، میں وہاں رکنا چاہتی ہوں۔''

ڈاکٹر تھامسن کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے۔ وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر زویا کی حالت دیکھی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ باہر آکر لابی میں آن بیٹھی۔ اس نے کمان کی طرح خم کھا کر اپنی پیشانی گھٹنوں پر رکھی اور چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ وہ کھل کر رونا چاہتی تھی مگر یہ جگہ ایسی نہیں تھی۔ مریضوں کے کئی لواحقین یہاں موجود تھے اور پھر وہ بھی تھے جن کا تعلق شامیر سے قریبی تھا۔ افشاں، اس کے والدین، اس کے باس عظمت سلطان، جو رات کی فلائٹ سے یہاں پہنچے تھے۔

وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی...... پکارتی رہی...... لوٹ آؤ شومیر...... واپس آجاؤ...... تم جو کہوگے میں ویسا ہی کروں گی...... تم جو کہوگے۔

☆☆☆

شامیر آئی سی یو میں تھا اور وینٹی لیٹر پر تھا۔ تکلیف بے انتہا تھی۔ پین کلرز کی ''ریت'' بھی درد کی اس نیلی آگ کو پوری طرح دبا نہیں پاتی تھی۔ پورے کا پورا جسم اذیت کے شکنجے میں تھا۔ اس کا ذہن تاریکی اور اجالے کے درمیان بھٹک رہا تھا۔

کچھ تاریک سائے دھیرے دھیرے اس کی طرف سرک رہے تھے۔ کیا وہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے؟ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے سوال کیا۔

وہ کہاں تھی؟ اس نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے پاس رہے گی۔ وہی تو تھی جو اس کے ہر سفر کو آسان بنا سکتی تھی۔ اس نے بس اسی کو چاہا تھا اور پھر اس کے بعد اور کسی کو نہیں چاہ سکا تھا۔ اب ان لمحوں میں اسے اس کے پاس ہونا چاہیے تھا، بالکل قریب۔ اس کی موجودگی ان گھپ اندھیروں میں اسے ایک ایسی روشنی سے نوازتی تھی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے خالی کرسی کی طرف دیکھا...... شاید اسے نہیں آنا تھا۔ شاید اسے اب باہر ہی روک دیا جانا تھا۔ تکلیف بڑھتی جارہی تھی۔ ساری رگوں میں جیسے آگ بھر گئی تھی۔ وہ چلّانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے
اور وہ ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے
اسے صحرا میں سایہ پسند نہیں
اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے

درد بیکراں ہوتا جارہا تھا۔ وہ بلند آواز میں کہنا چاہتا تھا۔ مجھے ایک اور انجکشن دو ڈاکٹر۔ اب یہ برداشت نہیں ہوتا۔

دریائے مائنز کے کنارے ایک چمکیلی دوپہر میں مغنی اپنا نغمہ الاپتا جارہا تھا۔

اسے برفوں میں الاؤ کی حرارت نہیں چاہیے
وہ انہونیوں کی متلاشی
وہ بے نشاں منزلوں کی راہی
وہ محبت ہے...... میرے یار و محبت ہے

شامیر کے گرد میڈیکل ایڈ دینے والی مشینیں تھیں...... مانیٹرز تھے، ڈرپس کی سفید نالیاں تھیں۔ اسے تاریک سمندروں میں جیسے کسی زہریلے آکٹوپس نے جکڑ رکھا تھا...... اور اس کی مددگار کہاں تھی؟ وہ کہاں تھی جو اس کا ہر سفر آسان بنا سکتی تھی؟

ڈاکٹروں کی سرگوشیاں اس کے کانوں میں دور افتادہ آوازوں کی طرح تھیں۔ تاریکی گہری ہو رہی تھی، تب اچانک اس نے اپنے ہاتھ پر کسی کالمس محسوس کیا...... اس نے بڑی مشکل سے گردن پھیری اور دھندلائی ہوئی نظر سے

دیکھا۔ وہ آگئی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ اس کے کومل ہاتھ میں تھا اور کہتے ہیں کہ بایاں ہاتھ دل کے بہت قریب ہوتا ہے۔ اس ہاتھ سے اٹھنے والی لہریں سیدھی اس کے دل تک پہنچ رہی تھیں۔

جو تکلیف نیم بے ہوشی اور بے ہوشی بھی کم نہیں کر پا رہی تھیں، وہ کم ہوگئی۔ اس نے آنکھیں پوری کھول کر اسے دیکھنا چاہا...... ہاں، وہی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کرلیں...... اور اس نے وعدہ لیا تھا کہ وہ آخر تک ہاتھ نہیں چھوڑے گی۔

...... زویا جب پہنچی اور اس نے شامیر کا ہاتھ تھاما تو وہ غشی کی سی کیفیت میں تھا مگر اس نے اس کی آمد کو محسوس کیا اور اس کے لمس کو بھی۔ وہ آنسوؤں کا ایک دریا سینے میں چھپائے اس کے قریب بیٹھی رہی۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ نوشتۂ دیوار تھا، شامیر کی بند پلکوں پر لکھا تھا اور ڈاکٹرز کے چہروں پر بھی۔

اسے لگا کہ زویا کی گرفت میں شامیر نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی ہے۔ اسے کھولا ہے جیسے وہ ایک دستِ سوالی ہو۔ وہ اندر ہی اندر سسک اٹھی۔ اس نے اپنی انگشت شہادت سے اس کی ہتھیلی پر لکھا LOVE YOU۔

پھر وہ وقفے وقفے سے اس لفظ کو لکھتی چلی گئی۔ اسے لگا کہ اس عمل نے نیم بے ہوش شامیر کو سکون دیا ہے۔ اس کی اذیت کے لیے کسی تیر بہ ہدف نسخے کا سا کام کیا ہے۔ وہ بے تکان بیٹھی رہی، اس کی انگلیوں کو ہولے ہولے دباتی رہی اور اس کی ہتھیلی پر اپنا اعترافِ محبت درج کرتی رہی۔

رات تک وہ اپنی جگہ سے ہلی اور نہ اس نے کچھ کھایا پیا۔ افشاں، انکل اختر، عظمت سلطان اور دیگر عزیزوں نے اسے اس کی جگہ سے ہٹانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں ہٹی۔ اس نے کسی سے وعدہ کیا تھا...... کسی کے پاس رہنے کا عہد کیا تھا...... وہ ایک عمر تک روٹھا رہا تھا۔ اب وہ مانا تھا تو وہ اسے کیسے روٹھنے دیتی۔ کسی ایسے بچے کی طرح جسے سبق یاد نہ کرنے پر دہرائی کی سزا دے دی گئی ہو، وہ اپنی آنکھوں میں اشک لیے...... اس کی ہتھیلی پر لو یو...... لو یو لکھتی رہی۔

اور یہ کوئی وہم نہیں تھا، نہ ہی بصری دھوکا تھا...... زویا کا یہ عمل شدید تکلیف کے عالم میں اسے راحت پہنچا رہا تھا...... اور یہ کیفیت صرف زویا ہی نہیں، ڈاکٹرز بھی دیکھ رہے تھے۔ شامیر جس صورتِ حال سے دوچار تھا، ایسی صورتِ حال میں مریضوں کی تکلیف بے پناہ ہوجاتی ہے، مگر برین کے متاثر ہونے کے ڈر سے انہیں مکمل بے ہوش بھی نہیں کیا جاتا۔ ڈاکٹرز جانتے تھے کہ شامیر بھی تکلیف میں ہوگا مگر جب سے یہ لڑکی اس کے قریب آکر بیٹھی تھی، اس کے چہرے کی کیفیت بدل گئی تھی۔

جب تک سانس ہوتی ہے، تب تک آس ہوتی ہے۔ امید تو آخر تک قائم رہتی ہے۔ نظامِ قدرت اپنے لگے بندھے اصولوں پر چلتا ہے۔ معجزوں کا آپشن خدائے بزرگ و برتر نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ وہ کب اسے استعمال کرتا ہے، کب نہیں...... یہ اسی کی صوابدید پر ہے۔ یہ آپشن شامیر کے لیے حرکت میں نہیں آنے والا تھا۔ رات بارہ بجے کے بعد اس کے وائٹل سائنز نے خطرے کی نشاندہی شروع کردی۔ اس کا تنفس بری طرح بگڑ رہا تھا۔

"کیا رخصت کا وقت قریب آرہا ہے؟" زویا نے بے پناہ کرب سے سوچا۔

ایسا ہی تھا...... وہ جا رہا تھا اور اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اسی کی وجہ سے تھا۔ وہی انا کی دیوار جسے وہ بھی ڈھا نہ سکی تھی۔ 21 نمبر ٹرین کے آخری اسٹاپ پر وہ اس کے پیچھے بھی آیا تھا۔ زویا نے اس کے لرزاں قدموں کی چاپ بھی محسوس کی تھی لیکن رکی نہیں تھی...... اور اب...... وہ نہیں رک رہا تھا۔

"لو یو...... لو یو" تو وہ پہلے بھی لکھتی رہی تھی۔ اب اس نے تیسرا لفظ بھی لکھنا شروع کردیا۔ "سوری...... لو یو"

اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اپنی انگلی کی غیر محسوس حرکت سے وہ جو پیغام شامیر تک پہنچا رہی ہے، وہ اس تک پہنچ رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی جاں بلب مریض کا چہرہ لگتا ہی نہیں تھا۔ وہاں اذیت کے المناک کھچاؤ کے بجائے، سکون اور آسودگی کی نرماہٹ دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ بیٹھی رہی، اس کی انگلیوں کو ہولے ہولے دباتی رہی...... آنسو گراتی رہی اور لکھتی رہی...... "سوری...... لو یو۔" ڈاکٹرز اور میڈیکل اسٹاف اپنا کام کرتے رہے، وہ اپنا کام کرتی رہی۔

رات ایک بجے کے لگ بھگ سینئر ڈاکٹر تھامسن نے ایک گوشے میں کھڑے ہوکر پاکستانی مریض کو دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اب بیس پچیس منٹ کا مہمان ہے۔ اس برن یونٹ میں اس نے ایسی کنڈیشن میں موت کا شکار ہونے والے سیکڑوں ہی مریض دیکھے تھے لیکن ایسا نہیں دیکھا تھا۔ وہ بڑے سکون میں تھا۔ آسودگی کی چمک سی تھی اس کی پیشانی پر۔ وہ جیسے دن بھر کی تھکن کے بعد، بڑے اطمینان سے سارے کاموں سے فارغ ہوکر سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے قریب بیٹھی ہوئی دلکش لیکن بہت سوگوار لڑکی

نے اس کا بایاں ہاتھ تھام رکھا تھا اور قرب وجوار سے بالکل بے خبر ہو کر اس کی ہتھیلی پر اپنی انگلی کو حرکت دیتی جارہی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کچھ لکھ رہی تھی یا یہ ویسے ہی اس کی عادت تھی۔

لیونا برگ کے اس اسپتال میں آئی سی یو کے اندر رات ایک بج کر چالیس منٹ پر شامیر نے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ اسپتال سے باہر موجود اس کے سیکڑوں مداح آنسوؤں میں ڈوب گئے۔

وہ اپنے راستے خود چنتی ہے

اور وہ ہمیشہ مشکل راستے چنتی ہے

☆☆☆

شامیر چلا گیا۔ ایک نکتہ داں صحافی، ایک ایثار پیشہ شخص...... وہ بے شمار لوگوں کو سوگوار چھوڑ گیا۔ اگلے روز بیٹھے بیٹھے زویا کو نجانے کیوں لگا کہ وہ بیوہ ہوگئی ہے۔ اس نے بندے اتار پھینکے، گلے میں چمکنے والی سونے کی چین توڑ کر ایک طرف ڈال دی۔ بینگلز اپنی کلائیوں سے علیحدہ کردیے۔ وہ ایک بار پھر تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

شامیر کی میت پاکستان کس کے پاس جاتی؟ وہ وہاں سے آیا تو اپنی پیاری امو خالہ کے ساتھ تھا مگر اصل میں اکیلا ہی آیا تھا۔ امو خالہ اپنی نیم دیوانی مفلوج بیٹی کے ساتھ پاکستان واپس جاچکی تھیں مگر پتا نہیں کہ کس جگہ تھیں۔ انکل اختر اور عظمت سلطان اس کے جسد خاکی کو اسٹریٹ پولیٹن لے جانا چاہتے تھے مگر لیونا برگ اور گردونواح میں شامیر کے اتنے مداح تھے کہ اس کی تدفین کا فیصلہ لیونا برگ میں ہی ہوا۔ دریائے ایلم ناؤ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک مسلم قبرستان اس کی آخری آرام گاہ قرار پایا۔ اس کی میت کے اوپر پاکستانی پرچم ڈالا گیا تھا۔ زویا نہیں جان سکی کہ پرچم والا آئیڈیا کس کا تھا؟ شامیر کی آخری رسومات میں غیر متوقع طور پر بہت زیادہ لوگ شریک ہوئے...... ایک سیلاب سا امڈ آیا۔

تیسرے روز زویا کو اسپتال سے ایک فون کال موصول ہوئی۔ یہ کال ایک انچارج نرس کی طرف سے تھی۔ وہ اکثر شامیر کے اردگرد نظر آیا کرتی تھی۔ وہ زویا سے ملنا چاہتی تھی۔ دوپہر کے وقت ان دونوں کی ملاقات ایک قریبی ترک ریستوران میں ہوئی۔ جرمن نرس بھی شامیر کے مداحوں میں شامل تھی۔ اس نے زویا کو ایک چھوٹا سا بند لفافہ دیا اور کہا۔ ”یہ آنجہانی محترم شامیر کی طرف سے ہے۔ انہوں نے اپنی ڈیتھ سے تین دن قبل مجھے دیا تھا اور مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اگر انہیں کچھ ہوجائے تو میں اسے رازداری سے آپ تک پہنچادوں۔“

بند لفافہ زویا نے اپنے شولڈر بیگ میں رکھ لیا۔ انچارج نرس ہی کی زبانی اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ پاکستانی پرچم والی بات بھی شامیر نے خود ہی کہی تھی۔ یہ غالباً اس تعصب کا جواب تھا جو زویا کی ماما جیسے کچھ لوگ پاکستانیوں سے رکھتے تھے۔

نرس کے جانے کے بعد زویا نے ریستوران میں ہی بیٹھ کر لفافہ کھولا۔ اس میں ایک آرٹیفیشل موتی تھا۔ یہ مقدر کا وہی موتی تھا جو ان دونوں کو پری کے روپ والی لڑکی نے فرینکفرٹ میں دیا تھا۔ وہ شامیر نے آخر تک سنبھالے رکھا تھا۔ ساتھ میں ایک چھوٹا سا خط بھی تھا۔ یہ شامیر نے یقیناً اپنے بائیں ہاتھ سے ذرا دشواری کے ساتھ لکھا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

”مجھے خوشی ہے کہ اب تمہارے اردگرد کوئی بڑا خطرہ موجود نہیں ہے (ویسے بھی اب تم جرمنی چھوڑ جانا چاہتی ہو) مجھے لگتا ہے کہ میں چلا جاؤں گا۔ میرے جانے کا سوگ زیادہ دیر نہ منانا۔ ٹھہرے پانی خراب ہوجاتے ہیں، زندگی کی روانی برقرار رہنی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے حصے کے غم تمہیں ملے ہیں تو تمہارے حصے کی خوشیاں بھی ضرور ملیں گی۔ تم شادی کرلینا۔ مجھے بھروسا ہے کہ کوئی نہ کوئی تمہاری زندگی میں ایسا ضرور آئے گا... جو تمہارے سارے دکھوں کا مداوا کردے گا۔

زویا! ہم دونوں نے تو اپنی قسمت کا لکھا پالیا، مگر ہم جیسے جو آئندہ آنے والے ہیں، ان کے لیے دل سے ایک دعا نکلتی ہے۔ سوچتا ہوں، کتنا اچھا ہو کہ 21 نمبر ٹرین کے آخری اسٹاپ جیسا اسٹاپ دنیا میں کہیں بھی نہ ہو اور اگر ہو تو وہاں پتھر کے بینچ والے اس گوشے میں، جدائیوں کی گفتگو نہ ہو...... اور اگر گفتگو ہو ہی جائے اور کوئی زویا کسی شامیر سے روٹھ کر چلی بھی جائے تو پھر ان دونوں کے درمیان انا کی دیوار حائل نہ ہو...... ہوسکے تو تم بھی ایسے ہی سوچنا...... ایسے ہی دعا کرنا۔

تمہاری خوشیوں کے لیے دعاگو...... تمہارا ”شومیر......“

زویا نے خط دوبارہ شولڈر بیگ میں رکھ لیا اور کھڑکیوں سے باہر دریائے ایلم ناؤ کی طرف دیکھنے لگی...... ایلم ناؤ جس کی دوسری جانب شامیر سفیدے اور بلوط کے پیڑوں کے نیچے سو رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے چل دی، ایک بار پھر اس سے ملنے کے لیے۔ وہ بالکل سفید لباس میں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جو موسم اس کے دل پر چھایا ہوا ہے، وہ بہت...... بہت طویل ہے۔

(ختم شد)